www.pklibrary.com
اپریل 2023
شعاع
www.pklibrary.com

انٹرویو

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

اپریل 2023

جلد 36 شمارہ 08

قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32768872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع اپریل کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں کا آغاز ہو چکا ہے یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آپ رمضان المبارک کی رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہو رہی ہوں گی۔

یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس کا ایک ایک پل بہت قیمتی ہے۔ یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے یہ اللہ کو راضی کرنے اور اسے منانے کا مہینہ ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے کہ ہم اپنے رب کو منا سکیں۔ زیادہ سے زیادہ استغفار کر کے اپنے گناہوں کو معاف کرا سکیں۔ کوشش کریں کہ اس بابرکت مہینہ کا کوئی پل فضول باتوں میں ضائع نہ ہو، آپ کے لبوں پر اللہ کا ذکر اور استغفار جاری رہے۔

روزہ میں صرف کھانا پینا چھوڑنا ہی کافی نہیں ہے۔ فضول کاموں سے بچنا، چغلی کرنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور لڑائی جھگڑے سے بچنا بھی ضروری ہے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ رمضان ہم سب کے لیے خوشی اور خوش حالی کا پیغام لے کر آئے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے پیارے رب کو راضی کر سکیں۔

عید نمبر

شعاع کا مئی کا شمارہ عید نمبر ہوگا، عید نمبر میں دیگر سلسلوں کے ساتھ عید سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پرانی روایتیں ختم ہو رہی ہیں۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ کیا آپ کے ہاں عید روایتی انداز اور جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔

2۔ آپ کے روزے کیسے گزرے، افطار کا کوئی یادگار واقعہ، مہمانوں کی اچانک آمد یا افطار پارٹی وغیرہ۔

3۔ آپ کا پسندیدہ میٹھا کیا ہے؟ اس کی ترکیب لکھیں۔

اپنے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 18 اپریل تک موصول ہو جائیں۔ آپ اپنے جوابات واٹس اپ بھی کر سکتی ہیں۔ نمبر یہ ہے 0317-2266944

سانحہ ارتحال

ہماری بہت اچھی مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کی والدہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ نہایت ہنس مکھ، خوش طبع اور نیک دل خاتون تھیں۔ بہت مہمان نواز تھیں۔ رشتوں کا احترام اور محبت ان کی فطرت میں شامل تھی۔ ان کا دنیا سے رخصت ہونا سدرۃ المنتہیٰ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم سدرہ کے ساتھ ہیں۔ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ سدرۃ المنتہیٰ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

حمد باری تعالیٰ

شبِ غم کا اثر دل سے مٹاتی ہے تری خوشبو
فسانے صبحِ تازہ کے سناتی ہے تری خوشبو

گھٹاؤں کی زبانی تیرے پیغامات ملتے ہیں
نسیمِ صبح گاہی لے کے آتی ہے تری خوشبو

گلاب بے خزاں! تو گرچہ نظروں سے ہے پوشیدہ
مگر ہر دم تری صورت دکھاتی ہے تری خوشبو

بھٹک جائے مسافر جب کوئی تو خضرِ راہ بن کر
قریبِ منزلِ مقصود لاتی ہے تری خوشبو

زہے قسمت کہ نزدیکِ رگِ جاں ہے تری ہستی
مرے ہر سانس کے ہمراہ آتی ہے تری خوشبو

جلالِ زار کا جب حبسِ غم سے سانس رکتا ہے
اچانک صحنِ دل میں مسکراتی ہے تری خوشبو

ڈاکٹر سید قاسم جلال

نعت رسول مقبول ﷺ

کوثر کی حلاوت ہے مری تشنہ لبی میں
مصروف ہوں میں مدحِ رسولِ عربی ﷺ میں

تنہائی میں دم ساز ہے اس مہ کا تصور
کیوں موجِ ضیا ہو نہ مری تیرہ شبی میں

ہے حسن بھی، اخلاق بھی، رحمت بھی، کرم بھی
مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی میں

ہر ذرہ نظر آتا ہے خورشید بداماں
جلوے ہیں عجب سے مرے آقا کی گلی میں

ہر حسن کا محور ہے وہ اک ذاتِ مقدس
ہر علم کا جوہر ہے اک اُمّی عربی میں

کس آنکھ نے دیکھا ہے کوئی آپ کا ہمسر
کس کو ہے کلام آپ کی عالی نسبی میں

محمد اعظم چشتی

ادارہ

غلط فہمی

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ابر آلود دن میں ہم نے روزہ کھول دیا (یہ سمجھ کر سورج غروب ہو چکا ہے) لیکن پھر (بادل ہٹ گئے اور) سورج نکل آیا۔" (بخاری)

ابو اسامہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ میں نے ہشام بن عروہ رضی اللہ سے کہا۔

"کیا انہیں (روزے کی) قضا کا حکم دیا گیا تھا؟" انہوں نے کہا۔

"یہ تو ضروری تھا۔"

فوائد مسائل:

1۔ حدیث میں مذکورہ صورت بھول کر کھانے پینے سے مختلف ہے کیونکہ انہوں نے بھول کر نہیں کھایا پیا بلکہ ارادے سے اپنے خیال میں روزہ کھولا تھا۔ اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر وقت سے پہلے کھول دیا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ گناہ گار تو نہیں ہوئے لیکن روزہ یقیناً ناقص ہو گیا۔ ایسے روزے کی قضا کی بابت علما میں اختلاف ہے، تاہم جمہور علما کے نزدیک ایسی صورت میں افطار کیے ہوئے روزے کی قضا واجب ہے۔

روزے دار کو قے آ جائے

حضرت فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دن ان کے پاس تشریف لائے جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ نے (پانی کا) برتن طلب فرمایا اور پی لیا۔ ہم نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو وہ دن ہے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔"

فرمایا "ہاں لیکن مجھے قے آ گئی تھی۔" مسند احمد

روزے میں مسواک کرنا اور سرمہ لگانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"روزے دار کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل مسواک بھی ہے۔"

فوائد مسائل:

1۔ یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے، تاہم صحیح روایت سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا ثابت ہے۔ اس سے روزے میں فرق نہیں آتا۔ امام بخاری رحمتہ اللہ نے صحیح بخاری میں کتاب الصوم میں ایک باب کا عنوان اس طرح

درج کیا ہے۔ ''روزے دار کا تازہ یا خشک مسواک کرنا۔'' اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مذکورہ ہے، انہوں نے فرمایا'' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے اتنی بار دیکھا ہے کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں سرمہ لگایا۔

روزے دار کے لیے غیبت اور فحش گوئی

(کی ممانعت) کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس نے جھوٹ اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ اعمال سے اجتناب نہ کیا، اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص کھانا پینا ترک کر دے۔''

فوائد مسائل:

1۔ روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کا حصول ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔'' البقرہ 2-183

2۔ تقویٰ کے حصول کے لیے صرف کھانے پینے سے پرہیز کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی شعوری کوشش مطلوب ہے۔ روزہ رکھ کر ہم اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بھی اللہ کے حکم کے مطابق پرہیز کرتے ہیں تو جو کام پہلے بھی ممنوع ہیں، ان سے بچنا زیادہ ضروری ہے تاکہ مومن ان سے پرہیز کا عادی ہو جائے۔

3۔ شریعت اسلامیہ میں روزے کے دوران بات چیت کرنا جائز ہے بلکہ چپ کا روزہ شرعاً منع ہے۔

4۔ عبادات انسان کے روحانی اور جسمانی فائدے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ان اعمال پر آخرت میں بھی عظیم انعامات عطا فرماتا ہے۔

روزہ ضائع ہونا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بعض روزے داروں کو روزے سے بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بعض قیام کرنے والوں کو قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔'' (بخاری)

فوائد مسائل:

1۔ اخلاص کے بغیر نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔

2۔ عبادت میں جس طرح ظاہری ارکان کی پابندی ضروری ہے، اسی طرح باطنی کیفیات اخلاص، اللہ کی محبت، اللہ کا خوف، اللہ سے امید وغیرہ بھی مطلوب ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ظاہری عمل بے فائدہ ہے۔

3۔ اگر کسی موقع پر مطلوبہ باطنی اور قلبی کیفیت موجود نہ ہو تو نیکی کو ترک نہیں کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کا کم از کم یہ فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا کہ فرض کا تارک شمار نہیں ہو گا اور وہ نیکی مسلسل انجام دینے سے امید کی جا سکتی ہے کہ دل پر تھوڑا بہت اچھا اثر لازماً ہو جائے گا۔

4۔ عبادات میں ان کے آداب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

روزے میں احتیاط

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم میں سے کسی کا دن کو روزہ ہو تو وہ فحش گوئی نہ کرے اور ناروا حرکت نہ کرے، اگر کوئی اس سے بدتمیزی کرے تو کہہ دے میں روزے دار

آدمی ہوں۔" (بخاری)

فوائد مسائل:

1۔ روزے کے فوائد کما حقہ حاصل کرنے کے لیے آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

2۔ جہل (ناروا حرکت) سے مراد لڑائی جھگڑے کی بات ہے، یعنی روزے دار کو لڑائی میں پہل بھی نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی دوسرا شخص ایسی بات کرے یا ایسی حرکت کرے جس سے روزے دار کو غصہ آ جائے تب بھی روزے دار کو جواب میں جھگڑنا نہیں چاہیے بلکہ اپنے روزے کا خیال کرتے ہوئے برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہوئے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3۔ یہ کہنا کہ میں روزے سے ہوں، اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دل میں اپنے روزے کا خیال کرے تاکہ جھگڑے سے بچنا ممکن ہو سکے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جھگڑنے والے سے کہہ دے کہ میں تمہاری غلط حرکت کا جواب تمہارے انداز میں اس لیے نہیں دے رہا کہ میرا روزہ مجھے اس سے روکتا ہے۔ امید ہے اس سے اس کو شرم آ جائے گی اور وہ روزے دار کے روزے کا احترام کرتے ہوئے جھگڑا ختم کر دے گا۔

سحری کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔" (بخاری)

فوائد مسائل:

1۔ السحور کا لفظ سین کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے اور پیش سے بھی۔ سین کی زبر سے سحور کا مطلب وہ طعام ہے جو روزہ شروع کرنے سے پہلے کھایا جاتا ہے اور سحور (سین کی پیش سے) کھانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھانا باعث برکت ہے۔ اس کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ یہ ایک مسنون عمل ہے اور اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی بھی ہوتی ہے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کھائے جانے والے کھانے میں ایک خاص برکت ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق سنت نبوی سے ہے اور اس کی وجہ سے غیر مسلموں کی مشابہت سے بچاؤ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ سحری نہیں کھاتے۔

2۔ ثواب کا تعلق مشقت سے نہیں، احکام شریعت کی پابندی سے ہے۔ سنت کے مطابق تھوڑا اور آسان عمل اس زیادہ اور مشقت طلب عمل سے بہتر ہے جو سنت نبوی کے خلاف ہو۔

سحری دیر سے کھانے کا بیان

حضرت ـــــ مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر اٹھ کر نماز کی طرف چلے۔"

(حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا) میں نے کہا۔ "ان دونوں کاموں کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟"

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا "پچاس آیتوں کی تلاوت جتنا۔" (بخاری)

فوائد مسائل:

1۔ اگرچہ سحری کا کھانا صبح صادق سے کافی پہلے بھی کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ رات کے آخری حصے میں صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے کھایا جائے۔

فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کے بعد مختصر وقفہ دے کر فجر کی نماز ادا کی۔

عیدالفطر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے

مدینے تشریف لائے تو فرمایا۔ ''تم سال میں دو دن خوشیاں منایا کرتے تھے، اب اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے یعنی عیدالفطر اور عید الاضحیٰ۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''یہ ایام یعنی عید کے دن کھانے پینے، باہم خوشی کا لطف اٹھانے اور خدا کو یاد کرنے کے ہیں۔'' عید کے دن صفائی ستھرائی اور نہانے دھونے کا اہتمام کرنا، اچھا لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون اعمال ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عید کا دن تھا، کچھ لونڈیاں بیٹھی وہ اشعار گا رہی تھیں جو جنگ بعاث سے متعلق انصار نے کہے تھے کہ اسی دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا تشریف لائے۔ بولے۔

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں یہ گانا بجانا؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ابوبکر رضی اللہ عنہا رہنے دو، ہر قوم کے لیے تہوار کا ایک دن ہے اور آج ہماری عید کا دن ہے۔''

ایک بار عید کے دن کچھ حبشی بازی گر فوجی کرتب دکھا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کرتب خود بھی دیکھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنی آڑ میں لے کر دکھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بازی گروں کو شاباش بھی دیتے جاتے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اچھا اب جاؤ۔'' (بخاری)

عیدالفطر کی خوشی منانا مسنون ہے اور نماز عیدالفطر کی ادائیگی دراصل ماہ رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت سے ادا کی گئی عبادات اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تقویٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں۔ ''میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز عید ادا کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے سے پہلے بلا اذان و اقامت نماز ادا فرمائی پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہا پر ٹیک لگا کر کھڑے رہے۔ اور تقویٰ اللہ کا حکم دیا اور اطاعت الٰہی کی ترغیب دی۔ لوگوں کو نصیحت اور وعظ کیا۔ پھر عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو بھی پند و نصائح فرمائے۔'' ابوداؤد

عیدالفطر کے دن خوشی منانے کا مقصد رمضان المبارک میں گناہوں کی بخشش پر اللہ تعالیٰ سے اظہار تشکر کرنا ہے۔ لیکن ہم لوگ عیدالفطر کی تیاریوں میں اس قدر مشغول ہو جاتے ہیں کہ آخری عشرے کی فضیلت اور اس کی بے پناہ رحمتوں سے بھی بے نیاز ہو کر غیر ضروری اور غیر شرعی کاموں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے لگ جاتے ہیں۔

اس طرح عید کے دن بھی طرح طرح کی خرافات اور غیر اسلامی افعال کے ذریعے سارے مہینے کی ریاضت اور عبادت کو اکارت کرنا پرلے درجے کی بے وقوفی اور ظلم و زیادتی کی انتہا ہے۔ عید کی خوشی بجا طور پر منانی چاہیے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اسراف اور فضول خرچی نہ ہونے پائے اور نہ خوشی مناتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حدود پامال ہوں۔ ایسے اعمال اور رویوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

اسلام نے ہمیں غمی اور خوشی منانے کے لیے ایک متعین ضابطہ عطا فرمایا ہے۔ خوشی کے مواقع پر غرور تکبر اور اپنی مالداری کا اظہار ناپسندیدہ اعمال ہیں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں توازن اور اعتدال کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا عیدالفطر کے پرمسرت موقع پر بھی نیاز مندی، وقار، بندگی اور عاجزی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

عید کی تیاریوں اور عید کی خوشیوں میں اپنے

پڑوسیوں ، غربا، مساکین ، یتیموں، بیواؤں ، مسافروں اور معاشرے کے تمام محروم طبقات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے۔ اس جذبے اور عمل سے رمضان المبارک کے فیوض و برکات اور حقیقی روح سے سرشار اور مستفید ہوا جاسکتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں۔
"عیدالفطر کے دن جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند کھجوریں نہ کھالیتے عیدگاہ کو تشریف نہ لے جاتے اور آپ طاق کھجوریں تناول فرماتے۔"
بخاری

حضرت جابر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن دو مختلف راستوں سے آتے جاتے تھے۔" بخاری

اس حدیث کی رو سے دو مختلف راستوں سے آنے جانے میں یہ فلسفہ کارفرما ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے میل ملاپ ہو اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی حاصل ہو۔ نماز باجماعت اور جمعتہ المبارک کی نماز کے بعد اسلام میں عیدالفطر کی نماز مسلمانوں کی اجتماعیت کو مضبوط کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو بڑھانے پر تقویت ملتی ہے۔ جس سے یقیناً اسلام اور مسلمانوں کو اپنی قوت اور شان و شوکت کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔

جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اس رات میں اللہ کی عبادت کے لیے کھڑا نہیں ہوتا تو گویا اسے قرآن مجید کی اس نعمت عظمیٰ کا احساس ہی نہیں ہے جو اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اگر اسے اس بات کا احساس ہوتا تو وہ ضرور رات کے وقت عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور شکر ادا کرتا کہ اے اللہ! یہ تیرا احسان عظیم ہے کہ تو نے مجھے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بے شک یہ بھی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے لباس عنایت فرمایا۔ لیکن تیرا اصل احسان عظیم مجھ پر یہ ہے کہ تو نے مجھے ہدایت دی اور دین حق کی روشنی دکھائی۔ مجھے تاریکیوں میں بھٹکنے سے بچایا اور علم حقیقت کی وہ روشن شمع عطا کی۔ جس کی وجہ سے میں دنیا میں سیدھے راستے پر چل کر اس قابل ہوا کہ تیری خوشنودی حاصل کر سکوں۔

پس جس شخص کو اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا۔ وہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوگا اور اس کی بھلائی لوٹ لے جائے گا۔ لیکن جو شخص اس رات میں ادائے شکر کے لیے اللہ کے حضور کھڑا نہیں ہوا۔ وہ اس کی بھلائی سے محروم رہ گیا اور درحقیقت ایک بہت بڑی بھلائی سے محروم رہ گیا۔

روزہ اور قرآن کی شفاعت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے کہ اے رب! میں نے اس کو دن بھر کھانے (پینے) اور شہوت سے روکے رکھا، تو میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما..... اور قرآن کہتا ہے کہ (اے رب!) میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا، تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ پس دونوں کی شفاعت قبول فرمائی جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روزہ اور قرآن کوئی جان دار ہیں جو کھڑے ہو کر یہ بات کہتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک روزہ دار کا روزہ رکھنا اور قرآن پڑھنے والے کا قرآن پڑھنا دراصل خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

رقیہ سیف، ملتان

س: شادی کب ہوئی؟

ج: ہماری شادی 13 اپریل 2014ء میں ہوئی اور الحمدللہ انتہائی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔

س: شادی سے پہلے مشاغل و دلچسپیاں؟

ج: رسالے پڑھنا، بھائیوں کو تنگ کرنا ابو سے اپنی باتیں منوانا اور امی سے ڈانٹ کھانا، بھئی پیار سے ڈانٹ کھانا، ورنہ آپ کہیں ہمیں ایسا ویسا نہ سمجھ لیجیے گا۔ نئے نئے کپڑے بنانا اور پیارے پیارے جوتے خریدنا اس کے علاوہ گھر کے کاموں میں امی کی مدد کرنا۔ رات کو اپنی فرینڈز سے چیٹ کرنا بس یہی دلچسپیاں۔

س: رشتے میں مرضی شامل تھی یا بڑوں کے فیصلے پر سر جھکایا؟

ج: سیف میرے ماموں کے بیٹے تھے اور میری امی کے اکلوتے لاڈلے بھتیجے تھے۔ رہی بات مرضی کی تو امی نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے فرماں بردار بن کے سر جھکا دیا اور اس فرماں برداری کا کیا خوب انعام پایا ہے۔ سیف جی کی شکل میں الحمدللہ۔ میرے ماموں اور مامی کی تو کافی سال پہلے ڈیتھ ہو چکی تھی آگے پیچھے تو سیف کو ان کی خالہ نے پالا تھا۔ ان کی خالہ کے اپنے بھی چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اپنا آٹھواں بچہ سمجھ کر انہوں نے سیف کو اپنی آغوش میں لیا اور ماں بن کر پالا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیکی کا اجر عطا کرے۔ آمین۔

س: جیون ساتھی کے بارے میں کیا تصورات تھے؟

ج: جناب ہر لڑکی کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا یا آرزو تھی کہ ہم سفر جو بھی ہو لیکن بس کیئرنگ ہو اور خوش مزاج ہو تو ماشاءاللہ سے سیف کیئرنگ ہیں لیکن مزاجاً سنجیدہ انسان ہیں، لیکن فطرتاً اچھے واقع ہوئے ہیں۔ الحمدللہ۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے ملاقات وغیرہ؟

منگنی دو مہینے رہی اور شادی سے پہلے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب سیف کی خالہ رشتہ مانگنے آئیں تو سیف بھی ساتھ آئے تھے۔ لیکن میں ان کے سامنے بالکل نہیں گئی (بھئی شرم وحیا بھی کوئی چیز ہے) شادی کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ میں تمہیں دیکھنے کے بہانے آیا تھا لیکن تم تو پاتال میں چھپی بیٹھی تھیں شاید۔ (ہی ہی ہی) ویسے ہمارے خاندان میں شادی سے پہلے فون پہ بات کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیال؟

ج: جناب خیالات تو اچھے ہی ہوتے ہیں شادی سے پہلے لیکن پتا تو بعد میں ہی چلتا ہے سب کے بارے میں صحیح طرح۔

س: شادی کے لیے قربانی دینی پڑی کسی چیز کی؟

ج: کسی بھی چیز کی قربانی نہیں دینی پڑی پیاری بہنوں۔ تعلیم تو پہلے سے ہی چھوٹ چکی تھی۔ میرے ابو امام مسجد ہیں۔ تو ان کی خواہش کے مطابق میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور بعد میں قرآن وحدیث کی طرف توجہ دی۔ ماسٹرز کرنے کا بہت شوق تھا لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔

س: شادی بخیر وخوبی ہوئی یا کوئی بدمزگی؟

ج: بدمزگیاں وہ بھی شادی کے موقع پر؟ صرف اور صرف لالچی لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ہمارے کیس میں دونوں فریق سادہ لوگ ہیں۔ اسی لیے الحمدللہ کوئی بدمزگی نہیں ہوئی اور شادی بخیر وخوبی انجام پا گئی۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج: مجھے دیکھ کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ایک دم جیبیں ٹٹولنے لگے اور پھر منہ دکھائی دی مجھے۔ اس کے بعد باتیں کرتے رہے اور میں بھی بے جھجک ان سے

باتیں کرتی رہی۔ اب سیف بتاتے ہیں کہ شادی کی پہلی رات تمہاری بے تکلفی اور باتوں سے تو میں ڈر ہی گیا تھا کہ پتا نہیں کتنی چالاک لڑکی سے واسطہ پڑ گیا ہے اللہ ہی خیر کرے (ہا، ہا، ہا) ہے نا دوستوں مزے کی بات؟

س: شادی کے بعد کوئی تبدیلی؟

ج: شادی کے بعد تبدیلیاں تو آتی ہیں سب سے بڑی اور قابل ذکر تبدیلی تو یہی ہے کہ لڑکی لاپروائی چھوڑ کر ذمہ دارانہ رویہ اپنا لیتی ہے۔ اپنا نے سے پہلے تو میں یہی کہوں گی کہ ذمہ داری خود بخود آجاتی ہے۔ اچھی بات ہے ویسے کیونکہ جب تک ذمہ دار نہیں بنیں گے تو کوئی مقام کیسے پائیں گے۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: باقاعدہ طور پر تو کام سنبھالا ہی نہیں۔ گھر میں پہلے سے ہی دو بہوویں موجود تھیں تو ساس صاحبہ نے مجھ پہ کوئی باقاعدہ ذمہ داری نہیں ڈالی۔ اپنی مرضی سے جو کام کرنے والا نظر آتا کر دیتی تھی۔ اپنی مرضی سے سوتی جاگتی اور کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا۔ دیورانیاں بھی الحمدللہ اچھی تھیں۔ اس بات پہ اللہ کا لاکھ ہزار بار شکر ہے۔

س: میکے اور سسرال میں کھانے پکانے میں یا ذائقے میں فرق؟

ج: فرق تو جناب ہوتا ہی ہے لیکن اتنا زیادہ فرق نہیں تھا میری امی بھی مزے کے کھانے پکاتی تھیں اور ساس بھی بہت مزے کا کھانا بناتی تھیں۔ کھانا بنانے کا ڈیپارٹمنٹ میری ساس کا ہی تھا۔

س: وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟

ج: مقام ملتا نہیں ہے اپنی جان مار کر اپنی "میں" کو دبا کر مقام بنانا پڑتا ہے جتنی جلدی لڑکی اپنے آپ کو سسرال میں ایڈجسٹ کرلے گی اتنی جلدی دوسروں کے دل میں جگہ بنائے گی۔ رہی میرے سسرال کی بات تو میں جتنا عرصہ وہاں رہی خوش رہی ہوں اور دوسروں کو بھی اپنی ذات سے خوش ہی رکھا ہے۔ ماشاءاللہ

س: سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج: ہاں جی سب توقعات پوری ہوئیں۔ اخلاق اور مسکراہٹ کو اپنا وطیرہ بنالو پھر دیکھو کیسے سب آپ کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔

س: پہلے بچے کی پیدائش؟

ج: پہلے بچے کی دفعہ امی کے گھر گئی تھی۔ چالیس دن کرکے پھر اپنے گھر واپس آگئی تھی۔ کوئی خاص ذمہ داری تو سر تھی نہیں جو بچے کو سنبھالنا مشکل لگتا۔ میرا بیٹا بہت روتا رہتا تھا تو میری ساس کہتی تھی کہ تم اپنے بچے کو سنبھالو کام تو ہوتے ہی رہیں گے۔ میرا دوسرا بچہ بھی امی کے ہاں ہی ہوا۔ الحمدللہ میرے دو بیٹے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نیک اور صالحین بنائے۔ آمین

س: جوائنٹ فیملی سسٹم یا علیحدہ رہنا چاہیے؟

ج: جوائنٹ فیملی سسٹم ہی بہتر ہے بشرطیکہ ہم اچھے ہوں یا گھر کا سربراہ انصاف پسند ہو۔ میرے معاملے میں تو یہ ہوا کہ میرے شوہر کو ان کی خالہ نے پالا تھا شادی بھی خود کی خالہ کی، نیت پر تو کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ خالہ اور ان کی سب اولاد مخلص تھی سیف کے ساتھ لیکن یہ دنیا اور دنیا کی باتیں (آہ) دوسرے رشتہ دار لوگ پیٹھ پیچھے ہمیشہ یہی کہتے رہتے کہ خالہ نے پالا سنبھالا، اپنے ہاتھوں شادی کی۔ اب اس کی بیوی بچے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا جو یہ ابھی تک یہیں پر رہ رہے ہیں۔

کہتے ہیں آری کے ایک طرف دانت ہوتے ہیں لیکن دنیا تو دودھاری تلوار کی مانند ہے۔ بس ہماری غیرت نے گوارا نہیں کیا اور شادی کے دو سال بعد ہم گھر والوں سے علیحدہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے دو پیارے پیارے بیٹے دیے ہیں اور الحمدللہ میں اور میرے شوہر اپنے بچوں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی جنت میں خوش ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور میرے تمام مومن مسلمان بہن بھائی ماں باپ سب کو خوش رکھے۔ آمین۔

میری دعا ہے کہ میری تمام قارئین کنواری بہنوں کو اچھے شوہر اور اچھی سسرال عطا کرے اور سب کو آپس میں مل جل کر رہنے کی توفیق دے۔ آمین

☆☆

معروف فنکار

اسامہ اعظم خان سے ملاقات

شاہین رشید

ڈراما سیریل ''سانوری'' میں تبریز کا کردار کرنے والا فنکار اسامہ خان آج ڈرامہ انڈسٹری کی ضرورت بن گیا ہے۔ کیونکہ اسامہ خان نہ صرف ایک خوب صورت نوجوان ہے بلکہ بہت زیادہ باصلاحیت بھی، اس لیے آج کل ہر ڈائریکٹر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اسے اپنے سیریل میں بک کریں۔ آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل ''کچا دھاگا'' بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ جو بے حد مقبول ہو رہا ہے۔

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمداللہ۔''

''آج کل تو آپ ہواؤں میں اڑ رہے ہوں گے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آج کل اسکرین پر آپ کا راج ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ڈرامے میں نظر آ رہے ہیں۔''

''بہت شکریہ......''

''اسامہ! میں چاہوں گی کہ پہلے آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں، پھر آپ کی فیلڈ کی طرف آتے ہیں؟''

''جی جی......ضرور میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا 22 نومبر 1991ء میں ابتدائی تعلیم بھی گوجرانوالہ کے کانونٹ اسکول سے حاصل کی...... پھر اسی شہر سے ''اے سی سی اے'' کیا اور اس کے بعد آڈٹ اینڈ ٹیکسیشن میں اسپشلائز کیا۔ اور پھر لاہور کے ایک بینک میں جاب بھی کی۔

ہم چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی دو بہنیں اور دو بھائی، میرا نمبر آخری ہے۔ اس لیے سب کا لاڈلا بھی ہوں۔ ہم سب بہن بھائیوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ والدین نے بہترین تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے زیور سے بھی نوازا......الحمداللہ......والدین تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ گوجرانوالہ میں ہمارا ایک اسکول ہے جو پینتیس سال سے قائم ہے اور والدین اور ایک بہن اس کے انتظامی امور دیکھتے ہیں۔ میرا قصہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسکول کے اکاؤنٹس کے معاملات میں دیکھتا ہوں۔''

''گڈ......گوجرانوالہ کا شہری بینک کی جاب، یہ ٹی وی ڈراموں کی طرف آنے کا شوق کیسے ہو گیا۔ بچپن سے تو شوق ہوگا نہیں۔ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟''

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ مجھے بچپن سے قطعی شوق نہیں تھا۔ ہاں البتہ میری ماں کا بہت دل تھا کہ میں شوبز میں آؤں۔ وہ اکثر مجھے خواتین ڈائجسٹ اور دیگر میگزین میں شائع ہونے والے معروف شخصیات کے اور آپ کے لیے ہوئے انٹرویوز مجھے پڑھ کر سنایا کرتی تھیں تو مجھے بھی شوق ہوا۔ مگر اس فیلڈ میں آنا کیسے ہے۔ یہ کچھ نہیں معلوم تھا۔ ہاں آپ کو بتاؤں کہ میں جاب کے سلسلے میں لاہور میں رہتا تھا...... اور فٹنس کے لیے جم جوائن کیا ہوا تھا۔ اور جم میں ہی میری ملاقات معروف ڈائریکٹر انجلین ملک سے ہوئی۔ وہ اپنے ڈرامہ سیریل کے لیے آڈیشن لے رہی تھیں۔ مجھ سے بھی بات چیت کر کے انہوں نے مجھے اپنے ڈرامے "مجھے جینے دو" کے ایک سپورٹنگ رول کے لیے بک کرلیا اور یوں اس فیلڈ میں میری انٹری ہوگئی۔"

"گویا پلک جھپکتے...... کام ہوگیا؟"

"جی نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابھی مزید بتاتا ہوں آپ کو...... میرے کام کو دیکھتے ہوئے مجھے انجلین ملک صاحبہ نے کراچی کے کچھ ڈائریکٹرز کے نمبرز دے دیئے اور کہا کہ بس تم کراچی آجاؤ۔ میں نے انجام کو مدنظر رکھے بغیر کراچی شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور یوں میں کراچی آگیا۔ یہ بات 2017ء، 2018ء کی ہے۔ یہاں آیا تو ایک پروجیکٹ کے لیے مجھے بک کرلیا گیا۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے اس پروجیکٹ سے علیحدہ کردیا گیا۔ اب کیوں کیا گیا یہ وجہ نہیں بتائی گئی۔ دل بہت برا ہوا۔ جیسا سوچ کے آیا تھا ویسا ہوا نہیں۔ مگر اب واپس جانا بھی شرمندگی کا باعث بنا۔ تقریباً چھ سے آٹھ ماہ گزر گئے۔ اور کوئی کام نہیں ملا۔ مگر ہمت نہیں ہاری اور مختلف چینلز پر اپنی حاضری لگواتا رہتا تھا۔ کئی بار سوچا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر کس منہ سے سب کیا سوچیں گے۔"

"لوگ کیا کہیں گے، کیا سوچیں گے، یہ بات انسان کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ خیر پھر واپس گئے؟"

"نہیں، بس ایک صبح مجھے کامران اکبر صاحب کی کال آگئی۔ ڈائریکٹر ہیں یہ میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان کی کال آئی کہ آجاؤ۔ ایک رول ہے تمہارے لیے ایک سیریل بن رہا تھا "ساتوری" اس کے لیے مجھے بک کرلیا گیا۔ یہ سیریل میرے لیے بہت لکی ثابت ہوا اور بس...... پھر یوں سمجھیں کہ راستے کھلتے چلے گئے۔ کامران اکبر نے مجھے لے کر بڑا رسک لیا اور انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ بات یہ بھی ہے کہ شروع شروع میں، میں بہت شرمیلا اور ڈرپوک ٹائپ کا انسان تھا بس پھر اچھا ماحول ملا۔ اچھے رول ملے۔ اچھے ڈائریکٹرز ملے تو شرمیلا پن اور ڈر ختم ہوا۔"

"کس کے ساتھ کام کر کے بہت سیکھا آپ نے؟"

"سب سے بہترین استاد تو وقت ہے۔ پہلے میں اس بات کو نہیں مانتا تھا مگر اب مان گیا ہوں...... پھر اگر ڈائریکٹرز کی بات کروں تو مجھے ابھی تک بہت ہی اچھے لوگ ملے جنہوں نے میری صلاحیتوں کو پرکھا اور اس سلسلے میں میں دانش نواز، وجاہت حسین اور مہرین جبار کا نام ضرور لوں گا کہ جنہوں نے میری

صلاحیتوں کو پرکھا اور میرے اندر کے فنکار کو باہر نکالا۔"

"اب تو ہر ڈرامہ ہی عروج پہ جاتا ہے۔ آج کل کچا دھاگہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس سے قبل "دوبارہ"۔ "اک ستم اور"۔ "عشق جلیبی" اور دیگر کسی ڈرامے کے بارے میں کیا کہنا چاہو گے؟"

"میرے لیے تو سارے ہی ڈرامے بہت اچھے ہیں لیکن پھر بھی میں ڈرامہ سیریل "دوبارہ" کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ اس ڈرامہ سیریل کے لیے مجھے دانش نواز صاحب نے کال کی اور کہا کہ ایک اسکرپٹ بھیج رہا ہوں اسے پڑھو اور بتاؤ کہ تم اس میں کام کرو گے؟ مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ چند اقساط پڑھ کر ہی مجھے اتنا مزہ آیا کہ میں نے لیس کر دیا کیونکہ مجھے اس کی کہانی بہت منفرد لگی تھی اور میرا آئیڈیا تھا کہ یہ بہت مقبول ہوگا۔ پھر حدیقہ کیانی۔ انکار کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ حدیقہ کیانی بہت ہی سلجھی ہوئی اور نفیس خاتون ہیں بہت اچھا لگا ان کے بیٹے کا کردار کر کے۔"

"اس میں جو تھپڑ پڑا تھا حدیقہ کیانی سے وہ اصلی تھا یا ساؤنڈ ٹریک تھا؟"

"ہاہاہا۔ اصلی تھا اور تین بار پڑا تھا۔ بعد میں حدیقہ کیانی صاحبہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ تھپڑ تیز ہو گیا تھا۔ لیکن بھئی ڈراموں میں کچھ اصلی نہیں ہوگا تو حقیقت کا رنگ کیسے آئے گا۔ آپ کو بتاؤں کہ جب نیا نیا اس فیلڈ میں آیا تھا تو بس کردار دیکھتا تھا اور چینل... مگر اب بہت سوچ سمجھ کر سائن کرتا ہوں۔ اب اسکرپٹ، ڈائریکٹر، فنکار رائیٹر اور چینل دیکھتا ہوں۔"

"گویا اب بڑے فنکار ہو گئے ہو؟"

"ایسا نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے کردار ریپیٹ ہوں۔ اور لوگ کہیں کہ اسامہ تو ایک ہی طرح کے کردار کرتا ہے۔"

"گوجرانوالہ کے بندے کو لاہور ایک مختلف

شہر لگا ہوگا اور جب کراچی آئے تو یہ بھی مختلف لگا ہوگا۔ کچھ کہیں گے اس بارے میں؟"

"کراچی کے بارے میں اگر بتاؤں تو کراچی میں مسائل بہت ہیں۔ مگر یہاں کے لوگ بہت محنتی اور پروفیشنل ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ یہ ایک تیز رفتار شہر ہے اور جو تیز رفتاری کے ساتھ چلتا ہے وہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ یہ پیشہ ورانہ اعتبار سے بہت آگے ہے۔ مجھے اس شہر نے بہت متاثر کیا ہے۔ یہاں کی لائف مشینی بھی ہے اور یہاں کے لوگ انجوائے بھی کرتے ہیں۔"

"بڑی اسکرین پہ کب آرہے ہیں؟"

"ہوں...... بڑی اسکرین کی آفرز آچکی ہیں۔ معذرت بھی کرچکا ہوں۔ کسی بہت ہی اچھے پروجیکٹ کا انتظار ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ابھی تو سارا فوکس ڈراموں پر ہے۔"

"اب تھوڑے سے نجی سوال ہو جائیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جی جی...... بالکل۔"

"آپ یہاں کراچی میں اپنی فیملی کے بغیر رہتے ہیں۔ فیملی کی خواہش ہوگی کہ آپ کو بندھن میں باندھ دیں تاکہ آپ اکیلے نہ رہیں؟"

"سچ بتاؤں...... والدین بھی ابھی اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ میں شادی کروں۔ والد صاحب کا کہنا ہے کہ پہلے مکمل سیٹ ہو جاؤ۔ پھر شادی کرنا اور میں خود بھی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنی آزاد زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ سچ میں آزادی میں بڑا مزہ ہے۔"

"فٹنس کا راز؟"

"میں کم کھاتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو لذیذ کھانوں سے تھوڑا دور رکھتا ہوں۔ بھوک کے وقت دلیہ کھاتا ہوں جو میں گھر سے بنا کر لے جاتا ہوں اور دوپہر کو وہی کھاتا ہوں۔"

"ہیرو بننا آسان کام نہیں ہے؟"

"ہاہاہا...... بالکل ٹھیک کہا۔"

"کیا خود بھی پکا لیتے ہیں؟"

"بالکل بنا لیتا ہوں۔ مثلاً چکن ہر طرح کی، بھنڈیاں، آلو گوشت سب بہت اچھا بنا لیتا ہوں۔ اور سبزیاں بہت اچھی کاٹ لیتا ہوں۔ اب آپ کہیں گی کہ کیا ٹریننگ لی ہے تو سبزیاں کاٹنے کی تھوڑی ٹریننگ لی ہے کیونکہ مجھے ایک کمرشل کے لیے یہ کام کرنا تھا۔ سو کرلیا۔"

"غصہ آتا ہے؟"

"بالکل آتا ہے۔ مگر عموماً کسی غلط بات پر ورنہ میں تو بہت ٹھنڈے مزاج کا ہوں۔"

"کاش ایسا ہوتا...... ایسا نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ کیا ایسا سوچتے ہیں؟"

"میں اگر مگر کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی ایسا سوچتا ہوں۔ اپنے کام کو اچھی طرح کرنے کا قائل ہوں انجام اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

"آپ کی کوئی عادت جو خود بھی پسند کرتے ہیں؟" "میں سب سے بنا کر پیار محبت کے ساتھ رہنے کا قائل ہوں نہ مجھے لگائی بجھائی آتی ہے نہ میں کسی کے ساتھ منفی رویہ رکھتا ہوں۔ اپنے کام سے کام اور اچھے تعلقات یہی عادت مجھے اپنی پسند ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے اسامہ اعظم خان سے اجازت چاہی۔

☆☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

خاقان شاہ نواز

”کیسے مزاج ہیں؟“

”الحمد للہ۔“

”گزشتہ دنوں ”بے پناہ“ میں دیکھا اور اب ”یونہی“ میں دیکھ رہے ہیں۔ بہت اچھا پرفارم کر رہے ہیں؟“

”جی بہت شکریہ۔“

”اسی لیے بہت نخرے ہو گئے ہیں؟“

”کیا مطلب۔“

”یہی کہ فون کرو...... بند، مصروف ہوں۔ ٹائم نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ؟“

”سچ کہوں...... واقعی ٹائم نہیں ہے۔ کیونکہ اداکاری، ماڈلنگ، کمرشلز سب میں اتنا زیادہ مصروف رہتا ہوں کہ بالکل بھی ٹائم نہیں ملتا بات چیت کرنے کا۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

”جی...... ضرور میرا پورا نام ”خاقان شاہ نواز“ ہے میں 16 نومبر 1994ء میں پیدا ہوا۔ چھ فٹ میرا قد ہے پیار سے مجھے خانو بلاتے ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں، میں بڑا ہوں ہماری مادری زبان پنجابی ہے اور ہاں میں نے ایل ایل بی کی ڈگری لی ہے۔“

”آمد کیسے ہوئی۔ گھر والوں نے کہا کہ ڈگری ایل ایل بی کی اور کام شوبز کا؟“

”جی...... گھر والے تو کہتے ہی رہتے ہیں۔ مگر کام وہی کرنا چاہیے جس سے آپ کو فائدہ ہو یا جو آپ کا دل کر رہا ہوں۔ تو بس میرا اسی کام میں آج کل دل لگا ہوا ہے۔ دل بھر گیا تو ڈگری زندہ باد۔“

”ہوں...... یہ تو ہے، کتنا ٹائم ہو گیا آپ کو اس فیلڈ میں اور کتنے ڈرامے کر چکے ہیں؟“

”ٹائم تو زیادہ نہیں ہوا۔ البتہ ڈرامے تین کیے ہیں ”بے پناہ“ اور یونہی زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ کچھ کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔“

”گڈ...... کردار کون سے پسند ہیں۔ مطلب ابھی تو آپ نئے ہیں تو ہر کردار ہی قبول کریں گے؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے کہ میں چونکہ نیا ہوں تو ہر کردار کر لوں گا۔ میں وہ رول کروں گا جن کے اندر گہرائی ہو گی۔ مجھے کامیڈی کرنا بھی پسند ہے اور ہلکے پھلکے رول کرنا بھی پسند ہے۔ بس بات وہی ہے کہ کردار میں گہرائی ہو کچھ پرفارم کرنے کے لیے ہو

......ورنہ آفرز تو بہت ہیں۔"
"کس قسم کی کامیڈی؟ اس کی بھی تو کئی قسمیں ہیں؟"
"میں نے اسٹیج ڈرامے بہت دیکھے ہیں۔ افتخار ٹھاکر صاحب، اکرم اداس صاحب کو بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ ان کے ڈرامے مجھے رٹے ہوئے ہیں تو جس طرح کی یہ کامیڈی کرتے ہیں اس طرح کامیڈی کرنا چاہتا ہوں کہ مطلب بھی پورا ہو جائے اور لوگ بھی محظوظ ہوں۔ مجھے کامیڈی سے پیار ہے۔ پاکستان کی جو کامیڈی ہے وہ ایک لیول کی کامیڈی ہے۔"
"کیا کامیڈین کو وہ عزت حاصل ہے جو ان کا حق ہے؟"
"نہیں، میں باہر کے ممالک میں دیکھتا ہوں کہ ان کے یہاں کامیڈین کی بہت عزت ہے۔ جب "چل میرا پت" آئی تو اس کو کس طرح سراہا گیا۔ اس میں انڈیا کے بھی لوگ ہیں اور ابھی جو سہیل صاحب کی مووی آئی اس کو کتنا سراہا گیا اور جس طرح انڈیا کے لوگ سہیل صاحب کی عزت کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ کاش پاکستان میں بھی ایسا ہوتا تو آج ہم کہاں سے کہاں ہوتے۔"
"ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں کامیڈین کی عزت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج سب اتنے مشہور نہ ہوتے۔ خیر ہیرو یا ولن ٹائپ کے کردار کرنے کی خواہش نہیں ہے کیا؟ آپ ویب سیریز بھی کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی بتایئے؟"
"جی...... مجھے ہیرو بننے کا بھی شوق ہے اور ولن بننے کا بھی بات پھر وہی ہے کہ رول اسٹرونگ ہو اور ویب سیریز میں کام کرنے کا تجربہ بھی اچھا ہے۔"
آپ نے مائرہ خان کی پروڈکشن میں بارہواں کھلاڑی کیا۔ کیسا رہا تھا یہ تجربہ؟"
"کسی بھی پروڈکشن ہاؤس میں کام کرنے کا بہترین تجربہ مائرہ خان کے ساتھ ہوا۔ کیونکہ وہ نہ صرف بہت اچھی انسان ہیں بلکہ بہت اچھی اداکارہ بھی ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح چلنا چاہیے۔ آپ ایک بات یاد رکھیں جب آپ کا ڈائریکٹر یا پروڈیوسر خود بھی ایکٹر ہو گا تو ہمیشہ آپ سے اچھا سلوک کرے گا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ آرٹسٹ کی کیا عزت ہونی چاہیے تو حکومت پاکستان کو بھی اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ آرٹسٹ ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں خاص طور پر لیجنڈ ...... ان کی عزت کرنا ان کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔"
"بالکل ...... آپ کا ارادہ ہے۔ لیجنڈ لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا؟"
"دیکھیں ...... ابھی تو میں اس فیلڈ میں نیا ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت آگے جانا ہے۔ بہت کمانا ہے۔ پھر اس بارے میں سوچوں گا۔"
"آپ لاہور میں فیملی سیالکوٹ میں ...... وجہ؟"
"میری فیملی میں ابھی صرف میرے والدین اور میرا بھائی ہے۔ شادی میری ہوئی نہیں۔ لاہور میں اس لیے رہتا ہوں کہ میرا کام اس شہر میں ہے۔ میرا رزق شوبز سے بندھا ہوا ہے تو کبھی کراچی اور کبھی لاہور ...... تو اکیلا ہی رہتا ہوں کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر۔"
"شادی کر لیں؟"
"شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔"
"میڈیا...... میں آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے آپ نے کیسا پایا اس فیلڈ کو؟"
"سب اچھا ہے سوائے نفرت کے اور نفرت پھیلانے والے میڈیا کے لوگ نہیں ہیں۔ وہ کچھ اور ہی لوگ ہیں۔"
"کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتے ہیں؟"
"چھوڑی تو بری چیزیں جاتی ہیں۔ جبکہ اداکاری کی فیلڈ بری چیز نہیں ہے۔ اور جس فیلڈ سے آپ کا روزگار وابستہ ہو اسے نہ کوئی چھوڑنے کو کہتا ہے نہ ہی کوئی چھوڑتا ہے۔"

☆☆

شادی مبارک ہو

جویریہ مریم

تو ڈیئر قارئین! یہ قصہ ہے ہمارے چاچو کے سب سے بڑے فرزند کی شادی کا، بہت انتظار تھا ہم سب کو اس کی شادی کا تقریباً تین سال سے چاچو، چاچی نے بلال کی شادی کا بگل بجایا ہوا تھا مگر آثار ندارد۔

خدا، خدا کر کے آثار نمودار ہوئے اور چاچی نے کمر کس لی، دور دور لڑکی تلاش کرنے کے لیے ایسے ایسے عذر تراشے جاتے کہ ہم کانوں کو ہاتھ لگا کر رہ جاتے۔ (یا اللہ! دین کو سمجھنے والوں کا یہ حال ہے تو دنیا کو سمجھنے والوں کا کیا حال ہوگا؟)

چاچی سے پوچھو کہ آپ کو کیسی لڑکی چاہیے؟" تو ان کا ایک ہی جواب۔

"بس...... اللہ پاک کوئی فرماں بردار، خدمت گزار سی بہو دے دے۔"

جہاں ایسی لڑکی ملتی اس کے باپ، بھائیوں کے کاروبار تک کی پوری، پوری تفتیش کی جاتی اور یہ بھی کہ بڑی بیٹی کو ان لوگوں نے کتنا جہیز دیا تھا۔ گاڑی دی تھی یا ون، ٹو، فائیو۔ کھانا کیسا کھلایا تھا بارات کو۔ میرج ہال میں انتظام تھا یا گاؤں میں ہی ٹینٹ لگوائے تھے۔

ہمارے ابو جی نے تو ایک دن تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔

"یار! تم لڑکے کو بیچ تو نہیں رہے کہیں؟" چاچو کھسیانے سے ہو گئے۔

"نہیں یار......! اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ یہ رشتے ناتے پوری تحقیق کے بعد ہی جوڑنے چاہئیں۔ بعد میں پچھتانے کا کیا فائدہ؟"

خیر! بڑی تلاش و بسیار کے بعد ایک لڑکی پہ ان لوگوں کا دل ٹھہر ہی گیا آخر۔ اور چٹ منگنی، پٹ منگنی (یہ الفاظ ہماری کزن کے ہیں جناب!) یعنی چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ پیش آیا اور 14 مارچ کی شادی قرار پائی۔ چاچوؤں میں سے پہلے چاچو کی پہلی اولاد کی شادی تھی اور ہمارے خاندان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

ہم نے دن رات ایک کر کے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خاندان کے ہر گھر میں رنگا رنگ ملبوسات نکھرے نظر آنے لگے۔ یوں شادی کے دن آن پہنچے اور ہم بھی شادی سے ایک دن پہلے، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ، بہنوں اور کزنوں کے ہمراہ چاچو کے گھر جا پہنچے۔ (چاچو کا گھر ہم سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پہ ہے) تو جناب! جیسے ہی ہم وہاں پہنچے، چاچو کے گھر کی رونق کو چار نہیں آٹھ چاند لگ گئے۔ ورنہ تو اکا دکا مہمان پھر رہے تھے اور...... دولہا صاحب سامنے ہی سامنے دیگ میں منہ دیے رکوع کی حالت میں تھے۔

خیر...... ان لوگوں نے ہمارا بہت اچھا خیر مقدم کیا۔ فٹا فٹ لمبا چوڑا دستر خوان لگایا جانے لگا۔ اتنی دیر میں ہم نے عشاء کی نماز پڑھ لی۔ (جی! ہم لوگ عشاء کے وقت پہنچے تھے وہاں)

نماز پڑھ کر کھانا کھایا گیا۔ بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا کھانے کا۔ دستر خوان سمیٹنے کے بعد ہم سب ہلکے پھلکے سے تیار ہوئے۔ میں نے بلیک اور ٹی پنک کنٹراسٹ میں کافتان پہنا تھا۔

ہنسی مذاق! باتیں، قہقہے اور مہندی کا دور ساتھ ساتھ چلا۔ (مہندی کے فنکشن کی نہیں، ہاتھوں میں مہندی کے گل بوٹے بنانے کی بات کر رہی ہوں۔)

اور ہاں...... بتاتی چلوں کہ ہمارے خاندان کی شادیاں بہت سادہ ہوتی ہیں۔ نہ کوئی ڈھول ڈھمکا، نہ دھوم دھڑکا نہ مہندی نہ مووی۔ نہ ناچ نہ گانا...... اور

جناب ہمیں تو اپنے گھر اور خاندان کی یہ شادیاں اچھی لگتی ہیں مگر کئی رشتہ دار اور جاننے والے، روکھی پھیکی شادی کہہ کرناک بھوں چڑھاتے نظر آتے ہیں کہتے ہیں۔

''تم لوگ شادیوں کو ہر رنگ اور رونق سے محروم کر دیتے ہو۔'' اور ہمارا اور ہمارے خاندان والوں کا ایک ہی جواب۔ (بے نیازی بھرے انداز میں)۔

''ایسی رونقوں سے اللہ بچائے رکھے جن سے اللہ بھی ناراض اور پیسہ بھی ضائع۔ بھئی جن پیسوں کو گناہ کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں، وہ پیسے اگر کسی مسجد، مدرسے میں چلے جائیں تو یہ سودا بہتر ہے۔'' اللہ، اللہ! خیر صلا۔

خیر...... تو جناب! بات ہو رہی تھی ہنسی، قہقہوں اور مہندی کی۔ تو ہم مہندی لگواتے لگواتے ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔ ارادہ تھا کہ سونے سے پہلے نیٹ کے کافتان کو چینج کر لیں گے مگر جب نیند آ جائے۔ ہم سب بھول، بھال جاتے ہیں۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو چھوٹی چاچی جو ماشاء اللہ اچھی خاصی سے بھی زیادہ صحت مند ہیں۔ ہمارے برابر خراٹے لے رہی تھیں اور ہمارا نازک اندام بدن جلنے، جلنے سے قاصر! نیٹ کا نگینہ کافتان چاچی کے وجود کے نیچے دم توڑ رہا تھا۔ (یقین کریں ہم بڑوں کا مذاق اڑانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ چاہے بڑے کتنے ہی دل دکھانے والے کیوں نہ ہوں۔ بس اس تحریر کو ہلکا پھلکا بنا رہے ہیں۔ اور اصل میں ہمیں اپنا کافتان بہت، بہت اچھا لگا تھا تو بس اس کی حالت دیکھ کر حلق اچھل کر دل میں آ گیا۔ جی جی دل اچھل کر خیر......)

تو جناب ہم بمشکل چاچی کو جگانے میں کامیاب ہو گئے۔ چاچی چارپائی سے کھڑی ہوئیں تو ہماری سانسیں تھم سی گئیں۔ لشکارے مارتے گولڈن نگ نیٹ کو چھوڑ چکے تھے۔ ذرا سے اٹکے ہوئے تھے بس۔ ہر نگ کے نیچے سوراخ ہو چکا تھا۔

ہم نے کراہتے دل سے لباس تبدیل کیا اور امی اور پھوپھو کی ڈانٹ سنی، (نماز قضا ہو گئی تھی فجر کی) ناشتہ کیا اور جت گئے تیاریوں میں، وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور بارات جانے کا شور مچ گیا۔ ہماری تیاریاں عروج پکڑنے لگیں۔ ہم نے گرے فراک ود بلیک شرارہ زیب تن کیا تھا۔ ٹھیک سمجھے آپ لوگ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو بارات میں جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (دارا حافظ عالم! چاچو حافظ) ویسے جب ہم چھوٹے تھے تو کئی باراتوں میں گئے تھے۔ اس دفعہ بھی دولہا کی بہن نے ہمیں سبز باغ دکھائے ہوئے تھے کہ بھائی کی بارات میں بھی چلیں گے۔ مگر جب اس نے اپنے والد محترم سے ڈرتے، ڈرتے کہا تو وہ رہی سہی ہنسی ہنس دیے۔

''نہیں بیٹی! ...... ایسی بات تو سوچنا بھی مت۔'' لو جی! مک گئی گل ہمارے بارات میں جانے کی۔ خیر بھائی دولہا بن کر اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ تو ہمارے چاچو تو بے چارے کا مذاق ہی اڑاتے رہتے تھے۔

''یہ تو نظر ڈٹو ہے نظر ڈٹو۔'' (جب ذرا چھوٹا ہوتا تھا تب کی بات ہے۔)

دولہا خوب چہک رہا تھا۔ اور اس بات سے ہم سب واقف...... کہ یہ بے چارے بڑے ہی بہت ہی زیادہ شوقین ہیں شادی کے، بہت تڑپنے، ترسنے کے بعد ان کی شادی ہوئی ہے۔ ویسے بڑے ذہین اور فطین ہیں یہ صاحب! بڑے تعلقات بنائے ہوئے ہیں۔ جن سے ہمارے باپ دادا ڈرتے ہیں کہ کہیں سیدھے کوٹ لکھپت یا پنڈی کی جیل میں نہ پہنچ جائیں۔ ٹھیک سمجھے ہیں آپ لوگ۔ مذہبی تحریک کے ایک اہم رکن ہیں ہمارے یہ کزن اور جھنگ کے مولاناؤں سے قریبی تعلقات اور شوخے بھی بہت ہیں۔ جاتے جاتے مڑ مڑ کر کہتے رہے کہ دلہن کے آنے سے پہلے پھولوں سے راستوں کو آراستہ کرنا بھول مت جانا۔ (اور ہم بھول گئے۔)

اس وقت یاد آیا جب دولہا جلتے دہکتے، شعلوں جیسی آنکھوں سے خالی، خولی راستوں کو دیکھ رہے تھے۔ تو جناب! بارات چلی گئی اور ہم سب کزنز تیار، شیار ہو کر اوپر، نیچے گھومتی رہیں۔ فریج میں رکھے تازہ گلاب کی پتیوں کے بھاری بھرکم شاپر جو دولہا کے

دوست رکھ کے گئے تھے۔ فریج میں ہی رکھے رہ گئے۔ ہم اپنی اپنی باتوں، ہنسی، قہقہوں میں مست!

دلہن آنے کا وقت ہوا تو ہماری ماند پڑتی تیاریاں پھر چمکنے لگیں۔ ہم نے گرے فراک، اور بلیک دوپٹہ شرارہ چینج کیا۔ اس دفعہ ہمارا ڈریس پیچ کلر میں تھا۔ پیچ شرٹ، پیچ پلازہ، آتشی گلابی دوپٹہ، بہت اچھا تیار کیا تھا بڑی بہن نے مجھے۔

ادھر ہماری تیاریاں مکمل ہوئیں۔ ادھر لائٹ گئی اور ادھر دلہن کی آمد ہوئی، بڑی بہن اندھیرے میں ہی دلہن کو اوپر لانے کے لیے دوڑ پڑیں۔ کیونکہ شور وغوغا میں کوئی کسی کی سن ہی نہیں رہا تھا اور بے چاری دلہن پندرہ منٹ سے گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ (دراصل ہم سب سیکنڈ فلور پر تھے۔ فرسٹ فلور خالی!)

اور دلہن کے ساتھ اس زیادتی پر دولہا صاحب آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتے اوپر آئے راستوں کو پھولوں سے محروم دیکھ کر آنکھیں جلتے شعلے بن گئیں۔

اشاروں کنائیوں اور پھر دھاڑ کر پوچھا کہ "راستوں میں گل پاشی کیوں نہیں کی دلہن کے لیے؟" پھر دوڑ کر کچن میں گئے اور ڈھیر ساری پلیٹیں اٹھا لائے اور زور سے گرجے (ایک ہاتھ میں گلاب کی پتیوں کا شاپر تھا)

"پکڑو یہ کس نے پکڑنی ہیں۔"

بے چارے کی کسی نے سنی ہی نہیں اور وہ نیچے چلے گئے۔ لائٹ آگئی تھی اور ہم دیوار کے ساتھ لگے کھڑے اپنے قہقہوں کا گلا بمشکل گھونٹ رہے تھے۔ ایک کزن نے وجہ پوچھی تو ہم نے چپکے سے اسے دولہا صاحب کی پھرتیاں بتائیں۔ ہم ابھی پلیٹوں میں پھول ڈالنے ہی والے تھے دلہن پہ نچھاور کرنے کے لیے کہ لائٹ گئی اور بہنیں دلہن کا لہنگا سنبھالتی اوپر پہنچ گئیں۔ ہر طرف سے ٹارچیں آن ہونے لگیں۔ ٹارچ کی روشنی میں ہی ہم نے جلال میں آئے دولہا کو دیکھا۔

وہ آگ وآگ ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر پھولوں سے محروم، استقبال کو دیکھ رہا تھا اور ہماری آنتوں میں گرہیں پڑ رہی تھیں ہنس ہنس کر۔ خیر دولہا کے دوستوں اور کزنز نے فٹافٹ تازہ گلابوں سے اس کے روم کو سجا مہکا کر رکھ دیا۔ بیڈ کے بیچ و بیچ یہ بڑا سارا تازہ گلابوں کا "دل" اپنی بہار دکھا رہا تھا۔

دیواروں پہ جگہ جگہ تازہ گلدستے، بیڈ سے دروازے تک آتا پھولوں کا راستہ۔

دولہا کا غصہ ذرا ٹھنڈا پڑا اور دلہن کو اس کی ساس کے کمرے سے اس کے کمرے میں لایا گیا۔

اور ہاں! میں یہ تو بتانا بھول گئی کہ دلہن بہت بہت پیاری تھی۔ یقین کریں بالکل۔ ستمبر 2021ء کے شعاع کے ٹائٹل کی ماڈل جیسی اس سے کچھ زیادہ خوب صورت ہی ہوگی۔ کم نہیں۔

خیر ہم سب رات گئے تک ہنستے، ہنساتے رہے اور پھر چینج کر کے سو گئے۔ اگلے دن شاندار سا ولیمہ تھا۔ وہ بھی شہر کے معروف ہوٹل میں۔ سوری! میرج ہال میں ہم نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئے۔

اٹھے تو بڑی بہن دلہن کو تیار کر چکی تھیں۔ (پارلر، چاچو نے جانے نہ دیا تھا۔ اور نہ ہی بیوٹیشن کو آنے دیا تھا۔ گناہ سمجھ کر جی ہاں۔)

ویسے یقین کریں دلہن اتنی پیاری تیار کی تھی سسٹر نے کہ کوئی یقین ہی نہیں کر رہا تھا کہ یہ پارلر سے تیار نہیں ہوئی۔ ویسے میری ایک باجی بیوٹیشن ہیں۔ ان ہی سے عائشہ نے میک اپ کرنا سیکھا ہے۔ سب ہی عائشہ کو داد دے رہے تھے اتنی اچھی دلہن تیار کرنے پر۔ خیر..... دلہن کے فوراً بعد عائشہ سے ہم تیار ہوئے۔ ویسے کے روز ہم نے پنک ڈریس پہنا تھا۔

میرج ہال میں منٹ کی مسافت پر تھا۔ جلدی، جلدی کرتے بھی ہم بہت دیر سے پہنچے تھے میرج ہال کی ساری ٹیبلز بک ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی کھانا لگ گیا اور جناب دلہن تو اپنے آنے والے مہمانوں کے ساتھ ڈریسنگ روم میں رہی وہیں ٹیبل پہ کھانا لگایا گیا تھا ان کے لیے.....اور ہم پانچ، چھ کزنز، چیئرز خالی نہ پا کر اسٹیج پہ آگئیں۔ صوفوں پہ بیٹھ کر مزے سے کھایا۔ بہت، بہت اچھا انتظام تھا کھانے کا۔ بس رائتہ ذرا کھٹا تھا۔ خیر دلہن میرج ہال سے ہی رخصت

ہوگئی۔ ہم نے اپنے اپنے عبایا پہنے اور بے دلی سے چاچو کے گھر کی طرف سفر شروع ہوا۔

(بے دلی اس لیے کہا کہ ابو لوگ کہہ رہے تھے کہ بس ابھی کے ابھی گھر واپسی کے لیے نکلنا ہے۔)

چاچو کے گھر پہنچتے ہی ہم نے واپسی کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ ساتھ ترلے منتیں بھی، کہ اب نہیں صبح جانا ہے۔ رات گئے تک فیصلہ بدل گیا ہم سب نے اپنے اپنے عبایا اتارے اور سکون سے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اور ہاں...... ایک ہنسی والی بات۔ (یار! زیادہ مت ہنسنا)

ہماری (یعنی میری) سفر میں بہت زیادہ طبیعت خراب ہوتی ہے۔ یعنی الٹیاں کر، کر کے بے حال ہو جاتی ہوں میں۔ اس لیے گھر سے میڈیسن کھا کر ہی بیٹھتی ہوں گاڑی میں اور خاص طور پہ جب۔ جب کھائی، بھی لیا ہو۔ تو سفر کا سوچ کر ہی جی الٹنے لگتا ہے۔ تو جناب! میں نے ہال سے گھر پہنچتے ہی کئی گولیاں ایک ساتھ پھانک کر پانی پی لیا۔

گولیاں کھانے کے آدھے گھنٹے بعد مجھ پہ نیند طاری ہونے لگی۔ میں بمشکل آنکھیں کھلی رکھنے میں کامیاب ہو رہی تھی کہ ابھی واپسی کے لیے گاڑی میں بھی بیٹھنا تھا اور جیسے ہی نہ جانے کا فیصلہ ہوا میں جہاں بیٹھی تھی وہیں ڈھے گئی۔ بغیر چینج کیے۔ کچھ دیر بعد چاچی نے یعنی دولہا کی امی نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ بہت مشکل سے میری جڑی پلکیں کھلی تھیں۔

چاچی مجھ پر برس پڑیں۔

"اتنی گولیاں ایک ساتھ کون کھاتا ہے۔ کچھ بولو تو سہی بچ میں چل تو نہیں گئی ہو۔ معدے میں ہیٹ بڑھ گئی ہوگی۔ مجھے تو لگ رہا ہے تمہارے حواس جاتے رہے ہیں۔"

میں نے نیند میں ڈوبا ایک طویل سانس لیا۔ اور نیند میں ڈوبی آواز میں ادھ کھلی آنکھوں سے بمشکل بولی۔

"چاچی! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس نیند آ رہی ہے۔"

"تمہارا دماغ اپنا ہی ہے؟ کس نے مشورہ دیا تھا الٹیوں کی اتنی گولیاں کھانے کا۔"

"کسی نے نہیں۔ خود ہی کھائی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

میری آنکھیں مکمل بند ہو گئی تھیں۔

چاچی نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اس بری طرح جھنجھوڑا کہ میں ہل کے رہ گئی پوری۔ دل الگ دھک دھک کرنے لگا۔

"ٹھنڈے پانی سے منہ دھوؤ اور اوپر جا کر ٹھنڈی فضا میں واک کرو کچھ دیر۔ اگر ایسے ہی سو جاؤ گی تو سوتی ہی رہ جاؤ گی اور لو...... یہ آئس کریم کھاؤ۔"

چاچی، امی اور پھوپھو نے مجھے زبردستی آئس کریم کھلائی۔ آئس کریم کھا کر میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور بلال کی بہن مجھے کھینچ کھانچ کر اوپر چھت پہ کھلی فضاؤں میں لے گئی۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ بہت ٹھنڈی رات تھی۔ میرے حواس کسی حد تک بحال ہو گئے تھے۔ ہم دونوں کافی دیر تک اس ٹھنڈی رات میں واک کرتے رہے پھر نیچے آ کر سو گئے۔

اگلی صبح فجر پڑھتے ہی بغیر ناشتے کے ہم نکل آئے تھے وہاں سے۔ اور یقین کریں۔ معدے میں گولیوں کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر یوں محسوس کرتی رہی جیسے گھر میں بیٹھی ہوں۔ بھائی (بہنوئی) کہہ رہے تھے۔

"منی! تم نے تو گولیاں اسٹاک کر لی ہیں معدے میں۔ چاہے جتنے مرضی سفر کر لو۔ طبیعت خراب نہیں ہوگی۔" اب ہنسنا بند کریں۔ اور ضرور بتائیے گا کہ اس شادی کا احوال کیسا لگا آپ کو۔

اللہ پاک تمام شادی شدہ جوڑوں کو خوش و خرم رکھے۔ ان کی زندگیوں میں کسی رنجش اور لغزش کا شائبہ تک نہ رہے۔ آمین!

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

زل حرل گجرات احمد پور شرقیہ سے لکھتی ہیں

تین مارچ بروز جمعۃ المبارک کو رسالے والے کے پاس حاضری دی۔ لیکن سوائے کف افسوس ملنے کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ (کیونکہ کالج سے 40 روپے رکشے کا کرایہ بھر کر گئی تھی) خیر! رات تمام ہوئی، سورج ابھرا، ہر سو زندگی چہچہا اٹھی تو ہم بھی کالج کی تیاری کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ (گھر کے پاس شوروم ہے تو خرابی حالات کی وجہ سے میں وہاں جاب کرتی ہوں) تو جی ہمیں بارہ بجے سے پہلے پہلے گھر پہنچنا ہوتا ہے اس لیے دوسرا پریڈ لے کر رسالے والے کے پاس سرپٹ دوڑ لگا دی (رکشے سے 40 روپے بھر کے) تب پرچا ملا۔

شام کو جاب سے واپسی پر پہلی شعاع سے پڑھنا شروع کیا جہاں بہار کی زبردست منظر کشائی کی گئی تھی۔ (آپی! میرے گھر میں بھی ایک کیاری ہے جس میں بڑا سا انار کا پودا۔ جس پر نارنجی کونپلیں اور ہرے دسر سبز و شاداب پتے لگ چکے ہیں۔ دو گچھیاں اور بھی کئی پھول دار پودے ہیں۔ اور چھ، سات ایلو ویرا ہیں جن کی آپی کے ہاتھوں شامت آئی رہتی ہے۔ ہاہاہا)

واقعی مہنگائی آؤٹ آف کنٹرول ہو چکی ہے۔ رسالہ 150 کا بنتا ہے ان حالات میں۔

پھر ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے "حمد و نعت" سنیں اس کے بعد "پیارے نبی کی پیاری باتوں" سے دل کو پرنور کیا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" (ت۔ر — کراچی) اچھا تھا۔ اس کے بعد فلک رابعہ صاحبہ کی بیٹی کی شادی اٹینڈ کی۔ فلک جی نے اچھی کاوش کی، خواتین ویٹرز کے ذریعے۔ اس کے بعد خط آپ کے پڑھے۔ آپی میں نے اس بار پیسے بچانے کی خاطر خواتین و شعاع دونوں میں خط ایک ساتھ پوسٹ کیے اور ارادہ کیا تھا کہ اس سال باقاعدگی سے شرکت کروں گی لیکن ہر خواہش ایسی کہ...... صبح چھ بجے اکیڈمی کے لیے نکلتی ہوں، اکیڈمی سے کالج، کالج سے واپسی پر پارٹ ٹائم جاب، پھر جاب سے واپسی پر ابو جی کے ہوٹل کا حساب کرنا اور سبق بھی یاد کرنا۔ ان سب بکھیڑوں سمیت آپ کو خط لکھا تھا جو شائع نہ ہوا۔

صدف آپ کو اسکول کے اسٹاف نے خطوں کی وجہ سے پہچانا تو اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں کیوں کہ آپ کے خط ہوتے ہی لاجواب ہیں۔

رمشا روشن نے دعوت دی ہے۔ رمشا حاضر تو ضرور ہوں گے۔ لیکن دو دیگیں زردے کی اور دو بکرے کھائے بغیر نکلیں گے نہیں۔ تو سوچ لیں یہ دعوت الٹا آپ کو مہنگی پڑ سکتی ہے۔ نظموں، غزلوں میں امجد اسلام امجد اول نمبر پر آئے۔ اس کے علاوہ باقی مستقل سلسلے بھی خوب رہے۔

پھر افسانوں کی طرف بڑھے۔ "بھرم"۔ ویلڈن! حنا بشریٰ جی۔ "فیصلہ" فہرست میں رائٹر کا نام قرۃ العین سکندر جبکہ افسانے پہ قرۃ العین خرم ہاشمی لکھا تھا۔ لیکن طرز تحریر مجھے قرۃ العین خرم ہاشمی صاحبہ کا لگا۔ تاجور نے اچھا فیصلہ کیا۔

"ناشتہ" شازیہ الطاف ہاشمی نے شبو کو خوب ناشتہ کرایا۔ نا چاہتے ہوئے بھی لبوں پر ہنسی دوڑ گئی۔ باپ "سراں دے تاج اور آشیانے کا دکھ" عندلیب زہرا اور فریحہ اشتیاق نے اچھی پارٹنرشپ کھیلی۔ ناولٹ سرے سے غائب!

"جھلملیں، آئینے اور سائے" نگہت سیماجی نے دل جیت لیا ماہی اور عثمان کو ملا کر۔ زبردست ناول تھا۔ صدیوں یاد رکھا جانے والا۔ "شہر شام ہجر" زبردست قسط تھی۔ آپی نے پڑھ کر کہا کہ سردار عیسیٰ اپنے بھائی کی کہانی سناتے سناتے اپنی کہانی بتا گیا۔ ہاہاہا۔ آپی شوروم پر نیٹ پہ میں نے فرح جی کا وہ تازہ سین پڑھا۔ بہت زبردست تھا۔ ایک دن میں پڑھنے میں مگن تھی کہ منیجر کے آنے کا پتا ہی نہ لگا۔ تو انہوں نے دیکھ کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہی ہو تو میں نے کہا ناول تو انہوں نے کہا کون سا، کس رسالے کا۔ تو میرے بتانے پر انہوں نے کہا کہ وہ لوا شعاع کا۔ اسے تو میں بھی بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ ہاہاہا۔ وہ بھی شعاع کے شیدائی نکلے۔

اس کے بعد "ودیعت مژگان" کی طرف بڑھے۔ ثمرہ جی کا نام دیکھا تو دل جھوم اٹھا۔ آپی نے پڑھ کے کہا کہ بس نارمل سی کہانی (آپی تھوڑی نا سمجھ ہے اسی لیے ہاہاہا) لیکن مجھے تو بہت زبردست لگا ناول۔

"اسطور" زبردست ناول۔ آسیہ رئیس خان کا ٹاپ آف دی لسٹ ناول۔ میمونہ صدف کا ناول "عشق عاقبت اندیش تو ناول پر نام "عاقبت نا اندیش تھا۔"

ج: پیاری زحل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا۔ وہ دیکھیں زردے کی اوردو عدد بکرے۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟ کہیں رمشا خوف زدہ ہو کر اپنی دعوت واپس ہی نہ لے لیں۔

زحل: آپ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنے سارے کام کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے اور آپ کی محنت قابل تعریف ہے۔

فیصلہ کہانی قرۃ العین سکندر نے لکھی تھی اور میمونہ صدف کے ناول کا عنوان "عشق عاقبت اندیش" تھا۔

رائمل سعید نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

خط لکھنے کا ارادہ پچھلے ماہ سے تھا مگر خاندان کی شادیوں اور مہمانوں کی آمد نے فرصت ہی نہ دی۔ میں حسنہ حسین کو "عمر یسرا" کے اتنے خوب صورت اختتام پر مبارک باد دیتی ہوں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے ڈائجسٹ کی طرف افسانے سب اچھے تھے "باپ سراں دے تاج" پڑھا اچھا لگا کسی نے باپ کے کردار کی طرف توجہ تو دی، میں نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا "میرے ابو" ملا کہ نہیں۔

آسیہ رئیس کے "اسطور" نے اپنے الفاظ میں ایسا مگن کیا کہ ہمارا دل بھی چاہا کہ ہم بھی پہاڑوں کی وادی میں جائیں اور سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھیں۔ فرح بخاری کا "شام ہجر" بھی اچھا جا رہا ہے۔ نگہت جی کا "جھلملیں آئینے اور سائے" اچھا اختتام تھا۔ اللہ تعالیٰ عثمان جیسی اولاد ہر ماں باپ کو دے۔

ج: پیاری رائمل! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

لائبہ نوید نے اچھرہ لاہور سے لکھا ہے

میں شعاع کو 7th کلاس سے پڑھ رہی ہوں۔ میں نے سارے پرانے شعاع پڑھ لیے ہیں اور اب جو ہر مہینے نئے شعاع کا مجھے بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اس ماہ کی ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں خاص کر "مشک بام" اور "عمر یسرا" تو سو پر ڈوپر ہے۔

ایک ناول بھیجا تھا "انتقام" جو میں نے 9th کلاس میں لکھا تھا اور اب میں فرسٹ ایئر میں آ گئی ہوں۔ میں نے اور بہت سی کہانیاں اور ناول بھی لکھے ہیں جو ابھی میرے پاس ہیں۔

ج: پیاری لائبہ! آپ نے خط لکھا، بہت شکریہ سچ کہتی ہیں ڈاک کا خرچ ہی کیا ہر چیز کی قیمت کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ آمین۔

آپ کی کہانی تلاش کرنا پڑے گی کیونکہ یہ دو سال پرانی بات ہے۔ آئندہ خط میں اپنا نمبر لکھ دیں تو ہم آپ کو خود کال کر لیں گے۔

عدینہ لغاری حمزہ سے لکھتی ہیں

فرح بخاری کا "شام شہر ہجر" بہت ہی زبردست ہے اسے پڑھتے ہوئے مزہ آ رہا ہے۔ کیا بن پاکھی فرح

بخاری کی تھی جو ہم اتنے سال بعد بھی بھول نہیں پائے۔ والعصر پھر غائب، اللہ تعالیٰ امت العزیز شہزاد، کو صحت دے تاکہ ہم پھر سے یہ ناول پڑھ پائیں میں آپ کو بتاؤں مجھے سلسلہ وار ناول ہی اچھے لگتے ہیں۔ ان کو بھری دوپہر اور درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے کا مزہ ہی الگ ہے جب درخت پر کوئل کی کوکو اور دوسرے پرندے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہوتے ہیں۔

ج: پیاری عدینہ! آپ کو سلسلہ وار ناول اچھے لگتے ہیں جبکہ ہماری بہت ساری قارئین کو سلسلہ وار ناول پسند نہیں کیونکہ انہیں ایک ماہ کا انتظار بہت برا لگتا ہے۔

سچ کہا آپ نے کھلے آسمان تلے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں مطالعہ کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ کراچی میں مشینی زندگی نے اس لطف سے محروم کر دیا ہے۔

صدف ناصر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے
پہلی شعاع کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ کیا خوب "بہار" کی خوب صورتی بیان فرمائی اور شعاع کی نئی قیمت سر آنکھوں پر۔

"حمد" اور "نعت" نے دل خوش کیا۔

"پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں" روح سرشار کر گئیں۔ کیونکہ صدقہ، خیرات اور زکواۃ کے معاملات میں کنفیوژن ہی رہتی ہے کہ کسے اور کیسے دیں۔ شکریہ!

"ناتا جوڑا" بیچ بیچ رہا۔ ماشاءاللہ "بندھن" میں "عاصم محمود" سے خوش گوار ملاقات رہی۔

"شادی مبارک" پڑھ کر فاطمہ رابعہ جیسا بننے کی دعا کی۔ اگر ہم سب لوگ اسی اسلامی طریقے اور پردے کا خاص اہتمام کر کے شادیوں کی تقریبات کریں تو دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔ "خط آپ کے" بار بار پڑھنے والا بہترین سلسلہ۔ سبھی تبصرے بہترین۔ میرے لیے آپ کی تعریف اور محبت شان دار۔ رمشا روشن "شادی مبارک" ہمیشہ خوشیاں پائیں۔ (آمین) سونیا ربانی کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ فرحانہ مہناز اپنے "پیا" کی یاد میں کھوئی رہیں۔ (ہاہاہا) تحریروں کی طرف بڑھے تو ثمرہ بخاری کا نام پڑھ کر یقین ہی نہیں آیا۔ بار بار فہرست میں دیکھا کہ ثمرہ ہی ہیں ناں! بلاشبہ وہی بہترین اور مخصوص انداز تحریر۔ بڑے بڑے صحن، برآمدے، گرمیوں، سردیوں کے رنگ۔ رشتوں کے جھرمٹ میں ایک سیدھا سادہ سا کردار "عدی" ثمرہ کے کرداروں کے نام بھی خوب بھاتے ہیں۔ "باسم" کے پاس دنیا جہان کی نعمتیں ہیں مگر "سب میرا ہو" کی ہوس نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ فردوسیہ اور عدی نے سیلف میڈ کی شاندار مثال پیش کی۔

"جھیلیں، آئینے اور سائے" نام کی طرح تحریر بھی زبردست رہی۔ نگہت سیما ہمیشہ ہی زبردست لکھتی ہیں۔ اب کی بار بھی عثمان کا کردار خوب لکھا۔ لندن میں رہ کر بھی اپنی مٹی اور لوگوں کا وفادار رہا۔ اسطورآسیہ رئیس خان کی منفرد اور دلچسپ تحریر، ادب کی دنیا اور ادبی لوگوں کے لیے شاہکار تحریر۔ حقیقتاً یہ ایک فیری ٹیل ہی ہے۔ "عاقبت اندیش" میمونہ صدف کے مخصوص رنگ تحریر میں جھلکے۔ اسوہ آنٹی نے بروقت خاصی سمجھ داری سے کام لیا اور اچھے طریقے سے دونوں کو ایک کر دیا۔

"شہر شام ہجر" 90ء کی اسپیڈ سے بھاگتا دوڑتا ناول "ارحم سراسر ڈپلومیٹ لگا۔ منصب کے سامنے قطعاً دال نہیں گلنے والی موصوف کی۔ ماشاءاللہ سے ناولز کی بہار ختم ہوئی تو افسانوں کو ویلکم کہا۔

بھرم لکھ کر حنا بشریٰ نے ہزاروں خود پسند اور غلط فہمی کا شکار خواتین کو راہ ہدایت دکھائی۔ آپ بے شک خود سے قدم بڑھائیں اور سفید پوش، خود دار تمند اور حق دار لوگوں کے بھرم رکھ لیں۔

"فیصلہ" تحریر فہرست میں قرۃ العین سکندر اور تحریر پر قرۃ العین خرم ہاشمی کا نام کنفیوژ کر گیا۔ بہر حال تحریر قرۃ العین سکندر کی ہی محسوس ہوئی۔ (جی ہاں آپ کا اندازہ درست ہے۔ قرۃ العین سکندر نے ہی لکھا تھا۔)

ناشتا بہر حال اچھی اور مکافات عمل کا رنگ لیے سادہ سی تحریر شمسہ کا صبر رنگ لایا۔ "باپ سراں دے تاج" لکھ کر عندلیب زہرا نے رلا ہی دیا۔ ازل سے ابد تک یہی دکھ یہی تکلیف دہ رویے رہے ہیں پردیس کاٹنے والوں کے ساتھ۔

"آشیانے کا دکھ" فریحہ اشتیاق نے لکھا۔ مگر اختتام ادھورا ادھورا، سا رہا۔ ایسے کیسے نورین کو دوبارہ سے حصہ

دے دیا اور اگر دیا بھی تو نورین بی بی کا انجام تو دکھا ہی دیتے۔ جو کہ افسانے کا لازمی جز ہوتا ہے۔

"کھلتا کسی پہ کیوں" پہلا شعر ناہید اسماعیل کا پڑھ کر ہنسی آ گئی۔ ناہید اب بھلا کدھر ملتے ہیں ایسے لوگ ذرا سی بات پر آنکھیں بھگونے والے کسی کو دکھی جان کر ہمدردی کر لو تو لوگ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔

"شعاع کے ساتھ ساتھ" سونیا لطیف سے مل کر بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ہمارے اپنے شہر سے ہیں۔ بھلا کراچی خواتین آفس جاتے جاتے ہمیں بھی لے جاتیں۔ میرا خواب بھی پورا ہو جاتا۔ (ہاہاہا)

ج: پیاری صدف! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جاندار اور شان دار ہے۔ بہت شکریہ کہ آپ نے اتنی باریک بینی سے پرچا پڑھا اور خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ فریحہ اشتیاق کی کہانی میں ہمیں بھی ادھورے پن کا احساس ہوا تھا لیکن کہانی بہت سے لوگوں کے لیے سبق بھی ہے کہ آج کل کے دور میں کسی پر اعتبار ٹھیک نہیں خواہ وہ بھائی یا بہن ہی ہو۔ بہتر ہے کہ تحریری طور پر ثبوت بھی رکھا جائے۔ اس لیے شامل کیا

ام ہادیہ نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

تھک گئی میں تو دکان کے چکر لگا لگا کر تین دن مسلسل جاتی رہی پر دکان بند چوتھے دن پرچا ملا۔ طبیعت خرابی کی بنا پر دکان بند رہی۔ یہاں صرف ایک ہی دکان سے شعاع اور خواتین ملتا ہے۔ مجھے شعاع کے سارے ہی سلسلے بڑے پسند ہیں جب بھی کوئی بھی ٹینشن ہوتی ہے میں پرانے ہی ڈائجسٹ نکال کر پڑھنے لگتی ہوں کہ اس طرح میرا ذہن بٹ جاتا ہے اور پریشانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے شعاع اور خواتین سے بہت کچھ سیکھا ہے زندگی میں بہت مشکلیں آئیں بہت کچھ سہا بس صبر کیا اور یہ میں نے جنت کمال سے سیکھا ہے۔ اللہ صبر کا پھل ضرور دیتا ہے مجھے گوشی جمال، صدف ناصر کے تبصرے بہت پسند ہیں میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں حا میری چھوٹی بہن اور میں ہم دونوں ہی شیدائی ہیں شعاع خواتین کے، امی بہت غصہ بھی ہوتی ہیں کہ اپنے ساتھ ساتھ تنگی کو بھی لگا لیا ہے پر ہم بھی ڈھیٹ ہیں کوئی اثر نہیں۔

ج: ام ہادیہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ زیادہ خوشی یہ کہ آپ پرچے سے سیکھتی ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ پرچا حاصل کرنے اور خط ہم تک پہنچانے کے لیے آپ کو بہت مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کی تحریروں کو ترجیح دی جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا افسانہ قابل اشاعت نہیں۔ ابھی آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔

رضوانہ وقاص نے کرلاں ہری پور سے شرکت کی ہے

شعاع 5 تاریخ کو ملا اتوار والے دن۔ فرینہ اعجاز آپ ٹھیک نہیں۔ پلیز کسی اور کو بھی جگہ دیں۔ آپ کا سوٹ اور اس کا رنگ مجھے اچھا لگا۔ میرے بھی بہت ہی پیارے بال تھے۔ اب سب بال گر گئے ہیں۔ بہت دل دکھتا ہے اپنے بالوں کے لیے۔ "پہلی شعاع" پڑھی۔ موسم بدل گیا ہے۔ میں اور تو کہیں نہیں جا سکتی زیادہ برآمدے میں بیٹھی رہتی ہوں۔ لیکن امی کے گھر سب ہی پودے کھلنے شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن جو گلاب کا پھول میرا دل خوش کرتا ہے۔ دیکھ کر میں کھل جاتی ہوں۔ اور آڑو کا پودا بہت ہی پیارا سفید سفید، سائمہ ونعت میں مجھے بھی جگہ دیں۔ پلیز "پیارے نبی کی پیاری باتیں" ساری ہی بہت پیاری۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" پیاری بہن آپ کے شوہر نے پڑھائی میں آپ کا ساتھ دیا میرے شوہر بھی بہت اچھے ہیں۔ ہر معاملے میں میرا ساتھ دیتے ہیں۔ "بندھن" میں ملیحہ اور عاصم کو پڑھ کر اچھا لگا۔ شاہین آنٹی آپ نے بار بار عمرانہ کا ذکر کیا یہ نہیں بتایا کیا لگتی ہے۔ اس کی "شادی مبارک" میں مہندی کے ڈیزائن بہت پسند آئے۔ عید پر اللہ نے خیر کی اور زندگی رہی تو یہ والے ڈیزائن بنواؤں گی مہندی کے ساتھ ہاتھوں پر۔

"جھلملیں آئینے اور سائے" کا اتنا جلدی اختتام ہو گیا۔ اس میں عثمان اور اس کے تایا اور تائی کا کردار بہت پسند آیا ہے۔ "شام، شہر، ہجر" فرح بخاری بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ایلیا کی باتیں اور اس کے کام پر ہنسی آئی۔ اللہ کریں منصب کو مل جائے وسیلہ۔ عیسیٰ کا تانیہ کو بتا دینا اچھا لگا۔ خوشی ہوئی دیکھیے کیا جواب دیتی ہے تانیہ۔

"ودیعت مژگان" کوئی اپنے کزن کے ساتھ ایسا

کرتا ہے۔فردیہ نے باسم کو ٹھیک باتیں سنائیں۔عدی اور
فردیہ کی خوب نبھے گی۔
"فیصلہ" بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا کرتا جور نے اچھا
کیا۔"مجرم" عورتیں بغیر جانے ہی خود سے باتیں بنانے
شروع ہو جاتی ہیں۔اللہ اس مہنگائی کو ختم کرے۔اس
طرح ہر سونیا کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ہر چیز کے لیے ترستے۔
"ناشتا" واؤ شمسہ نے شبو کو کیا ناشتہ کروایا۔"آشیانے کا
دکھ" تقی اور شاہ نے کتنی بچت کر کے اپنا گھر بنایا۔ ایسی
بہنوں سے نفرت ہے مجھے۔جو بھائی کی خوشی پر خوش نہ
ہوں۔"باپ سراں دے تاج" باپ واقعی سر کے تاج
ہوتے ہیں۔ہمیں اپنے والد کو بھی ٹائم دینا چاہیے۔ مجھے
بھی اپنے ابو سے بہت پیار ہے، آئی لو یو پیارے ابو بس
اب غصہ زیادہ آنے لگ گیا ہے۔"خط آپ کے" میں
سب دوستوں کے خط پڑھتی ہوں سب سے ملاقات اچھی
لگتی ہے۔فرحانہ مہناز شکریہ آپ کو میرا شعر پسند آیا۔میرا
مسئلہ یہ ہے۔میں ٹھیک ٹھاک چلتی تھی۔اچانک گھٹنے میں
درد اٹھا۔بہت علاج کروایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ڈاکٹر
جس ٹائم بھی جاؤ بس خون کے ٹیسٹ کرتے ہیں۔مجھ کو
آرام کسی سے بھی نہیں ہوا۔اب بس بیٹھ گئی ہوں۔میرا تو
یہ کہنا ہے کہ اب سائنس نے اتنی ترقی کی ہے۔کوئی
علاج تو ہوگا۔تب ہی آپ سب کو بولتی ہوں۔میرا چلنے
میں بہت مسئلہ ہے۔ مجھے جو دیکھتا ہے۔سمجھ ہی نہیں سکتا
مجھے کوئی مسئلہ ہے۔اب میں کسی کے سامنے چلتی ہی نہیں
نا۔مجھے امی سنبھالتی ہیں۔بہت بہت شکریہ۔میری امی
کے لیے دعا کرتی ہے۔سونیا ربانی۔آپ کا خط پڑھ کر
بہت ہی دل دکھا ہے اللہ پاک آپ کو جلد از جلد ٹھیک کر
دیں۔میں خود بیمار ہوں کہ اس لیے سمجھ سکتی ہوں۔آپ
میرے لیے دعا کریں میں آپ کے لیے۔آپ نے بتایا تا
ہے آپ کھلابٹ والے قاضیاں محلہ بالا میں رہتی ہیں۔
اگر گاڑی آپ کے گھر کے پاس آتی ہو میں ضرور آؤں گی
آپ کو ملنے اپنے شوہر کے ساتھ۔آپ نے اپنا ایڈریس
صحیح بتایا تو۔مجھے خوشی ہوگی آپ سے مل کر۔صدف ناصر
آپ کو کیوں کنفیوژن ہوتی ہے۔ایک اپنے نام کے ساتھ
ریحانہ وقاص لکھتی ہیں تو میں رضوانہ وقاص۔مسرت تنویر
شکریہ۔آپ کو میری باتیں اچھی لگیں۔عدینہ بخاری کو
خوش آمدید آپ پڑھی ہوئی نہیں۔لیکن آپ نے بہت
اچھا لکھا۔مسز مجاہد آپ بھی جڑانوالہ میں ہیں اور کوثر خالد
بھی پھر آپ مل لیں ان سے دیر کیوں کر رہی ہیں جی۔
رمشا روشن۔آپ کو میری طرف سے شادی کی بہت بہت
مبارک قبول ہو۔میں آپ سے ناراض ہوں آپ نے
مجھے شادی کی دعوت نہیں دی۔چلیں خوش رہیں، آباد
رہیں۔میری بھی شادی کے بعد جلدی ہی رمضان آ گیا تھا۔
میرے بیٹے کی سالگرہ ہے 4 اپریل کو وش کرنی ہے۔

ج: پیاری رضوانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ سے
نوازے۔آمین گھٹنے کا درد لاعلاج مرض تو نہیں ہے۔پتا
نہیں ڈاکٹرز کیوں نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔خوشی کی بات ہے
کہ آپ کے شوہر آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
انہیں ہمیشہ ایسا ہی رکھے۔آمین
احمد بیٹے کو سالگرہ مبارک ہو، اللہ تعالیٰ اس کو امتحان
میں اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔آمین
عمرانہ، انور مقصود کی بیگم ہیں۔ثمرہ بخاری کے ناول
عدی کے ساتھ کزنز کا سلوک آپ کو برا لگا لیکن عام طور پر
جن بچوں کے والدین نہ ہوں تو ان کے ساتھ گھروں میں
ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

فرحانہ مہناز۔۔۔گوجرہ

مارچ کا شمارہ ہاتھوں میں لیا تو سب سے پہلے خط
آپ کے میں فرسٹ والا خط پڑھنے لگی۔اور خط کے
جواب میں میرا سیروں خون بڑھ گیا۔میرے فروری میں
لکھے گئے خط کو آپ نے یاد رکھا اور اس کا جواب بھی اس
شمارے میں تھا۔اس سے یہی اخذ ہوا کہ آپ اپنی قارئین
کے خط نہ صرف غور سے پڑھتی ہیں بلکہ یاد بھی رکھتی ہیں
۔خط پڑھتے اچانک ہی پچھلا صفحہ پلٹ گیا جہاں لکھا تھا کہ
"بارات گوجرہ پہنچنے والی تھی ہیں۔حیرانی سے شادی
مبارک نکالا ماشاء اللہ زروہ کی شادی ہو گئی۔زروہ کی
شادی میرے گوجرہ شفٹ ہونے سے کچھ دن پہلے تھی۔
اب شادی کا احوال پڑھا یقین جانئے آپی قانتہ رابعہ جی
یوں لگا کہ میں نے بھی اس شادی میں روبرو شرکت کی۔
شادی مبارک بہت خوب لکھا۔احوال پڑھتے زروہ میری

آنکھوں میں سمائی رہتی، ڈیڑھ سال پہلے میں اسلام آباد سے عید کرنے آئی تو اپنی کزن ڈاکٹر فرحت سلطانہ کے ساتھ آپی سے ملنے گئی۔ زردہ اس وقت اپنے بھائی داؤد عبداللہ کے ساتھ اسٹیشنری کا سامان لینے بازار گئی ہوئی تھی، آپی قانتہ نے فون کیا تو جلد ہی واپس آئی ہمراہ ہمارے لیے بیکری کے بہت سی آئٹم اور آتے ہی چائے بنائی اور ڈرائنگ میں آ کر ہمیں پیش کی۔ مجھے تو گڑیا سی لگی۔ لیکن آپی قانتہ نے اللہ کے حکم سے بہت جلد اپنے فریضے ادا کر دیے۔ خوش رہیں۔ باقی شادی کا احوال جیسا لکھا میری کزن ڈاکٹر فرحت نے بخوبی ویسا بتایا۔

آگے بڑھتی ہوں سلسلوں کی طرف بندھن میں عاصم محمود اور ملیحہ کا بندھن خوب رہا۔ پیاری نبی کی باتیں خاص کر عورتوں کے لیے اچھی لگیں ریحانہ وقاص اور مسرت تنویر میں بھی آپ کے لیے دعا گو ہوں عاقبت اندیش اچھی سٹوری تھی۔ اشطور بھاری بھرکم اور ضیغم سے پیراگراف پر کہانی پیاری تھی۔ "شام شہر ہجر" سادی سی اسٹوری ہے ویسے نام مجھے اچھا نہیں لگا۔ معذرت کے ساتھ دوبیت حرگان ثمرہ بخاری کی کوئی بھی کہانی میں ناپسند نہیں کر سکتی یہ پیاری سی اسٹوری بھی خوب رہی۔ مارچ کا شمارہ پانچ ناول اور پانچ افسانوں کی ترتیب کے ساتھ خوب رہا۔ انور مقصود سے ملاقات اچھی لگی۔ شعاع کے ساتھ واہ جی سونیا لطیف آپ کتنی لکی ہیں ہمارے ادارے سے مل کر آئیں آپ۔

ج: پیاری مہناز! آپ نے پرچے پہ تفصیلی تبصرہ کیا اور بہت اچھا تبصرہ کیا۔ ہمیں اندازہ ہے کہ آپ کتنی گہری نظر سے شعاع کا مطالعہ کرتی ہیں ہم یوں ہی تو اپنی قارئین کی تعریف نہیں کرتے۔

قانتہ رابعہ نے شادی کا احوال بلاشبہ بہت اچھا لکھا۔ ہمیں بھی یہی محسوس ہوا کہ ہم بھی شادی میں شریک ہیں۔ انہوں نے بہت اچھے طریقے سلیقے اور محبت سے اپنی بیٹیوں کو رخصت کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے گھروں میں خوش و خرم رکھے۔ آمین

کوشش کریں گے آئندہ ماہ آپ کا افسانہ بھی پرچے میں شامل ہو۔ ان شاء اللہ

فردوس نثار چوہدری نے نیو عیدن اسٹیشن سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میں انٹر کی طالبہ ہوں اور اس وقت کالج کے لان میں بیٹھی خط لکھ رہی ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں چالیس سال یا بیس سال سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ کیونکہ میں نے خود ابھی حال ہی میں سولہ کا ہندسہ عبور کیا ہے۔ تو میں ڈائجسٹ تب سے پڑھ یا دیکھ رہی ہوں جب غالباً "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" یا "کنار خواب جو" کی ابتدائی اقساط شائع ہوتی تھیں۔ ہماری آدھی درجن پر مشتمل فیملی ہے۔ (ہاہاہا) ہم چار بہن بھائی ہیں دو بڑے بھائی (اویس اور حماد) پھر میں اور پھر چھوٹا بھائی (شہزاد) اور ہمارے خاندان میں دور دور تک کوئی ڈائجسٹ نہیں پڑھتا۔ سوائے میرے (نہایت افسوس) ہاں مگر میرے ڈیڈ بتاتے ہیں کہ ان کی کزن (جوانی میں) اسٹور پڑھا کرتی تھیں۔ (اب تو لیکچرار ہیں، فرصت کہاں ہوگی) ڈائجسٹ میں نے 2019ء کے اینڈ میں اور 2020ء کے شروعات میں دیکھا تھا (حقیقت میں تو بچپن سے ہی نکڑ کے سموسے والے کے پاس دیکھا تھا جو سموسے کم بیچتا اور ڈائجسٹ زیادہ پڑھتا) میری دوست سعدیہ لائی تھی اسکول میں اور اکثر پڑھ رہی ہوتی۔ چونکہ میں نمیرا احمد کے ناول میں کارل کی کاپی ہوں۔ (اچھی جنٹ پلس شرارتی بچی)۔ خیر پھر ہم نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے ناولٹ بھی اتنے لمبے لگتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ دس سے چودہ دن میں ایک ڈائجسٹ پڑھتی تھی۔ (اب دو دن میں ایک ڈائجسٹ) اور پھر میری مامی نے 2015ء اور 2016ء کے ڈائجسٹ مجھے پیپرز سے پہلے دے دیے (پڑھائی سے دور کرنے کے لیے) میری تو لاٹری ہی نکل آئی۔ میں نے ان کی نیت کو نہیں دیکھا اور انہیں ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیں (کیونکہ میں پڑھائی اور ناولز پلس گھر کے کاموں میں بیلنس رکھتی ہوں)۔

خیر پھر رات ہوتی ہم ہوتے اور یہ ڈائجسٹ پلس موبائل کی ٹارچ ہوتی، بستر میں گھس کے (سردیوں میں) پڑھتے پھر بریک میں بھی اکثر بائیو کی بک میں رکھ کے

پڑھ لیتے۔ (ارے ہاں فری پریڈ میں بھی) پھر یہ لت میری دوستوں کو بھی لگ گئی۔

بہت سے ناول پڑھے "پیال ساز" بھی اچھا تھا۔ مجھے ڈائجسٹ اور رائٹرز اور ریڈرز سے محبت ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی تنقید کرے اچھا نہیں لگتا (پتا نہیں کیوں)۔

آج کل ایک ناول شروع کیا ہے۔ مما کہتی ہیں ایسے کام تب کرنا جب تائی جان کی عمر جتنی ہوگی، وہ تو دادی بنی ہوئی ہیں (یعنی اب مجھے دادی بننے کا انتظار کرنا ہوگا پھر ہی اسٹوریز لکھوں)

مما شروع میں بڑی مخالف تھیں کیونکہ میرے کام ہی ایسے تھے پھر میں نے ہر کام میں بیلنس لانا شروع کیا اور "جب تجھ سے ناتا" سلسلہ امی جان کو سنانا شروع کیا۔ تو پھر وہ پڑھنے سے نہیں روکتیں۔ بس یہی کہتی ہیں کہ اس کا ٹائم رکھو (دن میں ایک سے دو گھنٹے) اور ایک اسٹوری "جھگی" میں نے مما کو سنائی تاکہ وہ مجھ سے تھوڑا امپریس ہوسکیں کہ ان کی بیٹی اتنی بھی کام چور نہیں۔

اب آخری بات کے بعد چلتے ہیں تبصرے کی جانب بات یہ ہے کہ عمر یسرا کی حسنہ حسین جی یو آر ریئلی سو امیزنگ اینڈ آنسو بونیک۔ اتنا آؤٹ اسٹینڈنگ عمر یسرا لکھا کہ ہم کیا بتائیں، کافی اقساط میں مجھے بہت رونا آیا خاص کر اس سین میں جب فارس اپنے والد کو کہتا ہے میں تصور میں ہر روز اپنے آپ کو مارتا تھا۔ کبھی نہر میں، کبھی ایکسیڈنٹ میں ..... حسنہ حسین جی! آئی لو یو میں حسنہ جی کو کچھ بھیجنا چاہتی تھی کیسے بھجواؤں؟ آپ عذرا فردوس سے لکھوائیں۔

پھر پہلی شعاع پڑھی تو ان کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے قل تعاون کرنے کا سوچا۔ سو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ (ویسے یاد آیا پچھلے مہینوں میں ایک ریڈر نے ڈائجسٹ 250 تک کرنے کا مشورہ دیا تھا ہمیں اس کو تو نہیں سیریس لے لیا)۔ مکمل ناول "جھلملیں آئینے اور سائے" ویسے تو اچھی تھی پر اینڈ میں شادی اور اس کی تقریبات بھی دکھا دیتے تو (مزہ دوبالا ہوجاتا) "شہر شام ہجر" بہت اچھی جارہی ہے ایلیا مجھے کچھ اپنے جیسی لگی رحم دل (میرے جیسے کام ہیں اس کے) (ویلیو مگر کال) اس میں عدی کے علاوہ پورا گھر ہی خود غرض تھا۔ اسٹوری اچھی تھی میں نے اپنی دوست کو بھی سنائی۔ (اسٹور) اسٹوری اچھی تھی۔ مناظر اچھے دکھائے آسیہ رئیس خان نے۔ عشق عاقبت اندیش میں) موحد کا ظرف بہت بڑا تھا۔ اس نے اپنا نہیں اپنی محبت کی خوشیوں کو پہلے سوچا۔ گڈ میمونہ جی۔ افسانے میں (فیصلہ) اور (باپ سراں دے تاج) ٹاپ پر رہے۔ "بھرم۔ ناشتا" اور "آشیانے کا دکھ" تینوں نے اچھا سبق دیا۔ امجد اینڈ فرحت کی غزلیں اچھی لگیں۔ سب کے خط اچھے تھے۔ رمشا جی شادی مبارک ہو آپ نے ہمیں انوائٹ کیا بے حد شکریہ۔ لے آباد غالباً پنجاب میں ہے ناں۔ ہم آپ کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ سیریس تو ہماری بات کو ہماری امی جان بھی نہیں لیتیں۔ فریحہ اشتیاق جی کیا جڑانوالہ اور گجرانوالہ ایک ہی ہے یا الگ الگ۔ سونیا ربانی آپ کی بیماری کا سن کر میں تو بہت دل گرفتہ ہوئی۔ میرا درمیان والا بھائی حماد نادر کے ہیرو کی خوب صورتی کو بھی مات دیتا تھا۔ نظر ہی کھا گئی پورے خاندان کی۔ دو سال ہوگئے اس کا بھی علاج چل رہا ہے۔ مجھے آپ کے گھر والوں کے غم کا اندازہ ہے۔

بائے دا وے واصفہ کیل جی (آئینہ خانے میں) مجھے بہت مزہ آتا ہے پڑھنے میں (ویری کیوٹ ریپلائز) اور پکوان میں پلیز "رشین سیلڈ۔ ملائی الفی" شائع کیجیے گا پلیز۔ اور ہاں میرا ایک پتا نہیں یا مصیبت ہے ہر مرتبہ بیٹھ جاتا ہے یا شاید پھولتا ہے پر ہوتا مرے دماغ ہے اس کا حل بھی کوئی بہن بتائیں۔

ج: پیاری فردوس! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ کی رائٹنگ بہت اچھی اور صاف ستھری ہے اور آپ نے سطر چھوڑ کر صفحے کے ایک جانب لکھا ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں پڑھائی کی مصروفیت کے باوجود آپ مطالعہ کے لیے وقت نکالتی ہیں۔ اور اتنا کچھ پڑھ چکی ہیں۔ یہ قابل تعریف

بقیہ صفحہ 218 پر

محترم بہنو! آداب عرض ہے۔

سب سے پہلے تو یوں زنانہ محفل میں بلا اجازت آنے پر معذرت خواہ ہوں مگر کیا کروں حال دل سنانا بھی ضروری ہے۔ مجھ سے پہلے اماں جان، آپا اور بڑی بھاوج بھی تشریف لا چکی ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس بھی انہوں نے مکمل کر نکالی ہے تو مجھ ناچیز کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ آخر بڑی، چھوٹی، منجھلی تمام بھابیوں نے باقیوں کے ساتھ ساتھ ہم غریب دیوروں کو بھی بھیجرا رگیدا ہے۔ حالانکہ ہم ہی تو انہیں ابا اور بھیا سے چوری چھپکے بک اسٹال سے ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں مگر انہوں نے تو بے مروتی کی حد کر دی۔

ابھی ایک دوست کے ہاں آیا تھا جو خود بھابیوں کا ستایا ہوا ہے اور اب ہم مل کر بھابی بچاؤ مہم شروع کرنے والے ہیں۔ مگر اس سے پہلے آپ کے سوالوں کے جوابات حاضر خدمت ہیں۔

س: آپ کے بھائی کی شادی خانہ آباد کب ہوئی؟

جواب: بھائی کی شادی 24 مارچ بروز اتوار کو ہوئی تھی۔

س: بھائی کی شادی سے پہلے آپ کے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج: بھیا کی شادی سے پہلے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ میں کالج سے آنے کے بعد کرکٹ کھیلتا یا پھر دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل جاتا تھا۔ ہاں البتہ جب اماں اور آپا نے بھیا کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہوتا تھا تو ان کو لے جانے کی ذمہ داری میری ہوتی تھی۔

س: بھیا کی شادی ان کی پسند سے ہوئی تھی یا گھر والوں کی مرضی شامل تھی؟

ج: شش...... یہ تو راز کی بات ہے۔ کسی سے تذکرہ نہ کیجیے گا۔ دراصل اماں بہنوں کے ہمراہ جب بھی بھیا کا کوئی رشتہ دیکھ کر آتیں تو گھر آ کے تفصیل سے لڑکی کا حدود اربعہ بیان کرنا شروع کر دیتیں۔ بھیا لاتعلقی سے سنتے۔ ایک دن ان کی اس عدم دلچسپی کا عقدہ بھی کھل گیا۔ اپنے کمرے میں اداس طبل بنے بیٹھے تھے۔ میں نے ذرا سا کریدا تو فوراً کھل گئے۔

حمیرا شفیع

دراصل اپنے ایک دوست کی مہندی میں اس کی دلہن کی ایک کزن پر دل ہار بیٹھے تھے۔ لڑکی بھی ان کی وجاہت پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ معاملہ دونوں طرف سے سیٹ تھا مگر بھیا گھر میں ذکر کرنے سے خائف تھے کیونکہ وہ گھر کے کماؤ پوت تھے اور اماں ان کی دلہن کے بارے میں بہت حساس تھیں۔ کئی دفعہ انہیں سنا چکی تھیں کہ بہو وہ مکمل اپنی پسند سے لائیں گی۔ اب وہ مجھ سے مدد چاہ رہے تھے کہ میں کسی طرح سے ان کی لو کو ارینج بنانے کی کوئی تدبیر کروں۔

مگر میں بھی کیا کرتا لڑکی کا کوئی بھائی بھی نہیں تھا جس سے دوستی گانٹھ لیتا۔ اس کے ابا جس مسجد جاتے تھے میں بھی وہیں نماز کے لیے جانے لگا۔ بڑے جتنوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ وہ نماز سے فارغ ہوتے تو میں ان کی چپلیں تلاش کر کے دیتا۔ اپنی موٹر بائیک پر گھر چھوڑ کر آتا۔ اچانک ان کی والدہ فوت ہو گئیں تو اماں کو بھی تعزیت کے لیے ہمراہ لے کر گیا۔ اماں تو ہر جگہ بھیا کے لیے لڑکی پسند کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کو بھی ایک لڑکی دل کو بھا گئی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اماں کو منجھلی پسند آئی تھی جبکہ بھیا بڑی پر لٹو تھے۔ پھر بہنوں کو بیچ میں ڈالا تو انہوں نے "مخصوص لڑکی" کی نادیدہ خوبیوں کے اماں کے سامنے قصے بیان کیے کہ اگر لڑکی کی سگی بہنیں بھی سن لیتیں تو

غش کھا جاتیں۔ اس طرح یہ بیل منڈھے چڑھی۔

س: کیا بھیا کی شادی بخیر وخوبی انجام پائی؟ رسموں کے موقع پر کوئی بدمزگی تو نہیں ہوئی؟

ج: بھیا کے سسر تو شریف النفس انسان تھے مگر ساس کچھ فسادی ٹائپ تھیں۔ منگنی پر عجیب شرط رکھ دی کہ لڑکا مونچھیں بڑھائے۔ بھیا تو ہمیشہ سے کلین شیو تھے۔ بہتیرے ٹوٹکے آزمائے مگر مونچھوں کی جگہ پر بال ہی نہ آئے۔ ناچار مصنوعی ہی سجا لیں۔ شادی میں نکاح کے بعد جب دولہا دلہن کو آرسی مصحف کی رسم کے لیے ساتھ ساتھ بٹھا گیا اور ایک بڑا سا شیشہ سامنے رکھ دیا تاکہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ سکیں۔ کسی نابکار نے جارحانہ انداز میں دولہا کا سہرا ہٹایا تو ایک سائیڈ کی مونچھ سہرے کی لڑی میں اٹک کر اتر گئی۔ دلہن نے آدھی مونچھ والا دولہا دیکھ کر ایک فلک شگاف چیخ ماری۔ شکر ہے کہ میں پاس ہی موجود تھا۔ پھرتی سے مونچھ کو لڑی سے اتار کر دوبارہ مخصوص جگہ چپکا دیا۔

دوسرا واقعہ مجھ غریب کے ساتھ پیش آیا۔ بھیا کی مجتہ پرور سالیاں دودھ سے بھرا گلاس لائیں دودھ پلائی کی رسم کے واسطے تو بھیا نے مجھے چکھنے کا کہا۔ جونہی گھونٹ بھرا ایسا خوف ناک اچھو لگا کہ کھانس کھانس کر دہرا ہو گیا۔ کم بختوں نے ہری مرچیں گھوٹ کر ڈال رکھی تھیں۔ برا حشر ہو گیا۔ اسی حالت میں وہ موذی ہنس ہنس کر بے حال رہیں۔

س: شادی کے بعد آپ نے اپنی بھابی کو کیسا پایا؟

ج: جیسا سوچا تھا اس کے بالکل برعکس پایا۔ طوطا چشم جیسی مثال شاید ان کے لیے بنی ہے۔ جب تک میں ان کی اور بھیا کی شادی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا تھا تو اس وقت تک تو بہت میٹھی بنی رہیں۔ پیارے بھائی کہتے منہ سوکھتا تھا۔ بعد میں یوں ہو گئیں جیسے جانتی تک نہ ہوں۔

میرا اور بھیا کا قد کاٹھ تقریباً برابر ہے۔ میں ان کے کپڑے جوتے شیئر کر لیا کرتا تھا تو الماری کو تالا لگا کر رکھنے لگیں۔

تھڑدلی اتنی ہیں کہ انہیں بھیا کا مجھے جیب خرچ دینا بھی کھلتا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے واپس بٹورنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

”جاؤ گڈو! چاچا کے ساتھ جا کر قاشالی آؤ۔“

”بیلو! چاچا کو بولو آئس کریم کھانی ہے۔“

س: بھیا کی شادی کے بعد بھابی نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج: جی ہاں! انہوں نے گھر میں میرے لیے ”ہوٹل کے چھوٹے“ کا مقام سیٹ کیا۔ بچوں کے پیمپر لانے سے ان کے فیڈر کے نپل تبدیل کروانے تک ہر چھوٹا موٹا کام میری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے ایمرجنسی میکے جانا ہو یا کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ پر ڈرائیور کی ذمہ داری میں نے نبھانی ہے۔ اگر خدانخواستہ طبیعت ناساز ہو تو بچوں کو بہلانا، ٹہلانا اور نوڈلز وغیرہ بنا کر کھلانا بھی میری ڈیوٹی ہے۔

س: آج کل کی بھابھیوں کے نام کوئی پیغام؟

ج: دیکھیں جی ہمارے معاشرے میں عورتیں خواہ ساس بہو ہوں، نند بھاوج ہوں یا دیورانی جیٹھانی رو دھو کر، واویلا مچا کر ہمدردیاں بٹور لیتی ہیں مگر مرد بیچارہ تو خاموش رہتا ہے۔ اس لیے بھاوجیں دیور کو بے ضرر جان کر درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتیں۔ اگر وہ ذرا غور کریں تو ان کے بھی چھوٹے بھائی ہوں گے جو کسی کے دیور ہوں گے۔ اگر انہیں گھر آنے پر بات بات میں روٹی نہ ملے یا چاولوں میں بوٹی نہ ملے تو انہیں کتنا دکھ ہو گا۔ پھر وہ شکوہ کرتی نظر آتی ہیں کہ دیور جی پہلے تو یہ شادی کے بعد ماتھے پر آنکھیں ہی رکھ لی ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی بیوی کے آنے پر انہیں وہی سلوک لوٹا رہے ہوتے ہیں جو انہوں نے ان کے ساتھ شادی سے پہلے روا رکھا ہوتا ہے۔ میں بھی جب دل برداشتہ ہوتا ہوں تو اماں جان دلاسا دیتی ہیں کہ تمہاری بیوی آ کر سب حساب برابر کر دے گی۔ مگر میں اسے بھاوج کی عزت کرنا ہی سکھاؤں گا۔ بس آپ بہنیں دعا کریں کہ میرا نصیب جلد کھل جائے (آمین)

والسلام

ایک معصوم دیور

مونا شاہ

بہار کی بارش ماربل کے فرش پر ٹپ ٹپ کرتی پھیکا سا سر بکھیر رہی تھی۔

کھلے برآمدے میں کرسی ڈالے کمال حمید اس بارش کو یاد کر رہے تھے جس سے گاؤں کی کچی مٹی کی خوشبو وابستہ تھی۔

ناہید بیگم پکوڑے تل رہی تھیں اور ان کی بیٹی ماریہ گرم گرم پکوڑے چٹنی کے ساتھ پلیٹ میں نکال کر رکھ گئی تھی۔

کتنے دنوں سے ان کی طبعیت بوجھل تھی، ہر شے سے بے زاریت محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔

"کمالے! جمالے! بس کرو دو نہانا، بارش تیز ہو رہی ہے۔"

اماں نے آواز لگا کر انہیں مزید نہانے سے روکا۔

کمرے کے ساتھ بنے چھپر کے کونے میں مٹی کے چولہے پر رکھی کڑاہی میں مزے دار پکوڑے بن رہے تھے۔

اس کی دونوں بڑی بہنیں یاں کے پاس چولہے کے آگے بیٹھی تھیں ایک چٹنی بنا رہی تھی اور دوسری لکڑیوں اور اپلوں کو آگے پیچھے کرتی آنچ درست کر رہی تھی۔

ابا حمید وہیں پاس ہی چارپائی پر اپنے صافے کا گولا بنا کر سرہانہ بنائے لیٹے تھے۔

وہ دونوں بھائی کچے صحن کی کیچڑ میں پیر چھاپتے چھپر کے نیچے آ گئے تھے۔

بڑی والی جمیلہ نے اٹھ کر ان دونوں کے کپڑے بدلوائے تھے۔ گیلے بالوں میں کنگھا پھیر کر بال بنائے اور وہ دونوں چھوٹی پیڑھیاں کھینچ کر چولہے کے آگے بیٹھ گئے تھے۔

حمیدہ اب آٹے میں گڑ والا پانی گھول کر میٹھے پوڑے بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

" حمیدہ! بے بے کو بھی بھیجنے ہیں پکوڑے۔"

حمید نے اٹھ کر صافہ گود میں رکھا تھا۔

"ہاں ہاں بھجوا دوں گی، ذرا یہ مینہ رک جائے،

تو جمال پکڑا آئے گا۔"

بالٹی میں ہاتھ سے آمیزہ ملاتے ہوئے وہ مصروف لہجے میں بولی تو حمید ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

حمید کی شادی اپنی چچا زاد حمیدہ سے ہوئی تھی چونکہ دونوں کی پیدائش آگے پیچھے کچھ دنوں کے وقفے سے ہوئی تھی، اس لیے حمیدہ کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا۔

حمید ایک معمولی سا کسان تھا جس کے پاس گزر بسر کے لیے تھوڑی سی زمین تھی آج کل کھیتوں میں دھان کی فصل تیار ہو رہی تھی۔

بے بے گاؤں کی بوڑھی تنہا خاتون جن کے شوہر کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا تین بیٹیاں انہوں نے محنت کر کے پالی تھیں اور جوان ہوتے ہی ان کے مناسب بر دیکھ کر بیاہ دیا تھا۔

اب سارا دن محلے کے بچے اور عورتیں ان کے پاس ڈیرا لگائے بیٹھے رہتے تھے، کوئی کھانا دے جاتا اور کوئی گھر کے کام کر دیتا۔

شام کو سارے بچے سپارہ پڑھنے ان کے پاس آجاتے اور رات کو بھی کوئی نہ کوئی سو جاتا۔

بارش تھمی تو حمیدہ خود ہی پلیٹ اٹھائے دوپٹہ اچھے سے اوڑھے کچی گلی عبور کر کے بے بے کے گھر چلی آئی۔

لوہے کا زنگ آلود دروازہ جو گرنے کے قریب تھا کھلا پڑا تھا۔

"السلام علیکم بے بے!"

کیکر کے پیلے پھول جا بجا صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔

چھپر تلے چارپائی بچھائے بے بے اپنا حقہ لیے بیٹھی تھیں۔

"بے بے! کتنی بار کہا ہے چھوڑ دے یہ حقہ اب اتنا زور اور دم نہیں ہے تجھ میں۔"

حمیدہ نے پلیٹ چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس دی تھیں۔

"او میری نوا! (بہو) تیرا ابا یہ حقہ بڑی جی جان سے پیتا تھا اس چلم میں سے مجھے اس کی خوشبو آتی ہے، پینے دے جب تک سانس ہے۔ تب تک پینے دے۔"

ان کی عادت تھی بستی کی ساری بیاہی عورتوں کو اپنی بہو کہتی تھیں۔ ان کے محبت بھرے جواب پر حمیدہ نے سر ہلا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بچے اور عورتیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کوئی آٹے کا گڑ والا حلوہ لا رہا تھا اور کوئی بھنی سوجی کی خوشبو والا میٹھا۔

وہ کافی دیر بیٹھ کر شام ڈھلے گھر آئی تھی۔

جمال اور کمال دونوں اپنے بستے اٹھائے پڑھائی کر رہے تھے۔

جمیلہ چولہے کے آگے بیٹھی شام کی ہانڈی بنا رہی تھی۔

گیلی فضا میں گھروں سے مسالہ بھوننے کی خوشبو آ رہی تھی اور ہر گھر کی دیوار سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

"نبیلہ! مونگ مسور کی دال بنائی ہے، تیرے ابے کو اس تڑکے والی دال کے ساتھ تندور کی روٹیاں بہت پسند ہیں چل چھیتی (جلدی) سے تندور تاپ (جلا) لے۔" گھر میں داخل ہوتے ہی حمیدہ نے نبیلہ کو کام دیا اور خود صحن کے قدرے گیلے فرش پر بکھرے نیم کے پتے ہاتھ سے چننے لگی کیونکہ سوکھنے کے بعد یہ یہیں پر چپک جاتے اور بعد میں برے لگتے۔

صحن کی صفائی کر کے اس نے ایک قطار میں چارپائیاں بچھا کر ان کی پائنتیوں پر نیلے اور سفید لائنوں والے کھیس ڈالے تھے۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

نبیلہ نے جلدی سے تندور میں آگ بھڑکائی تھی اور مٹی کے کونڈے میں گندھا آٹا اٹھا لائی، کچھ دیر بعد ہی فضا میں گندم کی بھینی بھینی مہک رچنے لگی تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد حمید گھر آیا تو سب نے مل کر کھانا کھایا تھا۔

کمال اور جمال بہنوں سے شہزادی اور دیو کی کہانی سن رہے تھے جب کہ دوسری طرف وہ دونوں میاں بیوی بچوں کے مستقبل کے جوڑ توڑ میں

مصروف تھے۔

"اب کی بار چاول کی فصل بہت اچھی ہوگی ان شاءاللہ!"

"کمالے، جمالے کو نیا بستہ نئی وردی اور نیا کورس لے کر دینا ہے۔"

"جمیلہ کے جہیز کے لیے سامان خریدنا شروع کردو۔اس کے سسرال والے تاریخ مانگ رہے ہیں۔"

حمید کی بات پر حمیدہ چونکی تھی۔

"کب مانگ رہے ہیں، تجھے کہاں ملے وہ۔"

"اس کا سسر آج صبح ملا تھا شہر کے راستے میں تو اسی نے ذکر کیا تھا۔شب برات پہ آئیں گے وہ تاریخ لینے۔"

"اے لو ابھی تو بہت کام ہیں، کل ہی جاتی ہوں ببے بے کے پاس' کچھ چیزوں کے لیے صلاح مشورہ کرنا تھا۔"

وہ ایک دم فکر مند ہوئی تھی۔

اس کی بات پر حمید نے سر ہلا دیا تھا۔

آسمان برسنے کے بعد شفاف ہو کر تاروں کو اپنے تھال میں سجائے بیٹھا تھا۔

وہ دونوں تاروں کو تکتے ہوئے اپنی اپنی سوچوں کے تانے بانے میں گم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"بابا! آپ کی چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے، دوبارہ گرم کر لاؤں اور آپ نے پکوڑے بھی نہیں کھائے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔"

ماریہ کی فکر مندی پر کمال نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

کچھ مہینوں بعد وہ رخصت ہونے والی تھی پھر کون ان کی فکر میں گھلتا۔اولاد کی محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے والدین کے لیے اولاد کی ذرا سی توجہ ہی انہیں کھلا دیتی ہے۔

اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ آزردگی سے مسکراتے تھے۔

"نہیں میری بچی! بابا ٹھیک ہیں آپ کے بس دل نہیں چاہ رہا یہ لے جاؤ۔"

اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے کہا۔

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ!"

وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

کمال حمید ہنس پڑے تھے۔

"طبیعت ٹھیک ہے بس طبیعت میں اداسی حلول کر گئی ہے، کچھ ادھورا سا محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی تکمیل باقی ہے کسی چیز کی ....."

"ادھورا پن تو رہے گا بابا! جب تک ہم اپنے والدین کا حق ادا نہیں کریں گے تب تک مکمل نہیں ہو سکتے۔"

ماریہ نے سر ہلا کر کہا تو انہوں نے چونک کر اپنی بیٹی کو بغور دیکھا تھا۔

"لوڈو کھیلیں گے میرے ساتھ؟"

اس نے بات بدل کر انہیں آفر کی تو نا چاہتے ہوئے بھی ان کا سر اثبات میں ہل گیا۔

☆☆☆

"ابا! میں نے لوڈو لینی ہے۔"

اسکول سے آتے ہی بستہ پھینک کر کمال نے باپ سے ٹھنک کر فرمائش کی۔

اور اگلے دن چھوٹی سی لوڈو اس کے بستے میں تھی جسے وہ اترا اترا کر اسکول لے کر گیا تھا۔اور کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا تھا۔

اس نے خود بھی کتنے ہی دن اسے کھیلنے کے لیے باہر نہیں نکالا تھا۔اس مسرت کو یاد کر کے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

بے دلی سے کھیلتے ہوئے وہ جبراً مسکرا رہے تھے۔ایک گیم لگانے کے بعد وہ سونے کا بہانہ کر کے اٹھ کر کمرے میں آ گئے تھے۔

"صاحب زادے آ گئے ہیں۔"

چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی نصف بہتر سے بیٹے کی بابت پوچھا جو سویرے گھر سے نکلا تھا اور اب تک نہ لوٹا تھا۔

"نہیں! پاسپورٹ کے دفتر گیا ہے شام تک

لوٹے گا۔"

ان کی اس اطلاع پر انہوں نے چونک کر دیکھا تھا جو دانستہ نظریں چرائے کتاب میں سر گھسائے بیٹھی تھیں۔

وہ ایک دم ڈھیلے ہو کر ایسے بیٹھے تھے جیسے لمبی مسافت کے بعد انسان تھک ہار کر بیٹھتا ہے۔

"ناہید! تم انس کا رشتہ ہی طے کر دو، کیا پتا وہ اس بہانے رک جائے۔"

ان کے لہجے کی تھکن پر ناہید نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"یہ آخری حربہ بھی آزما چکی ہوں ہمارا بیٹا بہت پریکٹیکل ہے اتنا کہ اس کے اندر جذبات بھی ختم ہو گئے ہیں، اس لیے کسی جذباتی بات پر کان نہیں دھرتا۔"

"پریکٹیکل نہیں بیگم! اسے بے حسی کہتے ہیں وہ بے حسی جو خود غرضی سے منسوب ہے جس میں صرف اپنے بارے میں سوچا جاتا ہے جیسے میں نے سوچا تھا۔"

وہ آخری بات خود کلامی میں بول گئے تھے۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

"او چاچے حمید! جمال نہر میں ڈوب گیا ہے۔"

لکڑی کے ادھ کھلے کواڑ سے باہر کھڑے شخص کی صدا سب کے کلیجے چیر گئی تھی۔

حمیدہ ننگے پیر باہر کو دوڑی تھی۔

حمید کا صافہ گر کر پیروں میں رل گیا تھا۔

گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد جمال کی لاش کو نہر سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

کمال بہت دیر سے سہم کر نہر کنارے درخت کے پاس بیٹھا تھا۔

اسکول سے واپسی پر ہر روز کی طرح وہ سارے دوست اچھلتے کودتے آرہے تھے کہ اچانک جمال اور نصیر کی لڑائی شروع ہو گئی اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے وہ نہر کے کنارے پہنچ گئے اور اگلے ہی پل اسی جھگڑے میں زوردار دھکا لگنے کے باعث جمال لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے بہتی ہوئی نہر میں جا گرا۔

بچوں نے شور مچا دیا، نصیر اپنا بستہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

مگر آٹھ سالہ جمال پانی میں چند ڈبکیاں بھی نہ لگا پایا اور ننھی سی جان پانی کی لہر نگل کر لے گئی۔

پورے گاؤں میں کہرام بپا تھا۔ حمیدہ تو سکتے میں بیٹھی تھی۔ دونوں بہنیں کمال کو بانہوں میں بھینچے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

نماز جنازہ اور تدفین کے بعد حمید وہیں قبر پر بیٹھ گیا تھا قبر سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا، ہر آنکھ نم تھی۔

کئی دنوں تک گاؤں میں کوئی خوشی نہیں کی گئی، سب خاموشی کی بکل مارے روزمرہ کے کام نبٹاتے تھے جمیلہ کی شادی کی تاریخ بھی بڑھا دی گئی تھی۔

حمیدہ تو جب بیٹھی جمال کی ایک ایک چیز تکتی رہتی تھی اور جب کلیجہ کٹنا شروع ہوتا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی تھی۔

اب سب کے دلوں کی ٹھنڈک کمال تھا۔

ساری توجہ کا مرکز وہی تھا، حمید اب خود اسے اسکول لے کر جاتا تھا اور واپس بھی خود لاتا تھا۔ ابا کی سائیکل پر بیٹھ کر وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا تھا۔

دن اسی یاسیت میں لپٹے گزر رہے تھے۔

☆☆☆

وقت نہ کبھی کسی کے لیے رکا ہے اور نہ رکے گا۔

وقت کے اس چکر نے کتنے قیمتی پل نگل لیے تھے، کمال حمید نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

ناہید بیگم نے کتاب کی اوٹ سے ان کا تھکا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور کتاب رکھ کر آنکھوں میں آنے والے پانی کو انگلی کی پوروں سے صاف کرنے لگی تھیں۔

"کمال صاحب! خیریت ہے، آج کل بڑے خاموش ہیں، طبیعت ٹھیک ہے نا۔"

کمال حمید کی چند دن پہلے پر موشن ہوئی تھی اور وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے تھے۔

ان کے قریبی دوست علیم نے ان کی حالت

کے پیش نظر تشویش سے پوچھا جو اپنے دفتر میں یاسیت سے کرسی پر جھول رہے تھے۔

"یار علیم! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، دل نہیں لگتا، کہیں بھی دل نہیں لگتا ــــ دل کرتا ہے میں چھوٹا سا بچہ بن جاؤں اور بس وہیں اپنے بچپن میں کہیں گم ہو جاؤں۔"

ان کے لہجے میں عجیب سی اداسی تھی۔

"بھابھی اور بچوں کو لے کر کہیں گھوم پھر آؤ، بعض اوقات ہمارا مزاج آب و ہوا کی تبدیلی مانگ رہا ہوتا ہے۔"

ان کے مشورے پر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کمال نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"چھوڑو یار! تم سناؤ، تمہارے بیٹے کا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔"

وہ ان سے ان کے بیٹے کے متعلق پوچھنے لگے تھے۔

☆☆☆

شام کو انس گھر آیا تو سب اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

سلام کرتے ہوئے وہ ماریہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ماریہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"پاسپورٹ اور ویزے کا کام مکمل ہو گیا ہے بابا! بس عید کے بعد فلائٹ ہے۔"

اس کی اطلاع پر کمال حمید نے چونک کر اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا تھا جہاں بے فکری کا جہان آباد تھا۔

ماریہ اور ناہید بیگم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرا لی تھیں۔ اس موضوع پر طویل بحث کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔

"آج مجھے لگتا ہے، رمضان کا چاند نظر آ جائے گا۔"

ماریہ نے ماحول کی چبھنے والی خاموشی توڑ کر بات کا رخ بدلا تھا۔

"یقیناً! کچھ تیاریاں تو ہو گئی ہیں مکمل، کچھ چاند دیکھنے کے بعد کر لیں گے۔"

ناہید بیگم نے کہا۔

"امی! سحری میں آپ کے ہاتھ کا قیمہ پراٹھا کھانا ہے مجھے۔"

"میں بنا دوں گی۔" ماریہ نے جھٹ سے کہا تو وہ اسے گھور کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

انس کی فرمائش پر ناہید نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

مغرب کے بعد مسجدوں میں رمضان کا چاند نظر آنے کا اعلان ہو گیا تھا۔ ناہید اور ماریہ نے باورچی خانے کی راہ لی تھی۔ سعدیہ کا بھی رمضان کی مبارک باد کا فون آ گیا تھا۔

سعدیہ ماریہ کی بڑی بہن تھی جو چند سال پہلے دوسرے شہر بیاہی گئی تھی۔ عشا کی نماز کے بعد تراویح کا سلسلہ مسجدوں میں نور بکھیر گیا تھا۔

اب کی بار کمال حمید کے دل نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ نہایت خشوع و خضوع سے انہوں نا صرف نماز اور تراویح ادا کیں بلکہ بعد میں بھی مسجد میں بیٹھے رہے۔ تسبیحات اور امام صاحب سے دینی گفتگو میں انہوں نے سحری تک مسجد میں قیام کیا تھا۔

جب سحری کھانے وہ گھر پہنچے تو ناہید نے جائزہ لیتی نگاہوں سے انہیں سرتاپا دیکھا تھا۔

"کمال صاحب! آپ کمال کر رہے ہیں، مجھے اس کمال سے آگاہ نہیں کریں گے۔"

اپنی نصف بہتر کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرا کر سر ہلاتے بولے۔

"مجھے خود بھی نہیں پتا کیا ہو رہا ہے بس جو دل کر رہا ہے وہی کیے جا رہا ہوں اور ایسا لگ رہا ہے درست سمت میں جا رہا ہوں۔"

ان کی بات پر وہ کندھے اچکا کر سحری بنانے لگ گئی تھیں۔

سحری کے بعد فجر کی نماز ادا کر کے وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد صبح خیزی کے لیے نکل گئے تھے۔

"بابا! میں نے اسکول جانے کے لیے سائیکل لینی ہے۔"

راہ چلتا ایک بچہ ٹھنک کر اپنے باپ سے فرمائش کر رہا تھا۔ کمال حمید کے لب بے ساختہ مسکرا اٹھے تھے۔

"روزے دارو! اللہ نبی کے پیارو! سحری کا

وقت ہو گیا ہے۔"

نصیر چاچا گاؤں کی کچی گلیوں میں صدا لگاتے پھر رہے تھے۔

حمید مصلّٰی بچھائے چھپر کے نیچے تہجد میں مشغول تھے جبکہ حمیدہ مٹی کے کونڈے میں آٹا گوندھنے میں مصروف تھیں۔

آٹا گوندھ کر انہوں نے ٹھنڈے چولہے کی راکھ ایک طرف کر کے اس میں لکڑیاں ڈالی تھیں۔

دونوں بیٹیاں اپنے گھر کی ہو چکی تھیں، بڑھاپا چپکے سے دونوں کے بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی بکھیر گیا تھا۔

"کمال کے ابا!"

"کمال کو اپنی سائیکل دے دیں، یہاں سے پیدل جاتا ہے اور آگے جا کر بسوں میں دھکے کھاتا ہے میرا بچہ، اب تو ویسے بھی رمضان آ گیا ہے، روزے رکھ کر کیسے سفر کرے گا۔"

دعا مانگ کر وہ اٹھے تو حمیدہ کا ملتجی لہجہ سماعت سے ٹکرایا۔

"ہاں! سوچ تو میں بھی رہا تھا کہ کیا کروں، نئی سائیکل کے لیے پیسوں کی گنجائش نہیں نکلتی، چلو اچھا ہوا، تم نے صحیح مشورہ دیا ہے۔ ایسے ہی کر لیتے ہیں۔"

وہ فوراً رضامند ہو گئے تھے۔

"جائیں جا کر کمالے کو اٹھائیں، میں اس کا پراٹھا ڈال دیتی ہوں۔"

دیسی گھی کی گڑوی میں چمچہ رکھتے ہوئے انہوں نے توا گرم کیا۔

سحری کرنے کے بعد حمید نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا تھا اور کپڑا لے کر صاف کرنے کے بعد اسے خوب چمکا ڈالا تھا۔ پرانی سائیکل ایک دم چم چم کرنے لگی تھی۔

صبح کالج جانے کے لیے جب کمال اٹھا تو سامنے صاف ستھری سائیکل دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"تو اس پہ کالج جایا کر، تیرے لیے صاف کی ہے یہ۔"

اس کی حیرت زدہ شکل دیکھ کر وہ مسرت سے بولے۔

"لیکن ابا، تو کیسے شہر آئے جائے گا، تیرا بھی تو آئے روز چکر لگتا رہتا ہے۔"

کمال نے باپ سے پوچھا تو انہوں نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"او میرا پتر! تیرا ہر روز کا آنا جانا ہے، میرا کیا ہے، میں تو کسی بھی وقت کسی آتے جاتے کے ساتھ شہر نکل جاؤں گا، نہیں تو بس میں چلا جاؤں گا، تو نے تو ہر روز سویرے ٹیم (وقت) پہ کالج پہنچنا ہوتا ہے نا!"

ان کی بات پر کمال نے خوشی سے سر ہلا دیا تھا۔

"کل میں رنگ لے کر آؤں گا، رنگ روغن کر کے یہ اور بھی نئی لگے گی۔"

"ٹھیک ہے ابا!"

اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

جلدی سے بیگ اٹھا کر پیچھے رکھ کر وہ سائیکل پر بیٹھا تھا اور مزے سے چلاتا، ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ ہرے بھرے کھیت آج زیادہ ہی خوب صورت لگ رہے تھے۔ گاؤں کے گزرتے لوگوں کو سلام کرتے ہوئے وہ ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔ اور آج وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی کالج پہنچ گیا تھا۔

اپنے دوستوں کی سائیکل کے ساتھ اپنی سائیکل کھڑی کرتے ہوئے اس کی مسرت قابل دید تھی۔ وہ خوشی یاد کر کے کمال حمید کو لگا تھا جیسے اب بھی وہ مسرت تازہ ہے مگر اس مسرت کو دینے والے یہاں موجود نہیں ہیں۔

دل میں اٹھتی ہوک کو دباتے وہ گھر واپس آ گئے تھے۔

عشرہ رحمت تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔

اس بار وہ بھرپور طریقے سے رمضان کا لطف اٹھا رہے تھے۔

گھر والے اس تبدیلی پر خوش گوار حیران تھے۔ تیسرے عشرے کا آغاز ہوا تو انس نے اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔

کینیڈا میں ٹھنڈ زیادہ تھی تو اسی مناسبت سے وہ کپڑے خرید کر لایا تھا۔

"عالیان یار! تیاری کہاں تک پہنچی ہے تمہاری؟"

فون اسپیکر پر رکھے وہ لائے ہوئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔ ادھ کھلے کمرے کے دروازے پر کمال حمید رک گئے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح تھامے وہ انس سے کوئی بات کرنے آئے تھے۔

"تیاری تو پوری ہے بس اڑان بھرنے کے لیے بے تاب ہوں۔"

اس کی پُرجوش آواز پر وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

"صحیح کہہ رہا ہے یار! دل کرتا ہے جلدی سے کینیڈا کی فضاؤں میں سانس لوں، ڈگری لوں، اچھی جاب کروں، یار! میرا تو ارادہ ہے وہیں سیٹ ہو جاؤں۔"

اس کی خود غرض سی سوچ پر کمال کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ اس کی زندگی کی پلاننگ میں وہ لوگ کہیں بھی نہیں تھے۔ تھکے ہوئے آزردہ قدم اٹھاتے وہ واپس اپنے کمرے میں آئے تھے، کتنی محبت اور محنت سے انہوں نے بچوں کو پالا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے انس کو ایک خاص قسم کا پروٹوکول ملا تھا۔

ان کی امیدوں کا واحد مرکز، ان کا سہارا اسی کی ذات تھی جو انہیں اکیلا چھوڑ کر نہ صرف باہر جانے بلکہ وہیں زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کمال نے گریجویشن مکمل ہوتے ہی سرکاری نوکری کے لیے درخواست دی تھی۔

خاصی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کے بعد جب اس کی نوکری لگی تو پورے گاؤں نے خوشیاں منائیں۔ دو دن تک لوگوں کا مبارک باد کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہا تھا۔

"میں تو چاچی نصرت کے پاس جاؤں گی کل، اپنی ثمینہ کا ہاتھ مانگنے، اسی دن کا انتظار تھا بس مجھے۔ میرا پتر اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور میں اپنی بہو لاؤں۔"

حمیدہ بے طرح نہال تھی۔

دونوں بہنیں اپنے بچے لیے میکے آئی ہوئی تھیں۔

اس کی بے تابی پر حمید ہنس پڑا تھا۔

جمیلہ نے لڈو اور رس گلوں کی تھالی میں سے ایک لڈو اٹھا کر ماں کے منہ میں ڈال دیا تھا۔

"لے اماں! تو ایڈوانس میں منہ میٹھا کر لے۔"

کچا آنگن قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

جب کمال باہر یار دوستوں سے مل کر گھر میں داخل ہوا۔

"گزار لے جتنا وقت گزارنا ہے یاروں کے ساتھ، بہت جلد کھونٹے سے بندھنے والا ہے میرا ویرا۔"

جمیلہ سے چھوٹی نبیلہ کپڑے جھٹک کر تار پر لٹکاتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے کیسا کھونٹا۔"

تھکے ہوئے لہجے میں وہ چارپائی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

"تیرے ویاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں چاچی نصرت کی منجھلی لڑکی ثمینہ سے۔"

اس نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔

"کیا مطلب، اماں! میں شادی نہیں کروں گا ثمینہ سے......"

وہ ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس کے اس اچانک ردعمل پر سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"شادی کا رپھڑ (مسئلہ) ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے ادھر۔"

"کیوں ضرورت نہیں ہے، شادی نہیں کرنی

تو نے؟"

حمیدہ اس کے قریب آ کر اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

"کرنی ہے لیکن ادھر نہیں....."

اس کی بات پر گھر کے مکینوں کے لیے شام کا دھندلکا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

"کس سے کرنی ہے پھر؟"

حمیدہ کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ سر جھکا کر نظریں چرا گیا تھا۔

گھر والے دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے جس نے اتنی بڑی جرات کر لی تھی۔ اپنے ماحول کا پتا ہونے کے باوجود بھی کہیں اور بات بنا بیٹھا تھا۔

"بتاتا کیوں نہیں اب..."

کچھ توقف کے بعد حمیدہ کی دکھ بھری آواز سناٹے میں گونجی۔

"وہ مم..... میرے کالج کے ماسٹر ہیں، ان کی بیٹی ہے ناہید! میں ٹیوشن پڑھنے جاتا تھا تو ...."

اٹک اٹک کر بات کرتے ہوئے وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔

اس کی بات سن کر سب کان لپیٹے ادھر ادھر ہو گئے تھے

وہ اکیلا صحن میں کھڑا رہ گیا تھا۔

کچھ دن تو اسی لکن چھپن چھپائی میں گزر گئے تھے۔

وہ سب سے نظریں ملانے اور بات کرنے سے کتراتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد حمیدہ نے اسے ہاں میں جواب دے دیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ گھر کی خوشیاں اس کی مرضی کے خلاف نہیں حاصل کرنی۔

چونکہ زندگی اس نے گزارنی تھی، اس لیے دونوں نے کھلے دل سے فیصلے کا اختیار بھی۔ اسے سونپ کر خوشیاں دے دی تھیں۔

گاؤں والوں نے اعتراض اٹھانا چاہا تھا کہ غیر برادری اور قوم کی لڑکی کو بہو بنا کر وہ خاندان کی رسم کے خلاف جا رہے ہیں مگر انہوں نے سب کو جواب دے کر منہ بند کروا دیا تھا۔

شہر کے گلی محلے کی پلی لڑکی دیہات کی فضا کو کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

حمیدہ نے اپنے تئیں بہو کے ساتھ حسن سلوک میں کسر نہ چھوڑی تھی مگر وہ یہاں کی فضا میں رہنے کو تیار نہ ہوئی تھی۔

شادی کے ٹھیک دو ماہ بعد پیر بھاری ہوتے ہی وہ طبیعت خرابی کا بہانا بنا کر کمال کے ساتھ شہر آ گئی تھی۔

یہیں نوکری تھی، گھر کرائے پر لے کر وہ اپنی زندگی میں مگن ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں وہ ہر دو ہفتے یا مہینے بعد چکر لگا لیتا تھا آہستہ آہستہ یہ فاصلہ بڑھنے لگا تھا۔

سعدیہ اور عاریہ کی پیدائش کے بعد اس نے گھر میں اپنا حصہ مانگ لیا تھا۔

اپنے والدین کی ہر تکلیف، سختی، محبت اور شفقت بھلائے اسے صرف اپنے بیوی بچے اور مستقبل کی پرواہ تھی۔

"اماں ابا! آپ میرے ساتھ رہیں شہر چل کر....."

اس کی بات پر بوڑھی آنکھوں نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

"پتر! تو ہم سے اتنا کچھ چھین چکا ہے، یہ گاؤں اس کے لوگ، یہ گھر ہمارا آخری سہارا ہے، اسے تو نہ چھین....."

"اماں! میں نے کچھ نہیں چھینا! میری نوکری شہر میں ہے، ناہید یہاں نہیں رہ سکتی، آپ لوگ اپنی مرضی سے یہاں رہ رہے ہیں، اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

وہ ناہید کی زبان بول رہا تھا۔

ان دونوں نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے پتر! پھر اس گھر میں تیری دو بہنوں کا حصہ بھی ہے یہ گھر اور میری زمین بیچ کے جو کچھ بھی ملتا ہے اپنی بہنوں کو دے۔''

''ہم تیرے ساتھ تیار ہیں چلنے کو......''

اس کے لب و لہجے کی ڈھٹائی دیکھ کر حمید نے جانے کے لیے ہامی بھری تھی۔

اس بات پر وہ اور بھڑک اٹھا تھا۔

''بہنوں کو حصہ دے کر کیا بچے گا میرے پاس، اس گھر اور وہ چند ایکڑ کی زمین میں رکھا کیا ہے۔''

''اگر کچھ نہیں رکھا تو اسے بیچ کر کیا کرے گا۔''

حمیدہ اس کے یوں اچھلنے پر بولی تھی۔

اس نے ہنکارا بھر کے سر جھٹکا تھا اور باہر چلا گیا۔

کئی ماہ تک اسی بات پر وہ بحث کرتا رہا تھا۔

ناہید نے اکسایا تھا کہ حصہ نہیں چھوڑنا مگر وہ دونوں ڈٹے ہوئے تھے کہ والدین کی وراثت میں بیٹیوں کا حصہ بھی ہوتا ہے، وہ انہیں مل جائے لیکن اس بات کے لیے وہ بالکل راضی نہیں تھا۔

آخر تھک ہار کر کمال حمید نے آنا چھوڑ دیا تھا۔

چند پیسوں کی خاطر اسے اپنے ماں باپ ہی دشمن لگنے لگے تھے جنہیں اس کی فکر نہیں تھی۔

دن مہینوں میں بدلتے بدلتے سالوں میں بدلنے لگے تھے۔

سال میں ایک آدھ بار وہ چکر لگا لیتا تھا۔

زندگی جس رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، اس رفتار میں وہ انہیں کچل کر آگے بڑھ گیا تھا۔

تسبیح میز پر رکھتے ہوئے آزردگی سے آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ جیتے جی انہیں ان کے کیے پر زمین میں گاڑ دیئے تھے۔

تکلیف جب اسی صورت میں واپس آئے جس صورت میں آپ نے کسی کو دی ہو تو اس تکلیف کا درجہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

انہوں نے مستقبل کی خاطر والدین کو چھوڑا تھا۔ اور آج ان کا بیٹا اپنے مستقبل کی خاطر والدین، ملک سب کچھ چھوڑنے کو تیار تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو، طبیعت خراب ہے کیا۔'' ناہید ایک دم گھبرا گئی تھیں۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ پوچھتی رہ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اٹھ کر وہ گھر سے باہر چلے گئے۔

''ماریہ! بابا کہاں ہیں تمہارے؟''

آج انتیسواں روزہ تھا اور ناہید نے بہت سارے کام نبٹانے تھے، اس لیے ذرا جلدی اٹھ گئی تھیں۔

صبح اٹھ کر ناہید نے پورا گھر دیکھ لیا مگر کمال حمید کہیں دکھائی نہیں دیے۔

''ماما! میں کچھ دیر پہلے اٹھی ہوں، میرے سامنے تو کہیں نہیں گئے، مجھے لگا، کمرے میں ہوں گے۔''

''واک کرنے گئے ہوں گے، آپ پریشان مت ہوں۔''

وہ مزید بولی تو ناہید نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''واک کرنے وہ صبح چھ بجے جاتے ہیں، اب تو آٹھ بج رہے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے آج جلدی اسکول چلے گئے ہوں، کوئی کام بھی تو ہو سکتا ہے۔''

ماریہ کے کہنے پر وہ کچھ نہ بولی تھیں۔

لکڑی کا دروازہ جھول کر گرنے کے قریب تھا، گاؤں کے بہت سے گھر پکے مکانات میں تبدیل ہو چکے تھے مگر گلیاں ابھی کچی تھیں۔

بہت احتیاط سے کواڑ کھول کر وہ لٹکتے ہوئے میلے پردے کو ہٹا کر اندر داخل ہوئے تھے۔

آخری بار وہ پانچ ماہ پہلے یہاں آئے تھے۔

کچے صحن میں جا بجا بوڑھے نیم کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔

حمید نلکے کے ٹھنڈے پانی میں رومال بھگو کر حمیدہ کے سر پر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ حمیدہ چھپر تلے

بچھی چارپائی پر نڈھال پڑی تھیں۔

"اماں!"

وہ تیزی سے ان کے قریب آئے تھے۔

بخار میں تپتی وہ اس کی آمد پر مسکرا اٹھی تھیں۔

"میرا پتر"

بوڑھے لرزتے ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

وہ انہیں واپس لٹاتے ہوئے ان پر جھکا تھا۔

"میں نے منع بھی کیا تھا پھر بھی روزہ رکھ لیا، کہتی تھی کہ ہوسکتا ہے آج آخری روزہ ہو جائے اگلے سال رمضان نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔"

حمید نے رومال پانی میں بھگو کر نچوڑتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

کچھ دیر تو وہ خاموشی سے کھڑے ہو کر انہیں دیکھتے رہے پھر اچانک جھک کر ان کے جھریوں زدہ پیروں کو پکڑ لیا تھا۔

"معافی کیسے مانگوں اماں؟" تو نے اپنی زندگی وار دی اور میں نے سوائے دکھ کے تجھے کچھ نہیں دیا۔"

ان کے گرم پیروں پر اپنی پیشانی ٹکائے وہ سسک سسک رو رہے تھے۔

حمیدہ نے اپنے پیروں کو کھینچا تھا، حمید نے ان کے پاس آکر اٹھایا تو وہ ان کے گلے سے جا لگے۔

ان کے گلے سے لگ کر انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے کمزور ہو گئے تھے، بدن پر جدائی اور مشقت کی کھال لٹک رہی تھی۔

وہ کتنی دیر یوں ہی کھڑے رہے تھے۔

کیسا بے لوث رشتہ ہوتا ہے والدین کا کہ ساری زندگی کی غلطیاں ایک معافی پر معاف کر دیتے ہیں۔ سینے سے لگا کر اسے بتا دیتے ہیں کہ اولاد انہیں چھوڑ کر اپنی زندگی جی سکتی۔ ہے مگر وہ صرف انہیں اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ "اماں ابا! آپ کی مرضی ہے، میرے ساتھ چلیں یا یہاں رہیں، میں ہر جگہ آپ کی۔ خدمت کرنے کو تیار ہوں۔"

باپ کے گلے سے لگے وہ انہیں شدت سے اپنی موجودگی کا یقین دلا رہے تھے۔

شام تک حمیدہ کا بخار بہت کم ہو گیا تھا۔

کمال کے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے افطار کے لیے اپنے ہاتھ سے خستہ پکوڑے بنائے تھے۔ وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر افطار کرنے کا مزہ ان کی ساری بے چینی اور بے سکونی لے اڑا تھا۔

اولاد کے ہاتھوں چوٹ کھا کر انہیں والدین کے اکیلے پن کا دکھ یاد آیا تھا۔

"حمید چاچا! عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔"

دروازے کے پار ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

بچپن کا خوب صورت وقت یاد کر کے وہ مسکرائے تھے۔

علی الصبح حمیدہ نے دودھ والی سویاں بنائی تھیں۔

پورے گاؤں میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ سب عید ملنے آ رہے تھے اور کمال کو دیکھ کر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو رہے تھے۔

بیگ سے موبائل نکال کر انہوں نے آن کر کے گھر کا نمبر ملایا تھا اور انہیں اپنی یہاں موجودگی کی اطلاع دے کر فون بند کر دیا تھا۔

دوپہر تک ماریہ، انس اور ناہید وہاں پہنچ چکے تھے۔

وہ انہیں دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ ماریہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے سے لگی تھی جبکہ ناہید حمیدہ کے سینے سے جا لگی تھیں۔ ساری زندگی ان کے لیے دل میں بغض رکھ کر انہیں کیا ملا تھا۔

کل انہوں نے ان کے بیٹے کو ان سے دور کرنے میں کردار ادا کیا تھا، آج ان کا بیٹا انہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا آدھی قصور وار تو وہ خود تھیں۔

کمال کا فون آتے ہی وہ یہاں آنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ انس کے رویے نے انہیں شدت سے اپنی غلطیوں کا احساس دلا دیا تھا۔

- ''روشن چراغوں کا سفر'' قارئین سے خصوصی سروے،
- ''پاؤں میں ہے زنجیر کوئی'' آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول،
- ''اک چاند کی چاہت میں'' نوشین فیاض کا مکمل ناول،
- ''مالا'' نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- ''انگنا پھول کھلیں گے'' راحت جبیں کا ناول،
- ''سانولی سی محبت'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناولٹ،
- نظیر فاطمہ، حمیرا شفیع، ماریہ احمد، سحرش خان اور روحیلہ خان کے افسانے،
- ڈراماٹولوجسٹ حبا سلیم کاشمیری سے ملاقات،
- معروف فنکار ''مصطفیٰ چوہدری'' سے باتیں،
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،
- ہمارے نام، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

معافی تلافی کا سلسلہ تھا تو سب ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دینے لگے۔ ماریہ کو یہاں آکر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ صرف دو بار بابا کے ساتھ حمیدہ کے اصرار پر آئی تھی جب کہ انس تو صرف ایک بار ہی آیا تھا۔ اب بھی ناہید اسے زبردستی گھسیٹ کر لائی تھیں۔

"بابا، امی! آپ دونوں سے بات کرنی ہے۔"

انس نے ان دونوں کو اشارہ کر کے الگ بلایا تھا۔

ماریہ تو دادا دادی کے ساتھ خوب گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔

"بابا! میں اپنا ٹکٹ کینسل کروا رہا ہوں۔"

اس کی بات پر وہ حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے تھے۔

"میرا سب کچھ تو یہاں ہے، میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔"

وہ ان دونوں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہا تھا۔

جب کہ دونوں اس کایا پلٹ پر ششدر رہ گئے تھے۔

"میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا لیکن یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ والدین جیسی نعمت کی بے قدری دنیا میں تو شاید کامیاب کر دے مگر آخرت ناکام رہے گی، آپ نے مجھ پر سب کچھ لٹا دیا گھر، گاڑی، تعلیم کتنا کچھ دیا اور سب سے بڑھ کر دعائیں جب کہ اب ہی تو آپ لوگوں کو لوٹانے کا وقت آیا تھا اور میں مفت میں سب کچھ بٹور کر باہر چلتا بن رہا تھا۔"

وہ بے انتہا پشیمان تھا۔

کمال نے اپنے ہاتھ میں دبے اس کے ہاتھ کو تھپکا تھا۔ مسرت ان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ "مجھے خوشی ہے بیٹا! جس بات کو سمجھنے میں، میں نے زندگی گزار دی وہ بات تم نے زندگی گزارنے سے پہلے سمجھ لی۔"

"بابا!" وہ تشکر سے ان کے ساتھ سینے سے جا لگا تھا۔

"عید مبارک پتر! اک واری فیر۔"

انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

"پتر، اک واری فیر میری وی (ایک باری پھر میری بھی)"

پیچھے سے حمید نے ہانپتی ہوئی آواز میں شرارت سے کہا تو کمال نے آگے بڑھ کر انہیں زور سے جپھی ڈال لی۔

تینوں باپ بیٹوں کو ایک دوسرے سے لپٹا دیکھ کر وہ تینوں خواتین مسکرا اٹھی تھیں۔

ماریہ نے آگے بڑھ کر ناہید کا ہاتھ تھاما تھا اور حمیدہ کے پاس لے جا کر ان۔ لوگوں کی طرح اکٹھے گلے لگ گئی تھیں۔

"عید مبارک!"

ماریہ کی کھلکھلاتی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی سب اور ایک دم بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے ان سب کا مشترکہ قہقہہ میٹھی عید کو اور میٹھا کر گیا تھا۔

ماریہ اور انس نے ایک دوسرے کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ ان دونوں کی منصوبہ بندی سے آج یہ ماحول بن پایا تھا۔ ماریہ کی حساس فطرت نے سارا معاملہ بھانپ کر انس کو اپنے ساتھ ملایا تھا۔

وہ کمال حمید اور ناہید کو اس بات کا احساس دلاتی رہی تھی کہ جس گھر میں والدین کی حق تلفی ہو، وہاں رب کی ناراضی رہتی ہے۔

انس کو سارا معاملہ سمجھا کر اس نے چھوٹا سا ڈرامہ پیش کیا تھا جو کامیاب ٹھہرا تھا۔ لیکن اس بات کو اب وہ دونوں ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھنے والے تھے۔

سب کے ساتھ عید کی خوشیاں مناتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ بلاشبہ یہ ان کی زندگی کی سب سے بہترین عید تھی۔

☆☆

نوشین فیاض

یہ ٹھیک ہے کہ محبت ایک معجزہ ہے لیکن ایسی محبت وہ بھی اس دور میں؟؟؟... ہوتی ہے... آج بھی ہوتی ہے۔ وہاں جہاں گزرے زمانوں کی روایتیں آج بھی زندہ ہیں۔ جہاں کے دن اتنے طویل ہیں کہ سارے کام نمٹا کر بھی اتنا وقت ہوتا ہے کہ گلی محلے کی عورتیں ایک دوسرے کے لیے ساگ میتھی بنانے کی خاطر مل بیٹھتی ہیں۔ جہاں ہر سہ پہر جامن کے پیڑ تلے سپارا پڑھنے کے لیے بچے قطار در قطار بیٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں گھر کے بڑے بزرگوں کی ڈانٹ کو بے عزتی نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں کی لڑکیاں آج بھی سر پہ دوپٹے کو عزت سمجھتی ہیں اور جہاں صبیح حیدر اپنے ملین ڈالر ہارٹ کے ساتھ بستا ہے۔ لیکن اس ملین ڈالر ہارٹ والے کے پاس ملین ڈالر تو کیا ملین پاکستانی نوٹ بھی نہیں۔

اگر اس کے پاس کچھ تھا تو وہ تھی تین بہنوں کی ذمہ داری۔ وہ بھی صرف کھلانے پلانے، پڑھانے یا بیاہنے کی ہی نہیں بلکہ انہیں خوش رکھنے کی بھی۔ تب ہی تو اماں کے ساتھ ساتھ بہنیں بھی سر کے دوپٹے ہاتھوں پر پھیلا پھیلا کر اس کے لیے دعائیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔

وہ بہنوں کا مان تھا تو ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک اور باپ کا بازو۔ ابا کا سبزی کا ٹھیلا اٹھوا کر اس نے گھر کی بیٹھک میں پرچون کی دوکان ڈلوا دی تھی کہ

مکمل ناول

ابا پر کام کا بوجھ بھی نہ ہوا اور دل بھی لگا رہے گھر کے خرچے کا بوجھ کندھوں پر لیے اس نے بی کام کی ڈگری اٹھا کر اماں کے جہیز کے سال خوردہ ٹرنک میں زرتار کپڑوں کے سب سے نیچے رکھ دی تھی۔ اب بھلا کب تک وہ اس ڈگری کو ہاتھوں میں لیے نوکری کے لیے در در بھٹکتا پھرتا۔ اب وہ قسطوں پر لیا ہوا رکشہ چلاتا تھا اور اس رکشے کے ساتھ ان سب کی زندگی کی گاڑی چلتی تھی۔

سانولی رنگت کے ساتھ متناسب قد کاٹھ اور آنکھوں میں حیا والا فصیح دیکھنے میں اتنا خاص کہ اگر دل کی خواہش مچل کر زبان پر آجائے تو ایک بار تو آسمان والا بھی چاند اٹھا کر اس کے کمرے کی کھڑکی پہ رکھ دے۔ جس شخص کے لیے معجزہ ہو جائے وہ عام تو نہیں ہو سکتا ناں؟

☆☆☆

دن کے پہلے پہر بارش ہونے کے بعد دھوپ بھی اچھی تھی۔ جس کی وجہ سے شام میں مال روڈ کی بتیاں معمول سے زیادہ روشن نظر آرہی تھیں۔ ہر منظر نکھرا ہوا شفاف تھا۔ یہ اس کی آج کی آخری سواری تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی اسے بڑی سے بڑی رقم کی پیشکش بھی کرتا تو وہ لالچ میں آئے بغیر گھر جانے کو ترجیح دیتا۔ یہ اس کا اپنا بنایا ہوا اصول تھا۔ وہ اگر تڑکے اٹھ کر رکشہ نکالتا تھا تو شام ڈھلتے ہی گھر لوٹ بھی آتا تھا۔ یہ اس کی قناعت ہی تھی کہ جہاں دوسرے رکشہ ڈرائیور روتے نظر آتے تھے وہیں وہ شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا۔

مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے سواری کو اس کی مطلوبہ منزل پر پہنچا کر وہ اس کے دیے گئے پیسے گنتی کر رہا تھا۔ اچانک کوئی عجلت میں آکر اس کے رکشے میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گردن پیچھے گھما کر دیکھا۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی وہ کوئی خاتون تھی۔ تذبذب کے عالم میں اس نے پیسے جیب میں ڈالے اور اس خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ آخری سواری آخری نہیں ہوئی تھی۔

''چلیں۔'' نسوانی ملائم آواز پر اس نے رکشہ اسٹارٹ کیا۔

وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اب وہ کہیں نہیں جانا چاہتا۔ اسے اب گھر جانا ہے جہاں اس کے گھر والے اس کے منتظر تھے۔ اس کے باوجود اس نے کچھ نہیں کہا۔ ایک تو وہ عورت ذات پھر وہ بھی اکیلی اور رات کا پہلا پہر۔ جانے کس ہنگامی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔

''کہاں جانا ہے؟'' سڑک پر نظر جماتے اس نے پوچھا۔

''آپ میری تھوڑی مدد کر دیں گے؟'' آواز کی لرزش پر اس نے پہلے غور نہیں کیا تھا یا شاید اب مدد کا پوچھتے اس کی آواز کانپی تھی۔

''جی کر سکا تو ضرور۔''

''میں۔۔۔خودکشی کرنا چاہتی ہوں۔ کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں جہاں سکون سے مر سکوں۔''

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ طنزیہ یا مذاق اڑاتی ہوئی نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک سادہ سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کسی بچے کی معصومیت پر بے ساختہ ہنسی آجائے۔

''خودکشی حرام ہے اور سکون تو حرام کے ایک نوالے کے بعد زندگی میں نہیں رہتا اور آپ حرام موت مرنا چاہتی ہیں۔ وہ بھی سکون سے۔''

''زندگی کا لمحہ لمحہ حرام کر کے جینے سے بہتر چند لمحوں میں تمام مشکلیں آسان کر دینے والی موت نہیں؟''

فصیح جان گیا تھا یہ سوال نہیں ہے۔ وہ شاید رونے لگی تھی۔ ہوا بھی اس کی آواز جیسی بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی خواتین سواری کی طرف ایک سے دوسری بار نہیں دیکھا تھا مگر آج کے دن اس نے اپنا دوسرا اصول اس لڑکی کے لیے توڑا تھا۔ اس نے شیشے میں پیچھے دیکھا۔ اس لڑکی نے نقاب کے ساتھ اپنی آنکھیں تک چھپا رکھی تھیں۔ ایک تو ناکافی روشنی اور دوسرا اس کا کسا ہوا نقاب۔ وہ کچھ دیکھ کر اندازہ نہیں

کر پایا۔

"میرا ماننا ہے۔ موت تو حلال بھی زندگی سے بہتر نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن ایک عورت کے لیے موت حلال ہو جاتی ہے جب بات اس کی عزت پر آ جائے۔"

اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی وہ فوراً خاموش ہو گئی تھی۔

رات گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں تک سائلنسر لگے رکشے کے باہر ٹریفک کا شور سنائی دیتا رہا۔ وہ دونوں چپ تھے۔

"آپ میرے گھر چلیں گی؟" اس نے سوچ بچار میں وقت نہیں گنوایا تھا۔ "میرے گھر میں میرے اباِ اماں اور تین بہنیں بھی ہیں۔ آپ کو اور کچھ دے سکیں یا نہ عزت دے سکیں ضرور دیں گے۔" اس نے اپنی بات کی وضاحت دی کہ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ لے۔

"آپ کے گھر والے کیا سوچیں گے؟" کچھ دیر بعد وہ بولی تو صبیح نے رکشے کو گھر کے راستے پر ڈال دیا۔ وہ اس کے ساتھ جانے پر راضی تھی، جاننے کے لیے مزید کسی سوال ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

رکشہ پسماندہ علاقے کی ایک قدرے چوڑی گلی میں داخل ہو کر لکڑی کے سال خوردہ دروازے پر جا رکا۔ اس نے ہارن دیا چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک بارہ، تیرہ سال کی بچی سر پر دوپٹہ لیے کھڑی تھی۔ اس نے صبیح کو سلام کیا۔

"میرے ساتھ مہمان ہیں۔ انہیں اندر چھوڑ کر آؤ اور میری بات سنو۔" سلام کا جواب دے کر صبیح نے اس لڑکی سے کہا اور رکشے کی طرف مڑا۔

"آپ اندر چلی جائیں۔"

تو یہ تھی اس کی منزل؟ سرسری نظر ڈال کر اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ بنا پلستر کے ایک طویل دیوار تھی جس پر کوئی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جانے کب تک یہاں رہنا تھا مگر یہ تھا کہ سر چھپانے کو وقتی طور پر ہی سہی مگر چھت مل گئی تھی۔ زرد پتے کی طرح کانپتی ہوئی وہ اس دہلیز کو پار کر کے اندر داخل ہو گئی۔

صبیح رکشہ اندر کر کے حسب معمول اماں اور ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جب تک سامعہ اسے کمرے میں چھوڑ کر آئی، وہ مختصر انہیں اس کے بارے میں بتا چکا تھا۔

"آج کل کے حالات ٹھیک نہیں۔ کل کو اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو؟" اماں اپنا خدشہ زبان پر لے آئیں۔

"اماں! وہی تو میں کہہ رہا ہوں آج کل کے حالات ٹھیک نہیں ایسے میں ایک لڑکی کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے؟ ویسے بھی آپ ہی تو کہتی ہیں، نیکی ضائع نہیں جاتی۔ جب ہم ایک لڑکی کی عزت کا احساس کر رہے ہیں تو اللہ پاک ہمارے ساتھ کیوں کچھ برا کرے گا؟"

صبیح کی بات پر وہ چپ ہو گئیں۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا۔

"سامعہ! بہن سے کہو۔ جا کر اسے کھانا پانی دے اور اس کے لیے بستر لگا دے۔"

وہ خاموشی سے حکم کی تعمیل کے لیے واپس چلی گئی۔

"میں اس سے بات کر کے اس کے حالات اور گھر بار کا پتا معلوم کر دوں گی اس سے۔ پھر تم اس کے گھر والوں کو ڈھونڈ لانا۔"

"بس کر دے بھلیے لوکے! ابھی کوئی چار دن اسے سکون کرنے دے۔ جانے کن حالات میں گھر سے نکلی ہے۔" ابا نے ٹوکا

صبیح نے نپے تلے انداز میں اس لڑکی کے گھر چھوڑنے کے پیچھے اس کا مقصد بتا دیا تھا کہ وہ گھر سے خودکشی کرنے نکلی تھی اور خودکشی بلاوجہ تو نہیں کی جاتی نا۔ اسی وجہ سے ابا نے اماں کو محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھ کر

شمسہ اور نوریہ اپنی اپنی کتابیں اٹھائے اس کے پاس پڑھنے آبیٹھیں۔

”بھایا! کون ہے یہ؟“ سدا کی متجسس نوریہ نے پوچھا۔

”بتایا تو تھا مہمان ہیں۔ تم لوگ الٹے سیدھے سوال پوچھ کر پریشان مت کرنا۔ ٹھیک ہے؟“ اس نے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔

”شمسہ! پانی کا ایک گلاس لے آؤ اور نوریہ تم یہاں سے پڑھنا شروع کرو۔“

شمسہ اٹھ کر گئی تو نوریہ نے سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بھی اپنا فون نکال کر ایف ایم سننے کے لیے ہینڈز فری لگانے لگا۔

”ویسے بھایا! یہ ہے کتنی پیاری نا؟“ نوریہ نے رک کر پوچھا تو اس نے ابرو سکیڑ کر ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ منہ بنا کر دوبارہ سبق پڑھنے لگی اور تسبیح ایف ایم پر چلنے والے گانے کے بول سن کر پہلے کالج کے سامنے پہنچ گیا جہاں سیاہ جینز پر ڈھیلی ڈھالی شارٹ شرٹ میں کندھوں سے ذرا نیچے آتے بالوں کو جھٹکتے، چہرے پر دنیا جہان کی بیزاری سجائے وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

آنکھیں روح کا آئینہ ہوتی ہیں اور اس وقت اندر کے بھانبڑ کا پتا دے رہے تھے۔

☆☆☆

ساری رات سکڑ سمٹ کر ایک ہی جگہ لیٹے رہنے کی وجہ سے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی اور صبح جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے لحاف سے منہ نکال کر دیکھا۔ بڑا سا کمرہ اس وقت اس کے علاوہ کسی دوسرے ذی روح سے خالی تھا۔ بچھی ہوئی چارپائیاں بھی اٹھائی جا چکی تھیں۔ بستر جست کی ایک بڑی پیٹی پر تہہ در تہہ رکھے ہوئے تھے۔ لحاف اتار کر وہ اٹھ بیٹھی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ سے کچھ آگے تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا آئی کہ وہ یہیں بیٹھی رہے یا اٹھ کر باہر نکل جائے۔ ایک تو اس نے گزری دوپہر کا کھانا کھایا ہوا تھا۔ رات اس کے میزبانوں نے کھانا لا کر سامنے رکھا تو تھا مگر وہ اس قدر خوف زدہ اور پریشان تھی کہ ایک نوالہ بھی نہیں لے سکی اور اس وقت ایسے لگ رہا تھا جیسے بھوک سے اس کی جان نکل جائے گی۔ شمسہ کسی کام سے اندر آئی تو اسے جاگتا پایا۔

اسے غسل خانے کا دروازہ دکھا کر شمسہ اس کے لیے ناشتے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

غسل خانے سے کمرے تک کے راستے میں اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ ایک طویل اور کچا صحن تھا جس میں دھریک اور جامن کے دو پیڑ لگے تھے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے۔ دو تین بڑے بڑے کمرے ایک طرف تھے جن کے آگے بڑا سا برآمدہ تھا۔ دو کمرے ایک طرف تھے جن میں سے ایک میں اس نے رات گزاری تھی۔ اس کے آگے بھی ایک مختصر سا برآمدہ تھا۔

کمرے میں واپس آ کر وہ کھانے کا انتظار کرنے لگی۔

”رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی؟“

اماں کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں کڑھائی والا فریم تھا جس میں سفید رنگ کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ انہیں شمسہ نے ہی اس کے جاگنے کا بتایا تھا۔

”نہیں۔ ٹھیک نیند آئی تھی۔“ سر جھکا کر اس نے آہستگی سے جھوٹ بولا۔

”نہ بیٹی نہ۔ ایسے بے ضرر معاملات میں جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ سچ کہوں تو فکر سے مجھے بھی پوری رات نیند نہیں آئی۔“

سادگی سے کہتے وہ ست رنگی دھاگے سے کپڑے پر چھپے پھول پر ٹانکے بھرنے لگیں اور وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”بیٹا! مجھے نہیں پتا تمہارے ساتھ کیا گزرا اور کیسے۔ بس اتنا بتا دوں ہم غریب لوگ ہیں اور ہمارے پاس بس عزت ہی ہے۔ ہم تمہیں عزت دیں گے تم ہمیں بے عزت نہ کرنا۔ باقی کسی شے کی فکر نہ کرنا۔ میں تمہاری ماں جیسی ہوں۔ کوئی بات ہو، تم مجھ سے کر لینا۔ ٹھیک

ہے؟"

ان کے استفسار پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شمسہ ناشتہ لے آئی تھی۔ پراٹھے اور ساتھ میں رات کا بچا سالن تھا۔ اتنے بھاری ناشتے کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ شدت کی بھوک ہونے کے باوجود اس نے بمشکل ایک پراٹھا ختم کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" نوریہ ابھی کمرے میں آئی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"صبا!" نے آہستہ سے کہہ کر سر جھکا لیا۔

"چلو، اب اٹھ کر کام دیکھو کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟" اماں نے اسے وہیں براجمان دیکھ کر آنکھ سے اشارہ بھی کیا۔

"جا رہی ہوں۔ کام ہی کر رہی تھی۔ بکرم لینے آئی تھی اندر۔" منہ بنا کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"تم بھی اٹھ کر باہر چلو، دل بہل جائے گا۔"

فریم اٹھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو اس نے چارپائی کے نیچے پڑا اپنا بیگ پیر کے ساتھ مزید نیچے کیا اور بڑی سی چادر لپیٹتے ہوئے ان کے پیچھے باہر نکل گئی۔

کچے فرش والے برآمدے میں پر دوہری تہری کر کے ایک خستہ حال دری بچھا کر سامنے سلائی مشین رکھ کر نوریہ مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور پھر سر جھٹک کر دوبارہ مشین پر جھک گئی۔

اچھے لباس کے شوق نے اسے ایک بہترین درزن بنا دیا تھا۔ شمسہ صحن کے ایک کونے میں چھپر کے نیچے برتن دھو رہی تھی۔ سامعہ جامن کے درخت کے نیچے جھاڑو لگا رہی تھی۔ صبا اماں کے ساتھ ہی لکڑی کے موٹے پایوں والی بان کی متروک چارپائی کے کنارے پر ٹک گئی۔

"شمسہ تیرے ابا ساگ لے آئے کہ نہیں؟"

"ابا گئے ہوئے ہیں۔" جواب نوریہ نے دیا تھا۔

"فصیح کو ساگ بہت پسند ہے، اس لیے سوچا جاتے موسم میں ایک بار پکا دوں۔ اگلے سال یا قسمت یا نصیب۔ کیا پتا میں رہوں نہ رہوں۔"

"اللہ پاک لمبی عمر کرے۔" پتا نہیں کیسے اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔ اماں نرمی سے مسکرائیں۔

"تمہاری ماں کیسے ساگ پکاتی ہے؟"

اماں کی بات پر اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ "مجھے نہیں پتا۔" بڑی دقت سے اس نے یہ سہ لفظی جملہ ادا کیا تھا۔

"اچھا تم آج میرے ہاتھ کا ساگ کھا کر بتانا، تمہیں کیسا لگا ویسے ماں کے ہاتھ کی تو سواہ بھی اولاد کے لیے من و سلویٰ ہوتی ہے۔" وہ پھر مسکرائیں۔

تھوڑی دیر میں ابا ساگ لے آئے تو اماں کے ساتھ مل کر وہ ساری بہنیں ساگ بنانے لگیں۔ اسے حیرت ہو رہی تھی، چھوٹی سی سامعہ بھی بڑی مہارت سے کچے ڈنٹھل پکڑ کر ہرے پتے ایک ترتیب سے لگاتی اماں کے ہاتھ میں دیتی جا رہی تھی اور اماں برق رفتاری سے ان کی مٹھیاں بھرنے سے پہلے درانتی سے ساگ کاٹ کاٹ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھیں۔

شمسہ نے جب تک ساگ دھویا، اماں مٹی کی ہانڈی چولہے پر چڑھا چکی تھیں اور اس کے ساتھ ہی مکئی کا آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اس کے لیے یہ ساری تیاری بڑی دلچسپ تھی۔ اس سے پہلے اس نے ساگ گوشت کا پکا ہوا باؤل ہی ڈائننگ ٹیبل پر دیکھا تھا۔

"تم مکئی کی روٹی کھا لو گی یا تمہارے لیے گندم کے آٹے کی روٹی بنائیں؟"

"جو تم لوگ کھاؤ گے، وہی کھا لوں گی۔"

"میرا مطلب تم شوق سے جو کھانی ہو بتا دو۔ اگر چاول کھانے ہیں تو وہ بھی بن جائیں گے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"نہیں۔ مکئی کی روٹی ٹھیک ہے۔"

کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا ورنہ مکئی کی روٹی کا تو اسے ذائقہ بھی معلوم نہیں تھا۔ ذائقہ تو اسے ساگ کا بھی پتا نہیں تھا۔ گھر میں کک کے ہاتھوں سے تو جبھی سے بننے والا بے ذائقہ کھانا زندگی میں خوراک کی ضرورت تو پوری کرتا تھا مگر اس میں شوق والی کوئی بات نہیں تھی۔

اس رات لہسن اور زیرے کے بگھار والے ساگ پر پگھلتا ہوا مکھن اور مکئی کی روٹی کی خوشبو نے اسے ایک نئے ذائقے سے متعارف کروایا تھا۔ اسے خود علم نہیں ہوا کہ وہ کتنی روٹی کھا چکی ہے۔

''کیسا لگا ساگ؟''

اماں کے پوچھنے پر وہ زبان سے تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکی البتہ اس کی بھیگی آنکھوں نے بھرپور اس کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

☆☆☆

گرمیوں کی اس تپتی دوپہر وہ تسلی سے لاؤنج میں سنگل صوفے پر گود میں فیشن میگزین لیے بیٹھی تھی۔ فری گھر میں نہیں تھی اور کسی بھی وقت اس کی واپسی ہو سکتی تھی، اسی لیے وہ کمرے میں نہیں بیٹھی تھی۔

یہاں سے کم از کم اس کے آنے کا علم تو ہو سکتا تھا اور وہ اس کے اندر آنے تک آرام سے میگزین چھپا سکتی تھی۔ پیاس محسوس ہونے پر اس نے میگزین ہاتھ میں فولڈ کیا اور فریج سے جوس نکال کر واپس اسی جگہ آ بیٹھی۔ ابھی اس نے جوس کا پہلا گھونٹ ہی بھرا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا میگزین کھینچ لیا۔ جوس کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر قالین بھگو گیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ بنا سر اٹھائے بھی جانتی تھی کہ اس کی شامت آ چکی تھی۔ اس کے جوس لانے تک وہ باہر سے اندر آ چکی تھی۔

''واؤ...... فیشن میگزین؟ تو اب مس نزی فیشن میگزین سے دیکھ دیکھ کر فیشن کریں گی اور مجھے پیچھے چھوڑ دیں گی۔'' وہ اب اس کے سامنے کھڑی تھی اور نزہت مجرم بن کر اپنی جگہ جم گئی تھی۔

''نہیں پلیز، یہ ظلم مت کرنا۔ میرے چاہنے والے مر جائیں گے۔ میرے فینز مجھ سے بچھڑ جائیں گے تو میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔ میں مر جاؤں گی نزی! ایسا مت کرنا پلیز۔''

اداکاری کے میدان میں کتنا نام کما سکتی تھی فری؟ اپنی بے عزتی سے نظر چرا کر نزہت نے سوچا۔

''مجھے حیرت ہوتی ہے تمہارا دماغ کہاں ہے؟ میں چلتا پھرتا فیشن آئیکون تمہارے سامنے ہوں اور تم ان میگزینز سے سیکھو گی۔ ویسے بھی یہ گاڈ گفٹڈ شے ہے۔ تمہارے بس کی بات نہیں۔ کوئی ڈھنگ کی کتاب کھولو اور رٹے مارنے شروع کرو۔''

نزہت کے سر پر میگزین مارتے ہوئے وہ حقارت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ نزہت کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی بھر گیا تھا۔

''اوہ ڈیڈی۔ ہاؤ آر یو۔'' اندر سے آتے ڈیڈی نے اسے نزہت کے سر پہ میگزین مارتے ہوئے دیکھا تھا۔

''آئم فائن۔ ہاؤ آر یو؟ اور خیریت آج بہن کی پٹائی کیوں ہو رہی ہے؟''

اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ دو ماہ بعد پیپر ہیں اور یہ میڈم فیشن میگزین کھولے بیٹھی ہیں۔ پتا ہے یونیورسٹی میں کتنی انسلٹ فیل کرتی ہوں اس کے حوالے سے۔

وہ بڑے آرام سے ڈیڈی کے پہلو سے لگی کہہ رہی تھی۔ اب یہ تو وہ دونوں ہی جانتی تھیں کہ کون کس کے حوالے سے کیا محسوس کرتا ہے۔

''نزی! کیا ہو گیا ہے اتنی غیر ذمہ دار کیوں ہو رہی ہو؟ پہلے ہی اتنی مشکل سے پاس ہوتی ہو اور اب یہ سب کرو گی تو اسی کلاس میں رہ جاؤ گی۔ پڑھائی پر توجہ دیا کرو اور اگر مدد چاہیے تو فری سے کہو۔ تمہاری بہن ہے، اسی سے کچھ سیکھ لو۔''

ہزار بار کا دہرایا لیکچر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ نزہت کے آنسو بہنے لگے تھے حالانکہ وہ ان کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

"ایک تو بندہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ رونے بیٹھ جاتی ہے اور اسے دیکھ کر مما کا کا بی پی ہائی ہونے لگ جاتا ہے۔ ہمارا نہیں تو کچھ مما کا خیال کرلو۔ اب اٹھو یہاں سے اور کمرے میں جا کر کوئی کتاب لے کر بیٹھو۔"

وہ کمرے کی طرف مرے مرے قدموں سے جا رہی تھی تب اس نے اپنے پیچھے آواز سنی۔

"اتنی گرمی ہو رہی ہے ڈیڈی! آئسکریم کھلانے لے چلیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں، لنچ بھی باہر کرتے ہیں۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔"

ڈیڈی کا کمزور سا انکار فری کی ضد کے آگے دم توڑ چکا تھا، ہمیشہ کی طرح۔

"اب آرام سے بیٹھ کر پیپرز کی تیاری کرو اور فرصت کرنا، میں تمہارے لیے بھی لے کر آؤں گی آئس کریم۔ تمہیں پتا تو ہے تمہارے بغیر میرے حلق سے کچھ اترتا ہی کہاں ہے۔" اس کی تھوڑی چھو کر اپنا نکھرا روپ مزید نکھار کر وہ بجلی کی رفتار سے باہر نکل گئی۔

نزہت نے شکر ادا کیا تھا کہ کم از کم اب وہ سکون سے رو تو سکے گی۔

اسے قسمت سے بہت گلے تھے۔ بہت سارے گلے۔ اس نے کیوں اسے اس گھر میں بھیجا جہاں فریحہ نام کی بلا اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو کھا جاتی تھی۔ اسے کیوں ایسے ڈیڈی ملے۔ جنہوں نے ہمیشہ فری کی باتوں کا اعتبار کیا اور اس سے کچھ پوچھنا گوارا نہیں کیا۔ کیوں اسے ایسی مما ملیں جنہوں نے سب جانتے بوجھتے بھی نہ فری کو کبھی ڈانٹا اور نہ ڈیڈی کو کبھی فری کا اصلی چہرہ دکھایا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا فری کو زہر دے کر مار دے مگر پتا نہیں کیوں اسے یقین نہیں تھا کہ فری مر بھی سکتی ہے۔ وہ اگر پھر زندہ ہو کر اس سے پوچھتی کہ مجھے کیوں زہر دیا تھا؟

وہ جھرجھری لے کر رہ جاتی۔ اب تو اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ خودکشی کر لے۔ فری سے نفرت اتنی شدید ہوتی جا رہی تھی کہ وہ واقعی کوئی حل سوچنے لگی تھی۔

☆☆☆

جاتی سردیوں کی دھوپ پکی اینٹوں سے بنی سال خوردہ دیوار پر دھری تھی۔ سہ پہر کا رنگ نیالا سنہری ہو رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں گلاب کی باڑ پر لگے ڈھیر سارے پھول آنگن مہکا رہے تھے۔ جامن کے درخت تلے بچے بلند آواز سے کلام الٰہی پڑھ رہے تھے۔

صبا کیاری کے پاس پیڑھے پر بیٹھی دلچسپی سے ان سب کو اپنے اپنے کام نمٹاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور اماں ایک ایک کر کے بچوں کا سبق سن کر چھٹی دیتے ہوئے گاہے گاہے اس پر نظر ڈال کر اس کی معصومیت کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کے چمکتے رنگ روپ کو دیکھ کر اندازہ تو ہوتا تھا کہ وہ کسی اور جہاں سے آئی ہے مگر پچھلے چار دنوں میں ہی اماں سمیت ان بہنوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جیسے آسمان سے سیدھا ان کے گھر اتاری گئی ہے۔ اسے دوپٹہ تک اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس جو اس کے کپڑے تھے۔ انہوں نے نوریہ کو تو پاگل کر دیا تھا۔ اس کے دھلے کپڑے الگنی سے اتار کر وہ کتنی دیر ان پر ہاتھ پھیر پھیر کر نرمی کو محسوس کرتی رہی۔ صبا کا ہر ہر انداز چیخ چیخ کر بتاتا تھا کہ اس کی دنیا الگ ہے۔ اس کے طور طریقے بہت الگ تھے۔ اٹھنے بیٹھنے سے لے کر بات کرنے یہاں تک کہ خاموش رہنے میں بھی ایک سلیقہ تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" کچی دال کا پانی نچوڑ کر پودوں میں ڈالتے اماں نے رک کر بے ساختہ اس سے پوچھا تھا۔

اس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے جیسے ماضی کا کوئی ورق الٹنے کو ہو۔

"اوں ہوں۔ بس یہ بتا رات کو نیند ٹھیک سے آتی ہے؟"

وہ کیا کہتی، اس کی سرخ آنکھیں سارا قصہ کہہ رہی تھیں۔ اسے بڑے سے کمرے میں اپنے جہازی سائز کے بیڈ پر جیسی نیند آتی تھی ویسی نیند اس کمرے

میں جہاں اس کے علاوہ تین اور لڑکیاں سوتی تھیں اور جہاں اس کے بیڈ جیسا بیڈ نہیں بلکہ بان کی چارپائی تھی، کیسے آسکتی تھی۔

"پریشان ہو تو کہہ ڈالو پتر! سارے بوجھ اکیلے ڈھونے والے نہیں ہوتے اور پھر دھیاں تو بڑی نازک ہوتی ہیں۔ میں تو اپنی بچیوں کو بھاری شے نہیں اٹھانے دیتی تو بھاری مسئلے کیسے اٹھانے دوں اور پھر تم بھی تو میری دھی ہو۔"

وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کچھ اور سمجھیں یا سوچیں، اس لیے گزرے چار دنوں میں اپنائی گئی مصلحت کو خیر باد کہہ کر اس نے اپنی مشکل بتا دی۔

"مجھے چارپائی پر سونے کی عادت نہیں اور پھر... مجھے اکیلے کمرے میں سونے کی عادت ہے۔ آہستہ آہستہ بن جائے گی عادت۔ آپ فکر مت کریں۔"

اور پھر انہوں نے فکر ایسے ختم کی کہ اس رات فصیح کا بستر اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں لگوا دیا۔ گھر کا اکلوتا بیڈ اسی کے کمرے میں تھا۔ اب وہ بیڈ تو وہاں سے اٹھنے سے رہا پھر صبا کو کو اکیلے کمرے کی عادت تھی۔ وہ پرانے زمانے کی بے ریا عورت آج کے دور میں بھی مہمانوں کو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے سمجھتی تھیں۔ صبا کے لیے ان کے دل میں جتنے خدشے تھے، وہ گزرے چار دنوں میں ہوا ہو گئے تھے۔ اتنی موہنی صورت اور ایسا معصوم انداز کہ کچھ برا سوچنا بھی گناہ لگتا تھا۔

صبا اپنے آپ میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے محسن کو کمرہ بدر ہونا پڑا۔

اس رات کمرے میں لکڑی کی پرانے زمانے کی کھڑکی میں لگے سریوں سے اس نے سامنے کے برآمدے میں لگی چارپائی دیکھی۔ اس پر دراز شخص کا چہرہ یادداشت میں جانے کہیں تھا بھی کہ نہیں۔ جس دن سے وہ یہاں آئی تھی وہ اس کے اٹھنے سے پہلے جا چکا ہوتا اور اس کے آنے کے وقت وہ کمرے میں ہوتی۔ وہ اگر باہر ہوتی بھی تو وہ سلامتی بھیج کر خاموشی سے رخ بدل کر اماں اور ابا کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔ دونوں برآمدوں میں فاصلہ اتنا تھا کہ وہ اس کے نقش تک ذہن میں دوبارہ ابھارنے پر ناکام تھی۔ بہ زبان خاموشی اسے ایک بار پھر شکریہ کہہ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ فصیح شام کو وقت پر ہی آ جاتا تھا اور رات کا کھانا شام سات، ساڑھے سات تک کھا لیا جاتا تھا اس لیے شمسہ تن وہی سے کھانا بنانے کی تیاری میں جتی ہوئی تھی۔ آج لوکی گوشت پکنا تھا اور چونکہ بڑے گوشت کو گلنے میں وقت لگتا ہے تو ہانڈی جلدی چڑھائی تھی تاکہ وقت پر سالن تیار ہو سکے۔ بھنتے مسالے کی خوشبو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

'نوری! پانی چھڑک کر جھاڑو لگا دے سیپارے والے بچے آتے ہی ہوں گے۔" اماں نے تسبیح کے دانے پھیرتے نوریہ کو آواز لگائی۔

"السلام علیکم خالہ جی۔" لکڑی کے کھلے دروازے سے ایک بائیس تئیس سالہ لڑکی اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم سلام پتر۔ بڑے دن بعد آئی ہو۔ ماں کدھر رہتی ہے تیری۔" تسبیح تکیے پر رکھ کر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے سر پر پیار دیا۔

"بس خالہ جی! ہونا کہاں ہے۔ گھر کے کام اور پھر میری شادی کی تیاری۔" آخر میں اس کا لہجہ شرمیلا ہو گیا تھا۔

"اللہ خیر کا وقت لائے۔ کام کروانا ہے؟"

"جی میں نے پپو کو بھیجا تھا صبح۔ کہہ رہا تھا شمسہ باجی کہہ رہی ہیں، دوپہر کے بعد آنا۔"

اس کی بات پر اماں نے سر ہلا دیا۔ شمسہ بھی اس کی طرف دیکھتے تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ آئی اور آنے والی لڑکی کو لے کر اسٹور نما اس کمرے میں گھس گئی جس میں آج تک صبا نے قدم تک نہیں رکھا تھا۔

''کیا کام کروانا ہے اس نے؟'' اس نے سامعہ سے پوچھا۔
''فیشل کروانا ہوگا یا بلیچ۔ یا مجھے پتا نہیں۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا تو وہ مسکرا اٹھی۔
''یعنی پارلر کا کام۔ شمسہ نے سیکھا ہوا ہے؟''
''تو اور کیا۔ اتنا اچھا کام کرتی ہیں باجی۔ شیخوں کے پورے محلے کی عورتیں یہاں آتی ہیں۔ ابھی روزوں میں اتنا کام ہوتا ہے کہ شمسہ باجی اس موٹو پروین کو بلا لاتی ہیں مدد کے لیے۔ آپ بھی کروا کر دیکھنا۔''
سامعہ کی بات پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔
''ویسے آپ تو پہلے ہی اتنی پیاری ہو۔ جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگا ٹی وی کے ڈراموں کی کوئی لڑکی ہمارے گھر آ گئی ہے۔''
اس کی معصوم سی تعریف پر وہ خجل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سیپارہ پڑھنے والے تین چار بچے آ چکے تھے اور اپنی مقررہ جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جانے کیوں اس کا دل چاہا وہ بھی اس کلام سے آشنائی حاصل کرے جس کا تلفظ بھی اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ سچ تو یہ کہ اگر وہ یہاں نہ آتی تو شاید زندگی کے میلوں، جھمیلوں میں اسے اس بات کا خیال بھی نہ آتا۔ کچھ یوں بھی مشکل حالات میں، پریشانی میں وہی تو یاد آتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اماں وضو کر کے آئیں تو وہ ان کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔
''مجھے بھی قرآن پڑھا دیں۔''
انکار والی بات ہی نہیں تھی سو اماں نے خوشی خوشی ایک اور شاگرد کو پڑھنے کے لیے بٹھا لیا تھا۔

☆☆☆

چھوٹے چھوٹے گملوں اور پلاسٹک کے ڈبوں میں لگی گل دوپہری پر جا بجا پتے سبز رنگ میں ڈھل رہے تھے۔ موسم کی جاں فزا حرارت ہلکی سی ٹھنڈک میں بدل رہی تھی۔ نیالی شام دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔ مرغیاں اپنے ڈربے کے باہر دانہ چگ رہی تھیں۔ نوریہ کمرہ بند کر کے کپڑوں کی کٹائی میں مصروف تھی۔
''کسی کے سامنے کپڑے کٹائی کروں تو غلط کٹائی ہو جاتی ہے۔'' یہ بھی نوریہ کی اپنی سائنس تھی جو کم از کم صبا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سو وہ بھی باہر برآمدے میں لکڑی کی چارپائی پر بیٹھی تھی جہاں سامعہ اپنا بستہ کھولے اسکول کا کام لے کر بیٹھی تھی۔ پورے گھر میں بھنتی ہوئی سوجی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شمسہ چولہے پر رکھی کڑاہی میں تیز تیز چمچ چلا رہی تھی اور اماں پاس ہی رنگ اڑے رنگین پیڑھے پر بیٹھی بادام اور کھوپرا کاٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

سرسبز مخملی گھاس کے فرش پر وہ سامنے کتابیں رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو چمک رہے تھے۔ چہرہ روشن اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سامنے بیٹھے شخص کے عقب سے نمودار ہوتے فری کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ ایک دم سے خوف میں تبدیل ہوئی تھی۔ چہرے کی روشنی اندھیرے میں بدل گئی تھی۔ جیتی جاگتی جذبوں سے بھرپور لڑکی سنگی مجسمہ ہو گئی تھی۔ یہ اس نے سوچا بھی کیسے کہ اس کے ساتھ کچھ اچھا ہو سکتا ہے۔
فری اب اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھی۔
''السلام علیکم۔''
اس میں کوئی شک تھا ہی نہیں کہ یہ سلامتی اس خوب رو پر بھیجی گئی تھی جو نزہت کے مقابل بیٹھا تھا۔
''تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔''
نزہت تو بے جان شے کی طرح وہاں پڑی تھی۔ وہ کیسے ہاں ہوں کہہ سکتی تھی۔
''یہ میری چھوٹی بہن ہے اور آپ؟''
اسفند کو دلچسپی سے دیکھتا پا کر اس نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ فریحہ عباس کسی کے سامنے بیٹھی ہو اور وہ کسی اور جانب نظر پھیر لے۔ نزہت سامنے ہوتے ہوئے

بھی پس منظر میں چلی گئی تھی۔

"میں اسفند ہوں اور آپ کی طرح نہ تو مشہور ہوں اور نہ ہی کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا ہے سو میرا تعارف تو نام کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو گویا نزہت کا دل جل گیا۔

"میری تعریف کر رہے ہیں یا مجھ سے فلرٹ کی کوشش؟" فری مسکرائی۔

"ایک وقت میں دونوں نہیں کر سکتا کیا؟"

اس کی بات پر فری نے گردن پیچھے گرا کر قہقہہ لگایا اور پھر ہنستی چلی گئی۔

نزہت نے ان دونوں کو دیکھا اور غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہو کر وہاں سے دور ہوئی اور پھر اٹھ کر تقریباً بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ یہ اس کا وہم تھا کہ اس کے اٹھنے پر سبھی نے غور نہیں کیا۔ فری نے اسے تاریک ہوتے چہرے کے ساتھ وہاں سے دور ہوتے دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر اسفند سے باتوں میں مشغول ہو گئی۔

اپنے کمرے کے اندھیرے میں بستر پر سکڑ کر لیٹی روتی نزہت اندازہ کر سکتی تھی کہ وہاں سے اٹھنے سے پہلے ان کی بے تکلفی کہاں تک پہنچ چکی ہو گی۔ نمبرز کے تبادلے ہو چکے ہوں گے اور اب لمبی کالیں ہوں گی اور....

اور اس سے آگے سوچا جا ہی نہیں رہا تھا۔ بس ان دونوں کے مسکراتے چہرے نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ فری کی آنکھوں میں اس کے لیے تمسخر تھا، جیت کی سرشاری تھی۔ زندگی میں اب کیا رہ گیا تھا؟ نزہت عباس کو اب خودکشی کر لینی چاہیے تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بستر سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

گھر میں ماہ رمضان کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ڈھیر ساری املی اور آلو بخارے کی چٹنی بن کر شیشے کی چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں بھر کر فریج میں محفوظ ہو گئی تھی۔ بادام کا شربت، صندل کا شربت اور الائچی کا شربت تو گھر میں بنا تھا البتہ ان کے علاوہ سرخ مشروب کی بڑی سی بوتل بھی آ چکی تھی۔ شامی ٹکیاں بھی بن کر فریزر میں جا پہنچی تھیں۔ شمسہ اور اماں نے مل کر بیسن سے دہی بھلوں کے لیے پکوڑیاں بھی تل لی تھیں۔

صبا تو جانتی ہی نہیں تھی کہ رمضان کے لیے تیاری بھی ہوتی ہے۔ اپنے گھر میں اس نے ایسا کوئی تردد دیکھا جو نہیں تھا۔ اپنے گھر میں تو اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے دل میں ایک خیال آیا اور پھر وہ حال میں گم ہو گئی جہاں رمضان کا چاند نظر آنے کے بعد شمسہ مٹی کی کٹوری میں کھٹا لگانے کے لیے دودھ لیے بیٹھی تھی۔

اماں سحری کے لیے تازہ سالن بنانے کی تیاری کر رہی تھیں اور نوریہ اپنے کپڑوں کا ڈھیر لیے بیٹھی تھی۔ عام سے کپڑوں پر اپنی کمال کی ڈیزائننگ کر کے اس نے سامعہ اور شمسہ کے کپڑے تو تیار کر لیے تھے مگر اپنے کپڑوں کے لیے اسے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آ رہا تھا۔ اب رمضان شروع ہو گیا تھا اور اس کے کپڑے ابھی پڑے تھے۔ اماں کا سادہ سوٹ تو دو گھنٹے کی مار تھا۔ اصل فکر تو اسے اپنی تھی۔

ابا اور صبیح تراویح پڑھنے کے لیے مسجد گئے ہوئے تھے۔ سارے کام نمٹانے کے بعد جب اماں کے ساتھ شمسہ اور سامعہ بھی عشاء اور تراویح پڑھنے کھڑی ہوئیں تو اماں نے اسے بھی آواز دے لی۔

"بوہے آئی جنج، ویہنو کڑی دے کن۔ مہینہ پہلے کے کپڑے لا کر دیے ہوئے ہیں اگر ابھی نہیں سلے تو آج رات میں بھی نہیں سلنے والے۔ پھیلاوا سمیٹ اور آ کر نماز پڑھ۔"

الجھے ذہن کے ساتھ نوریہ نے سلیقے سے تہہ کر کر کے سارے کپڑے شاپروں میں ڈالے اور نماز کے لیے آ گئی۔ صبا بھی ان کے ساتھ ہی جائے نماز پر جا کھڑی ہوئی۔ اسے اتنے لمبے قیام کی عادت نہیں تھی سو نماز کے بعد بمشکل چند رکعتیں تراویح پڑھنے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی۔

موسم نے تیور ایسے بدلے تھے کہ اب پنکھے کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چھت والا پنکھا چلا کر اس نے دوپٹہ کھول کر بیڈ پر ایک طرف ڈالا اور بالوں سے کیچر نکال کر بے دم ہو کر بستر پر گر گئی۔ اسے ابھی تک ٹھیک سے دوپٹہ اوڑھنا نہیں آیا تھا۔ ویسے تو ابا بھی کم کم ہی لڑکیوں کے کمرے کی طرف آتے تھے۔ جب ضرورت ہوتی تو ''فصیح کی اماں سامعہ کو بھیجو ذرا۔'' کہہ کر لڑکیوں میں سے جس کی بھی ضرورت ہوتی بلوا لیتے اور حسب معمول جملے میں اسی نام کا نام شامل کر لیتے۔

رہا فصیح تو اس نے تو جیسے قسم کھائی ہوئی تھی نہ چہرہ دیکھنا ہے نہ دکھانا ہے۔ اس لیے اتنے بڑے دوپٹے کی یوں تو کوئی ضرورت نہیں تھی مگر چونکہ ان ساری بہنوں اور خود اماں کا دوپٹہ بھی سلیقے سے سر پر جما رہتا تھا تو اسے خود ہی حیا آتی تھی۔

ایک بات جو اس نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ ساری بہنیں فصیح پر جان چھڑکتی تھیں۔ وہ رات کو کمرے میں آ جاتی تو اکثر کوئی نہ کوئی برآمدے میں اس کے بستر پر کتابیں لیے بیٹھی ہوتی۔ شبہ بارہویں میں اور نوریہ گیارہویں میں تھی۔ اس نے فصیح کی تعلیم کا پوچھا۔

''ہمارے بھایا نے بی کام کیا ہوا ہے۔''

سامعہ نے چہک کر بتایا تھا اور وہ حیران ہو گئی۔

''تو پھر رکشہ کیوں چلاتے ہیں؟ کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟''

''نوکری آسانی سے ملتی کہاں ہے۔ پھر ابا کی صحت بھی کوئی اتنی اچھی نہیں رہی تھی۔ سبزی کی ریڑھی ڈھونا اور پھر مرغ کی اذان کے ساتھ بستر چھوڑ کر سبزی منڈی جانا، سبزی لانا۔ کچھ بھی تو آسان نہیں تھا۔ پھر بھایا نے رکشہ ڈال لیا اور ابا کو یہ ننھی منی دوکان ڈال دی۔''

شب برات کی رات اس نے فصیح کی اچھی نوکری کی بھی دعا کی تھی۔

نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کے ساتھ حلق میں پیاس کا احساس جاگا تو وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سونے سے پہلے وہ کمرے میں پانی کا جگ ضرور رکھتی تھی۔ پانی کے لیے آدھی رات اٹھ کر باہر برآمدے تک جانا اسے مناسب نہیں لگتا تھا۔ پلاسٹک کے جگ سے اسٹیل کے گلاس میں پانی ڈال کر اس نے منہ سے لگا لیا اور ایک سانس میں ہی گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھا۔ وہ بیڈ تک جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ نظر باہر سے آتے فصیح پر پڑ گئی۔

وہ مسجد سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے سب کو نماز پڑھتے دیکھ کر سوچا وہ بھی وہیں ان کے ساتھ ہو گی جیسے پچھلے کئی دنوں سے تھی، اسی لیے بے دھڑک اپنے کپڑے لینے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اسے ایک نظر دیکھا تو گھبرا کر چہرہ موڑ لیا۔

''معاف کیجیے گا میں سمجھا.....''

یہ ادھوری بات پوری نہیں ہوئی۔ نظر پلٹنے تک ذہن نے اس پری پیکر سے شناسائی ڈھونڈ لی تھی۔ فصیح حیدر کی خاطر گھڑی پر وقت ٹھہر گیا تھا۔ بہتی ساعتیں منجمد ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک ایک نقش بصارتوں سے چرا کر دل میں چھپا لیا تھا۔ روپہلا روپ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ سنہری آنکھیں جیسے ستاروں سے چمک مستعار لے کر بنائی گئی ہوں۔ ان آنکھوں میں تحیر تھا۔ گلابی ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے، بند ہوئے اور پھر سیاہ پلکوں نے ستاروں کی چمک کو ڈھانپ لیا۔

''کچھ چاہیے؟''

''سب کچھ۔''

''کیا مطلب؟'' لرزاں پلکیں لمحے بھر کے لیے اٹھیں لیکن اس کی آنکھوں میں مچلتے شوق کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً جھک گئیں۔

''کچھ نہیں۔'' مسکراتے لمحوں کی شرارت پر وہ بھی مسکرایا اور نفی میں سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔

یہ وہی چہرہ تو تھا جس کے لیے وہ آج بھی پہلے کالج کے باہر چکر کاٹتا تھا۔ وہ جانتا تھا لاک ڈاؤن کی وجہ سے سارے تعلیمی ادارے بند ہیں مگر پھر بھی کہیں

دل کے کسی کونے میں خیال بستا کہ شاید وہ وہاں سے گزر رہی ہو یا کسی بہانے سے دکھائی دے جائے۔

پہلی بار بھی اس نے اسے دانستہ نہیں دیکھا تھا۔ اماں نے اسے ہمیشہ یہی سمجھایا تھا کہ دوسری لڑکیوں پر نظر اٹھنے لگے تو سوچ لینا اپنی بہنوں پر کسی کی نظر برداشت ہو جائے گی۔ اس بات نے اس کی نظر اور خیالات کو باندھ رکھا تھا مگر اس روز پتا نہیں کیسے نظر اٹھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر میں، اپنے کمرے میں مل جائے گی۔ اس رات اسے ساری رات جاگنا تھا۔ ہاں مگر وہ بے خبر تھا کہ اندر بیڈ پر کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کرنے والی کا قرار بھی وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اسے حیرت تھی کہ اتنے دن اس شے انجان رہنے والا اپنے گھر میں اجنبیوں کی طرح داخل ہونے والا اس سے سامنا ہونے پر کیسے بے اختیاری سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اندھیرے میں کئی جگنو ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوں۔ اس سانولے چہرے پر خوشیوں کی وہ تحریر تھی جو اس نے پڑھ تو لی مگر مطلب سے آشنا نہیں ہو سکی تھی۔

☆☆☆

ساری رات اگرچہ ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی مگر سحری کے وقت کسی کے جگانے سے پہلے ہی وہ اٹھ گئی تھی۔ اماں سحری کے لیے روٹیاں بنا رہی تھیں اور شمسہ دیسی گھی لگا لگا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ رہی تھی۔ سامعہ ابا کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی اور نوریہ لسی بناتے ہوئے فصیح کے پاس بیٹھی تھی۔ جھجکتے ہوئی وہ بھی ان کے پاس آ بیٹھی۔ فصیح نے ایک بار نظر اٹھا کر ہلکی سی مسکراہٹ اس کی نذر کی تھی۔ اس نے گھبرا کر رخ موڑ لیا۔

"بھابیا! میری لسی ابھی نکال دیں۔ آپ مکھن نکال دیتے ہیں اور مجھ سے لسی پی نہیں جاتی۔" سامعہ اسٹیل کا بڑا سا گلاس لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"پہلے دو جگہ کسی بنتی ہے اب تین جگہ بنا کرے گی۔ چپ کر کے اپنے ابا کے پاس جا کر بیٹھ۔ جو بھی بنے گی پی لینا۔" اماں نے روٹی توے پر ڈالتے جواب دیا تھا۔ سامعہ منہ بنا کر گلاس وہیں رکھ کر اٹھ گئی تو نظر بچا کر فصیح نے لسی کا گلاس بھر کر ایک طرف رکھ دیا۔

روٹیاں بن چکنے کے بعد وہیں چٹائی بچھا کر شمسہ نے سب کے لیے سحری لگانی شروع کی۔ صبا کے آگے بھی اس نے سالن اور دہی کی کٹوری کے ساتھ لسی کا بڑا سا گلاس اور چنگیر میں گھی سے چپڑی روٹی رکھی تو وہ بے چارگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ بات اگر ایک وقت کھانے کی ہوتی تو وہ چپ چاپ دو چار لقمے کھا کر اٹھ جاتی مگر اس کھانے کے آسرے پر اس نے سارا دن گزارنا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ روزے رکھ رہی تھی تو روزہ اس کے لیے ویسے بھی مشکل شے تھا۔ اسے مزید مشکل بنانے کا ارادہ ترک کر کے وہ آہستگی سے شمسہ کی جانب جھکی۔

"میں... یہ... گھی والی روٹی نہیں کھاتی۔"

"تو ہو تو پہلے بتانا تھا۔ اچھا چلو، میں بناتی ہوں تمہارا پراٹھا۔"

"نہیں۔ سادہ روٹی بنادو پلیز۔"

"اچھا میں بناتی ہوں۔"

سب نے کھانا شروع کر دیا تھا بس ایک وہی تھی جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ لسی کا گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگایا اور پھر اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔

میٹھی لسی اس نے کبھی پی ہی نہیں تھی۔ پسند نہ ہونا الگ بات تھی، اسے یہ سخت ناپسند تھی۔ کلی کر کے شرمندہ شرمندہ سی وہ واپس آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟" اماں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر طبیعت نہیں ٹھیک تو روزہ مت

رکھو۔ یونہی سارا دن پریشانی ہوگی۔"

"نہیں وہ.. میں میٹھی لسی نہیں پیتی اور مجھے نہیں پتا تھا لسی میٹھی ہے۔" شرمندگی سے وہ زمین میں گڑنے والی ہوگئی تھی۔ جب کہ صبیح کے چہرے پر ایک مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔ اسے بھی میٹھی لسی پسند نہیں تھی اس لیے جب وہ لسی بناتا تو ایک جگ سب کے لیے میٹھی بناتا اور دوسرا جگ اپنے لیے نمکین۔ محبوب کی کوئی عادت مشترک نکل آئے تو اس کی خوشی کیا ہوتی ہے، یہ اس وقت کوئی صبیح کے چہرے سے جان سکتا تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ توریہ! بہن کو اور لسی بنا دو۔"

اس سے پہلے کہ اماں کے کہنے پر توریہ اپنی جگہ سے اٹھتی، صبیح اٹھ گیا۔

"یہ لے لیں، میں نے کر لی سحری۔" سلور کا بڑا سا مگ توریہ کے سامنے رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تو جانے کیوں صبا کو ایسا لگا کہ اس نے جان بوجھ کر لسی اس کے لیے چھوڑی ہے۔ پچھلی رات جب وہ اچانک کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور اب اس کا ایسے اٹھ جانا، اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خوشی کا ذائقہ چکھا تھا۔ ذات کا ثبات پایا تھا اور دل چاہتا تھا وہ یہیں ساری عمر گزار دے۔ یہاں سے جانے کا دھڑکا تو دل کو لگا ہی ہوا تھا لیکن اس روز اور آنے والے کتنے روزے اس نے افطاری کے وقت سچے دل سے یہیں رہ جانے کی دعا کی تھی۔

☆☆☆

بارہویں روزے کی افطاری محلے کے کسی گھر میں تھی۔ اماں نے سب کے ساتھ اسے بھی چلنے کا کہا تھا لیکن اس کے دل میں خوف تھا، دیکھ لیے جانے کا، پہچان لیے جانے کا۔ اس نے قطعیت سے انکار کر دیا تھا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ کر آئیں افطاری۔ تھوڑی سی دیر کی تو بات ہے۔"

اتنے دنوں سے کسی نے اس پر کوئی زور نہیں دیا تھا، کسی بات پر اصرار نہیں کیا تھا۔ یہاں اس کی ایک نہیں چلی تھی۔

"شمسہ بہن کو اپنی نئی چادر نکال دے۔" کہہ کر اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"سب جانتے ہیں تم ہمارے گھر مہمان آئی ہو۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ شک پیدا ہوتا ہے اور جو بات نہیں ہونے والی وہ بھی ہوتی ہے۔"

اماں کی بات پر اس نے آنسوؤں کو دھکیلتے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

عصر ادا کر کے وہ فوراً ہی افطاری والے گھر پہنچ گئے تھے۔ گھر اگرچہ پکا تھا لیکن بنا پلستر کی دیواریں اور سیمنٹ کے فرش کے ساتھ ساتھ گھر کے ساز و سامان سے گھر والوں کی مالی حالت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ تو جا کر ایک کونے میں ہی بیٹھ گئی تھی جبکہ شمسہ اور توریہ کے ساتھ سامعہ بھی بڑھ بڑھ کر کام کروا رہی تھی۔ بیٹھک میں آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ بنانے کے لیے صوفے کرسیاں وغیرہ نکلوا کر صحن میں ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ چھتے ہوئے صحن میں ایک جانب دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر ترتیب کے ساتھ مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے اسٹیل کے برتن رکھے جا رہے تھے۔ محلے کے باقی گھروں سے برف لائی جا رہی تھی۔ باورچی خانے سے کھانے کی ملی جلی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کی دبی دبی ہنسی اور کڑکڑاتے گھی کی آوازیں بھی۔

اس کے لیے یہ سب بالکل نیا اور خوبصورت تھا۔ زمانے کو برا بھلا بولنے والوں نے ایسی کسی گلی میں چکر نہیں لگایا ہوگا جہاں آج بھی دکھ درد اور خوشیاں سانجھی ہیں۔

لکڑی کے پایوں والی بان کی چارپائی پر اماں اور ان ہی کی عمر کی دو تین خواتین براجمان تھیں۔ وہ دری پر ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لڑکی اس کے پاس بڑی سی چنگیر اٹھائے آ گئی۔ اس

میں ہرا دھنیا اور ہری مرچیں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ دھنیا میرے ساتھ بنوا دو، وہی بھلوں کے لیے چٹنی کوٹنی ہے اور سب ہی بھولے بیٹھے ہیں۔"

بے تکلفی سے کہتے وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئی تو خاموشی سے اس نے اس کی دیکھا دیکھی نرم ٹہنیوں کے ساتھ لگی پتیوں کو توڑ توڑ کر الگ کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ اس کی رفتار بہت سست تھی لیکن وہ کر رہی تھی۔

"توبہ اتنی گرمی میں نقاب چڑھا کر بیٹھی ہو۔ اس طرف کوئی نہیں آنے والا۔ تم اتار دو اسے۔"

دوپٹے کے پلو سے گردن پر آیا پسینہ صاف کرتے اسے اچانک ہی صبا کے نقاب کا خیال آیا تھا۔ دروازے کی طرف سے رخ موڑ کر اس نے نقاب نیچے کیا۔ اس لڑکی کے چلتے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس کی بے حد سفید رنگت والے چہرے پر گرمی کی شدت سے سرخ نشان بن رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" رعب حسن سے مجبور وہ اس کا طرز تخاطب از خود بدل گیا تھا۔

"میں... مہمان ہوں۔" بدقت جواب دیتی صبا نے اس کا ٹھٹک کر رکنا اور غیر محسوس انداز میں چنگیر کو اپنی طرف کھینچنا بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

"آپ ادھر کمرے میں چلیں۔ یہاں پنکھے کی ہوا اتنی نہیں لگ رہی۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

اسے کمرے میں پہنچا کر وہ سیدھا باورچی خانے میں سموسے تلتی شمسہ کے سر جا پہنچی۔

"یہ جو گوری سی سبز آنکھوں والی لڑکی ہے، یہ تمہاری مہمان ہے ناں؟"

شمسہ نے فخر سے سر اثبات میں ہلایا۔

"بہت پیاری ہے یہ تو۔ میں تو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ اتنی پاگل ہوں میں نے تو اسے دھنیا بنانے بٹھا دیا تھا۔" وہ تو ایسی ہے جیسے.. جیسے...

اسے تشبیہ کے لیے کچھ مل نہیں رہا تھا۔

"پری جیسی لگتی ہے بچی اور ہے بھی اتنی ہی اچھی۔ میرا بڑا دل ہے اس کی اور بھایا کی شادی ہو جائے۔" شوکیس میں سے نکالے برتن کھنگالتی سامعہ نے شمسہ کے سر پر گویا بم پھوڑا تھا۔ شمسہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ فوراً سر جھکائے اپنے کام میں لگ گئی۔

"یہ رہتی کہاں ہے اور تمہاری کیا لگتی ہے؟"

وہ کتنے بھی سوالوں کے جواب دے لیتی، یہ سوال یہاں ختم ہونے والے نہیں تھے۔ بلکہ ہر سوال کے جواب سے کتنے ہی سوال جنم لیتے تھے۔

اس کے حسن کے قصے سن کر کم و بیش درجن لڑکیوں نے باری باری اس کمرے کا رخ کیا تھا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ نے یونہی سرسری بات کرنے کی کوشش کی اور کچھ محض دیکھ کر واپس آ گئیں۔ اس شام محلے بھر کی لڑکیوں میں اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے۔

"کتنا میٹھا بولتی ہے۔"

"اس کے تو ہاتھ بھی ایسے ہیں جیسے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"اس کی آنکھوں کا رنگ اصلی ہے یا لینس لگائے ہیں۔"

ان کی باتوں میں پرجوش تجسس تھا۔ یہ سادہ دل لڑکیاں اس سے حسد یا جلن نہیں محسوس کر رہی تھیں بلکہ وہ تو شمسہ اور نوریہ کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں کہ ان کی اماں کے کسی بھائی کی بیٹی اتنی خوبصورت، اتنی اچھی ہے۔

اس رات جب فصیح عشاء کے بعد کھانے کے لیے کچھ لینے آیا تو شمسہ سحری کے لیے سبزی بنا رہی تھی۔ فصیح اور ابا کی عادت تھی، عشاء کے بعد روٹی ضرور کھاتے تھے۔ شمسہ نے سارے کام چھوڑ کر اس کے لیے روٹی بنائی اور اتنی دیر وہ نوریہ اور سامعہ کو کام کروانے بیٹھ گیا۔ سامعہ حسب عادت ادھر ادھر کی باتیں کرتی جا رہی تھی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ کیسے

سب ایک بار تو صبا کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔
"میں نے تو کہا، میرا بہت دل ہے، اس کی میرے بھایا کے ساتھ شادی ہو جائے۔"
نوریہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایسی باتوں پر بھایا فوراً ٹوک دیتے تھے کہ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے نہ ہی ایسی کسی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن آج تو بھایا مسکرا رہے تھے۔ اس نے چپکے سے آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا تھا۔
"وہ اتنی اچھی لگتی ہے؟"
"ہاں ناں۔ وہ سچ میں اتنی پیاری ہیں بھایا۔ آپ بھی کبھی غور سے دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔ ذرا سے والی لڑکیاں تو اتنا بھر بھر کر میک اپ لگاتی ہیں لیکن وہ تو سادہ ہی اتنی پیاری ہیں۔ ہم انہیں اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں ناں بھابی بنا کر۔"
اس کی زبان ذرا ہی شہ پا کر قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔
"اور میں کیسا لگتا ہوں؟"
اس کی بات پر سامعہ نے جیسے غور سے اس کا ناک نقشہ دیکھا تھا۔ "آپ تو دنیا کے سب سے اچھے اور پیارے بھائی ہیں۔"
"دیکھو بیٹا! تم لوگوں کا بھائی ہوں، اس لیے تم سب کو اچھا لگتا ہوں، پیارا لگتا ہوں۔ لازمی نہیں ہے کسی دوسرے کو بھی اچھا لگوں۔ اگر وہ پریوں جیسی ہے تو یہ دیکھو میرے ہاتھ۔" سامعہ کے ساتھ ساتھ نوریہ کی نظر بھی اس کے ہاتھوں کی پر گئی تھی۔ "یہ میرے ہاتھ کتنے بھدے اور سیاہ ہیں اور یہ بال کتنے برے لگتے ہیں۔ ہے ناں؟"
سامعہ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا، صبا کی شفاف رنگت سے تو نظر ہی نہیں ہٹتی تھی اور بھایا کو اس نے ابھی ابھی غور سے دیکھا تھا لیکن بھائی ہونے کے اضافی نمبر لگا کر پاس کر دیا تھا۔ اب انہوں نے خود سے یہ خامی نکالی تو اسے دکھ ہوا تھا۔
"میں آپ سے نہیں بولتی۔"
"ابھی یہ میں کہہ رہا ہوں اور تمہیں برا لگ رہا ہے۔ کل کو اگر وہ یا کوئی اور کہے تو سوچو، تمہیں کتنا برے لگے گا اور مجھے بھی۔"
"اور اگر آپ اسے برے نہ لگے تو؟" کتابیں لے کر اٹھنے سے پہلے اس نے ایک بار چپکے سے بھایا سے پوچھا تھا۔
"تو تم بنا لینا اسے بھابی۔"
ایک خواب تھا جو اس نے ان معصوم آنکھوں سے نوچنا چاہا تھا لیکن اس خواب کا کوئی بیج چپکے سے اس کی آنکھ میں آن گرا تھا۔ یا شاید پہلے سے موجود تھا اور اب نمو پا رہا تھا۔ وہ کسی اور نظام شمسی کا چاند تھا۔ اپنے اپنے مدار میں گردش کرتے وہ اپنے مدار سے بھٹک کر اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ تو یہ سارے معاملات سمجھتا تھا ناں۔ وہ کیسے اس کی خواہش کر سکتا تھا؟ یہ اور بات کہ دل کسی بچے کی طرح ہمک ہمک کر اس کی جانب لپکتا تھا۔

☆☆☆

نزہت کو لگا تھا خودکشی کا فیصلہ کرنا مشکل ہے اور اس کے بعد سب آسان ہو گا لیکن یہ تو مشکلات کی ابتدا تھی۔ وہ کسی ایسے انداز سے خودکشی کرنا چاہتی تھی جس سے کم تکلیف ہو اور جان جلدی نکل جائے اور اسے تا حال ایسا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ فری کو اب وہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اسے جلانے کے لیے ناؤ اینڈ تھین کرنے کے لیے اس کے پاس پہلے کی طرح ان گنت مواقع تھے لیکن اب اسے جیسے پروا نہیں تھی۔ نزہت خوش ہونا چاہتی تھی لیکن اگر یہ سب اسفند کی قیمت پر تھا تو اسے یہ سب نہیں چاہیے تھا۔ اسے لگا تھا چار دن اسے جلانے کے بعد وہ اسفند کو دوستوں کی فہرست سے از خود خارج کر دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسفند کو لے کر گھر تک آ گئی تھی اور اسے حیرت تھی کہ اس پر پابندیاں لگانے والوں کو اس میں کوئی قباحت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کا تو گھر کوئی فون ہی آ جاتا تو جیسے قیامت آ

جاتی تھی لیکن یہاں وہ ایک انجان مرد کو گھر میں لے آئی اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

اس روز اسفند اسے لینے گھر آیا تھا۔ وہ دونوں کہیں جا رہے تھے۔ براؤن رنگ کے مسلے ہوئے ٹراؤزر شرٹ میں وہ دنیا جہان سے بیزار بیٹھی تھی۔ دو دن پہلے کے دھلے بال بے ترتیبی سے جوڑے سے نکل کر چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔

نک سک سے تیار اسفند کے سامنے اسے اپنا آپ بہت میلا لگ رہا تھا لیکن وہ دل کی پہلی خوشی تھا۔ اس کی قربت، اس سے مختصر ہی سہی گفتگو.. دل کو سکون دیتی تھی۔ آج کل تو وہ یوں بھی بہت بے سکون تھی۔ ہاتھوں سے کپڑوں کی سلوٹیں دور کرتے اس نے زبردستی لہجے میں بشاشت سموئی تھی۔

"کیسے ہو اسفند۔ بہت دنوں بعد دکھائی دیے۔"

"کمال ہے، ایک بندہ سامنے کھڑا ہے اور تم سے بہتر حالت میں ہے اور تم اس سے پوچھ رہی ہو وہ کیسا ہے اور ویسے بھی جانے تم کس سوگ میں کمرے میں بند ہو کر بیٹھی رہتی ہو ورنہ تمہیں علم ہوتا، اسفند تقریباً ہر روز یہاں آتا ہے۔"

پستہ گرین شرٹ کے ساتھ بلو جینز میں شانوں پر بال بکھیرے وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے نزہت اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے شعلوں کو بھول گئی تھی۔ ایسے میں اگر اسفند اس پر دل ہار گیا تھا تو کون سی بڑی بات تھی۔ اس کے سامنے اسفند کا ہاتھ پکڑے وہ ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئی۔ نزہت کو اس کے جانے کے بڑی دیر بعد ہوش آیا تھا۔ اس دن رات کے کھانے پر فری موجود نہیں تھی۔

"کیا آپ کو فری کی سرگرمیاں معلوم ہیں جن کی وجہ سے وہ رات کے کھانے پر بھی ہمارے ساتھ نہیں ہوتی۔" اس نے بڑے نارمل انداز میں بات شروع کی تھی۔

"کون سی سرگرمیاں؟ دوستوں کے ساتھ گئی ہے شاید۔" ڈیڈی نے پوری توجہ سے جواب دیا تھا۔

"دوستوں نہیں۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ پھرتی ہے..."

"کیا تم نے یہی تہذیب سیکھی ہے اپنی بہن کے بارے میں ایسے بات کرتے ہیں؟ تمہارے ڈیڈی مل چکے ہیں اسفند سے بلکہ اس کی فیملی سے بھی۔ جلد ہی ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ یہی دن ہوتے ہیں انجوائے کرنے کے۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مما نے ٹوک دیا تھا اور ساتھ ہی اچھا خاصا جھڑک بھی دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کمرے میں بند ہو کر رونا شروع کر دیتی اور اس وقت تک روتی رہتی جب تک اندر کی بھڑاس نہ نکل جاتی۔ لیکن اس وقت وہ پوری تیاری کے ساتھ بیٹھی تھی اور کھا سے غصہ تھا۔

"یہ آپ ہیں مما؟ یاد ہے ابھی کچھ ہفتے پہلے جب ایک کلاس فیلو نے کال کی تھی اور آپ نے اسے کتنی باتیں سنائی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے کیسے اتنی چھوٹ دے رکھی ہے آپ نے۔" آخر میں اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی متاسف ہوا تھا۔

"فری جسے پسند کرتی ہے اسے گھر لے آئی ہے۔ اگر تم کسی میں دلچسپی رکھتی ہو تو بلا لو اسے گھر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس طرح رنگ رنگ کے لوگوں سے باتیں نہیں کرتی پھرتی وہ۔ اور کچھ نہیں تو بس یہی لحاظ کر لو کہ وہ عمر میں تم سے بڑی ہے۔"

نزہت کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ پلیٹ پرے کھسکا کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد اس نے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔ دو ماہ سے بھی کم مدت میں فری اس گھر سے رخصت ہو کر چلی گئی تھی۔ فری کے جانے کے بعد زندگی جیسے جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ جو اس کے بغیر زندگی اپنے طریقے سے انجوائے کرنے کا سوچا کرتی تھی، ایسے بے یقین ہوئی تھی کہ ہر بات

بھول کر خود کو یہ یقین دلانے میں جت گئی کہ اب اس کی زندگی پر فری نام کی نحوست کا کوئی سایہ تک نہیں لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ کچھ نفرتیں محبت سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہیں۔ آنے والے سالوں میں نزہت کو اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا تھا۔

☆☆☆

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہونے کے ساتھ ہی شمسہ کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ کتنی لڑکیاں کام کروانے کے لیے آتی تھیں۔ نوریہ کے کپڑے سلائی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ کچھ رمضان کی عبادات اور کچھ سستی... ہر روز وہ ایک ہی دہائی دے رہی ہوتی۔

”تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں اور میرا کام مکمل نہیں ہو رہا۔“

رمضان میں اماں کی عبادت کا دورانیہ بڑھ گیا تھا۔ اس روز موکی پھلوں کے چھوٹے چھوٹے شاپروں میں کھجوریں ڈال کر افطاری سے پہلے سارے شاپر تقسیم کرنے تھے۔ صبا مقصود بھی ان کے ساتھ کام کروا رہی تھی۔ ایک تو آج سورج نے بھی خوب گرمی برسائی تھی۔ حلق میں جیسے کانٹے اگے ہوئے تھے۔ افطاری کے وقت سب سے بے حال وہی ہو رہی تھی۔

”آپ کمرے میں جا کر لیٹیں۔ میں سمیٹ لیتی ہوں سب۔“

نوریہ کے بار بار اصرار کرنے پر وہ کمرے میں آ کر بے دم ہو کر بستر پر گری تھی۔ اسے لگا تھا لیٹتے ہی نیند آ جائے گی اور وہ پرسکون نیند سو جائے گی۔ ایسا ہی ہوتا لیکن کمرے میں جیسے آگ برس رہی تھی۔ اتنے دنوں سے شمسہ، نوریہ اور سامعہ نے اپنی چارپائیاں فصیح کے ساتھ باہر صحن میں لگا لی تھیں۔ اماں اور ابا بھی رات کا پہلا پہر باہر ہی سوتے تھے۔ انہوں نے تو اسے بھی پیشکش کی تھی لیکن وہ ایسے کھلے میں سب کے سامنے لیٹنے کے خیال سے ہی بے سکون ہو گئی تھی۔ اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا سارے لحاظ بھلا کر باہر کسی کے بستر پر جا کر [illegible] مارے کسی نے اسے کون سا کچھ کہہ دینا تھا۔ سوچنے کے باوجود وہ ہمت نہیں کر پائی۔

کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے ڈریسنگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی اور اس کا صرف ایک ہی پٹ کھل سکتا تھا۔ پردہ ہٹا کر اس نے کھڑکی کھول دی۔ سامنے چارپائی پر وہ جانے اسی کا منتظر تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی دونوں کی نظریں ملیں اور اس کی پرشوق نگاہوں کی تاب نہ لاتے اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا کر کھڑکی چھوڑ دی۔ یہ وہم نہیں تھا۔ ہر وہ پل جس نے اس کے فصیح کی زندگی میں اہم ہونے کے خیال کو تقویت دی تھی، اسے وہم ہی لگتا تھا اور اسے یہ وہم بھی پیارا تھا۔ اس رات جب بھی اس کی آنکھ کھلی اس نے دو پرشوق نگاہوں کو اس کھڑکی پر رکے ہوئے محسوس کیا۔

☆☆☆

آسمان تاریک تھا اور ستاروں کی جلتی بجھتی مشعلیں بڑی واضح اور قریب دکھائی دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں سفید بادل ٹکریوں کی صورت تیرتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے باوجود منظر بڑا روشن لگ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے آسمان جھک کر اس کی درخشاں پیشانی پر بوسہ دینے والا ہے۔ کھلے آسمان تلے وہ کتنی ہی دیر ساکت لیٹی رہی۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ جانے کیا کیا پکایا جاتا تھا، وہ تو بس شمسہ کے کہنے کے مطابق ہلکی پھلکی مدد کرتی جا رہی تھی جیسے بادام کی گریوں کو بھگو کر ان کے چھلکے اتارنا اور میوے کی ڈنڈیاں اتار کر صاف کرنا۔ نوریہ کے ساتھ مل کر اس نے کل پکائے جانے والے چاول بھی چنے تھے۔ باہر گلی میں ایک کے بعد ایک موٹر سائیکل زوں زوں کر کے گزرتی جا رہی تھی۔ ایک رونق اور چہل پہل کا احساس تھا۔ آنکھیں موندے وہ وقت کی چاپ محسوس کرنے لگی۔

اس کے دل میں بڑی خواہش تھی ان سب کی

محبتوں کو محبت سے لوٹانے کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس دن شمسہ نے جب کسی کریم کے ختم ہونے کا ذکر کیا تو اس کی سمجھ میں آگیا اس نے کیا کرنا ہے۔ وبا کے باعث آن لائن خرید و فروخت کو بڑی تقویت ملی تھی۔ اس نے آن لائن کچھ اشیاء منگوانے کا ذکر کیا تھا اور پورے گھر میں ٹچ فون صرف فصیح کے پاس تھا۔ اپنا بیگ میں پڑا فون آن کرنے کا اسے خیال ضرور آیا تھا لیکن وہ ابھی بھی ڈھونڈ لیے جانے کے خیال سے ڈری ہوئی تھی۔

"تمہیں جو منگوانا ہے بتا دو۔ بھایا لا دیں گے۔ انہیں سب پتا ہوتا ہے۔" سامعہ نے جھٹ مشورہ دیا۔

"نہیں، میں خود اپنی مرضی سے خریداری کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تمہارا بھائی اپنا فون کچھ دیر کے لیے دے دے تو میں آن لائن آرڈر کرلوں گی۔"

یہ کون سی بڑی بات تھی۔ فصیح سے اس کے نام پر جان بھی مانگی جاتی تو شاید وہ تامل نہ کرتا۔ نوریہ جا کر فون لے آئی تھی اور پھر ان چاروں نے مل بیٹھ کر اسکرین پر روشن بازار میں سے چن چن کر مرضی کی چیزیں نکالی تھیں۔ سب سے پہلے تو اس نے کپڑوں کے برینڈز کی ویب سائٹ کھولی تھیں۔ نوریہ کی تو جان تھی اچھے کپڑوں میں۔ باہمی مشورے سے چار پانچ اچھے اچھے لیڈیز سوٹ آرڈر کرنے کے بعد اس نے اپنی مرضی سے دو جینٹس سوٹ آرڈر کیے۔ شمسہ کے لیے اس نے مہنگے برینڈ کی بڑی اچھی فیشل کٹ منگوائی تھی۔ اس کے بیگ میں رکھے پیسوں سے بڑی آسانی سے ادائیگی ہو سکتی تھی۔ پھر جب سارا سامان پہنچا اور اس نے ساری چیزیں ان کے سامنے یہ کہہ کر رکھیں کہ یہ ان کے لیے ہیں تو ان کے چہرے دیکھنے والے تھے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے ایسی خوشی کا ذائقہ چکھا تھا۔ یہ بڑی خالص خوشیاں تھیں۔ نوریہ اپنی طرف سے سب کے کپڑے سلائی کر کے فارغ ہوئی تھی اور اب ایک دم سے پھر سارا کام نئے سرے سے تیار ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ اتنے مہنگے اور خوب صورت کپڑے تو اس نے خواب میں بھی خریدنے کا، پہننے کا نہیں سوچا تھا۔

شمسہ نے سب سے پہلے اسی کا فیشل کیا تھا۔

اماں بھی اس کے منگوائے کریم رنگ کے اپنے اور مجازی خدا کے سوٹ کو دیکھ کر یکدم حیران اور خوش ہوئی تھیں۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ وہ سوچ رہی تھی ان لوگوں کے پاس خوش رہنے کے لیے کیا کم تھا؟ اس نے دولت کی فراوانی دیکھی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں یہ خوشیاں اس کے گھر میں نہیں تھیں۔

شمسہ نے سارے کام روک کر اس کے ہاتھوں پر مہندی سے نقش و نگار بنائے تھے۔ فصیح ابھی تک رکشہ لے کر واپس نہیں آیا تھا۔ صحن میں ملے جلے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آج قدرتی موسم بھی اچھا تھا۔ وہ وہیں باہر چارپائی پر لیٹی لیٹی غنودگی میں چلی گئی۔

اماں باورچی خانے سے نکل کر پسینہ پونچھتی بستر کی جانب بڑھیں تو اسے پسینے میں تر اور غیر فطری انداز میں سوئے پایا۔ اس کے چہرے پر خوف تھا اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ پتا نہیں بچی کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچی ہے۔ پہلی سوچ ان کے ذہن میں یہی ابھری تھی۔ خود تین بچیوں کی ماں تھیں شاید اسی لیے دل اتنا زیادہ نرم تھا۔ نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی چیخ ہونٹوں کے درمیان ہی دب گئی تھی لیکن آنسوؤں پر اس کا اختیار نہیں تھا سو وہ بہتے چلے جا رہے تھے۔ اماں اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گئیں۔ کندھے پر دباؤ بڑھاتے انہوں نے اسے اپنی سمت کھینچا۔ "کیا بات ہے؟ کوئی برا خواب دیکھا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں پتا ہے ماؤں کے لمس میں بھی اولاد کے لیے شفا ہوتی ہے؟"

وہ چپ رہی لیکن اس کے دماغ میں ان کے

ان الفاظ سے جانے کون کون سی شبیہیں بننے اور بگڑنے لگی تھیں۔

"ماؤں کی دعا اولاد کے حق میں کبھی رد نہیں ہوتی۔ یہ جو کچھ دن اللہ نے اپنی جناب میں سے مجھے دیے ہیں ناں عبادت کے لیے.. ان میں میں نے جب جب اپنی اولاد کے بارے میں سوچا، تم ان کے ساتھ ہی میری سوچوں میں آتی رہی ہو۔ ہوسکتا ہے اپنی اولاد سے زیادہ دعائیں میں نے تمہارے لیے کی ہوں۔ وہ اس لیے کہ ان دعاؤں کے سوا میں تمہارے لیے اور کچھ نہیں کر سکتی۔

یا شاید ایک اور کام کر سکتی ہوں۔ یہ جو تمہارے دل پر بوجھ ہے ناں... یہ ہلکا کر سکتی ہوں۔ تم مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ سچ کہتی ہوں کبھی اس بات کا ذکر تمہارے سامنے بھی نہیں کروں گی۔ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں اگر تم سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہے تو بلا جھجک بتاؤ۔ اس سے تمہیں سکون ملے گا"

اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ نرمی سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے آنکھوں کے ساتھ اپنا دل، اپنا وجود بھی پگھلتا ہوا محسوس کیا۔

☆☆☆

فری کی شادی کیا ہوئی، نزہت بالکل آزاد ہو گئی تھی۔ مما کا دھیان اس کی طرف لگا رہتا۔ جب دیکھو فون پکڑے اس کو ہدایات دے رہی ہوتیں۔

"زیادہ اچھل کود کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ٹک کر گھر بیٹھو اب۔ تھوڑے وقت کی بات ہے پھر چاہے جتنی مرضی لمبی دوڑ لگا لینا۔"

"اسفند سے کہو، تمہیں گراؤنڈ فلور پر کسی کمرے میں عارضی طور پر منتقل کر دے۔ بار بار سیڑھیاں اترنا ٹھیک نہیں ہوتا اس حال میں۔"

"اپنے کھانے پینے پر توجہ دیا کرو۔ موسمی پھلوں کے جوس پیو۔ پھل کھاؤ اور طاقت والی چیزیں کھاؤ۔ نہیں دل چاہتا تو دوائی سمجھ کر کھا لیا کرو۔"

اگر کسی وقت نزہت کی طرف توجہ جاتی بھی تو گزرے چند ماہ میں اس نے کافی کچھ سیکھ لیا تھا جس میں سرفہرست ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کو نظر انداز کرنا تھا۔ ماں کہتی رہتی لیکن وہ کان لپیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتی۔ وہ اگر ڈیڈی سے شکایت کرتیں تو ڈیڈی سے سامنا ہوتے پر وہ بالکل فرماں بردار اور مطیع ہونے کی اداکاری کرتی وہ بھی اسے ہلکی سی سرزنش کے بعد بھول بھال جاتے۔ اسے اب ساری دنیا کھلی کھلی لگنے لگی تھی۔ وہ جہاں چاہے جیسے چاہے بیٹھتی، جا باہر آتی جاتی.. فری کا بھوت اب اسے ستاتا نہیں تھا۔ اتنے سارے مہینے تو ذہن کو نارمل کرتے گزر گئے تھے اور جب چیزیں اسے زیادہ واضح دکھائی دینا شروع ہوئیں تب ایک بار پھر فری نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

سی سیکشن کے دوران وہ جان سے چلی گئی تھی۔ نزہت کے لیے اچھا تھا، وہ کل کی مرتی آج مر گئی لیکن جاتے جاتے وہ ایک بچی چھوڑ گئی تھی۔ مما شوگر کی مریضہ تھیں اور بچی کی ذمہ داری نہیں لے سکتی تھیں اور یوں ضوفشاں اسفند تو کرانیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اس دن مما کی کوئی کزن آئی ہوئی تھیں۔ مما سے فری کی تعزیت کرتے انہوں نے کہا "میں تو کہتی ہوں نزہت کی شادی کروا دو اس لڑکے سے۔ بچی کو ماں مل جائے گی آخر تم نے بھی تو تایازاد بہن کی بیٹی پالی ہے۔"

تو زندگی کی ساری ناانصافیوں کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مما کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ سے گلہ تھا کہ مما فری سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ ڈیڈی اس کی بات زیادہ سنتے ہیں لیکن اس طرح نہیں تھا۔ مما کی شہ پر اس کی اپنی شخصیت میں جو خود اعتمادی کا فقدان پیدا ہو گیا تھا، اس کے باعث وہ ڈیڈی کے بھی قریب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہوا تھا۔ اگر وہ جان جاتی کہ مما اس کی مما نہیں ہیں اور فری اس کی بہن نہیں ہے تو شاید وہ اپنے گرد کوئی حفاظتی حصار بنا لیتی لیکن نہیں۔

ان دنوں اس کے اندر بڑی ٹوٹ پھوٹ ہوئی

تھی۔ وہ ماں جس کے لمس اور عکس سے ناآشنا اس نے زندگی کا کٹھن سفر تن تنہا طے کیا تھا، وہ دھاڑیں مار مار کر اس کے لیے روئی تھی۔ سب کے ساتھ ساتھ مما کو بھی دھوکا ہوا کہ وہ فری کے لیے رو رہی ہے۔ اسے فری کا دکھ ہے۔

تین ماہ کی قلیل مدت میں مما بھی راہی عدم ہوئیں تو ڈیڈی بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک حبس زدہ رات کو انہوں نے اسے کمرے میں بلوایا۔

''مجھے اپنی زندگی کا بھروسا نہیں ہے، اس لیے مرنے سے پہلے میں تمہیں تمہارے گھر کا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی زندگی کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرو گی، مجھے قبول ہوگا، ہو سکے تو اس بچی کا خیال کرنا۔'' انہوں نے صاف سیدھی بات کی تھی۔

''کیا آپ مجھے بتائیں گے، آپ کی مما سے شادی کیسے ہوئی اور میری مما کو کیا ہوا تھا؟'' اس نے باپ کو جھکا کھاتے دیکھا تھا۔

''تمہاری ماں... اس نے... وہ فری کے باپ کے ساتھ گھر سے چلی گئی تھی۔'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے لبوں سے نکلے تھے۔ ''میں نے اسے طلاق دے دی اور تمہاری مما کو اس کے پہلے شوہر نے۔ وہ دونوں اپنی دنیا کہیں پہلے بسا چکے تھے لیکن ہم اجڑ گئے تھے۔ خاندان والوں کے باہمی مشورے سے اور کہہ لو ایک طرح کا دباؤ تھا ہم دونوں پر، تو ہم نے زندگی کو وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ وہ جو جوڑ تھا... ساری زندگی جوڑ رہی رہا لیکن بہر حال زندگی گزر گئی۔ انہوں نے گہری سانس بھری۔ ''یہ اچھا ہے کہ تم حقیقت جانتی ہو۔ اس طرح تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ دیکھو اگر تم اسفند سے تعلق جوڑنا چاہتی ہو... ورنہ تمہاری زندگی ہے تم جیسے چاہو گزار سکتی ہو۔''

یہ پہلی بار تھا جب اسے لگا کہ وہ ڈیڈی کے قریب ہے بہت قریب۔ ان کی بیٹی ہونے کو اس نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں ڈیڈی؟''

''میں چاہتا ہوں، تم اپنے گھر میں خوش رہو، آباد رہو۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں، ضوفی کو ماں کی کمی نہ محسوس ہو۔ کیا یہ دونوں چیزیں ممکن ہیں؟''

اس نے ڈیڈی کا جواب جان لیا تھا۔ اسفند اسے پہلے بھی پسند رہا تھا۔ اگر فری درمیان میں نہ آتی تو شاید اس کی اور اسفند کی کوئی کہانی بنتی۔ اس نے جذباتیت میں ہاں کہنے میں دیر نہیں کی تھی لیکن یہاں معاملہ صرف اس کی زندگی کا نہیں تھا۔ اسفند نے قطعیت سے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

اتنے واضح انکار کے بعد بھی وہ اسے جانے نہیں دے سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے دل میں اپنی محبت کا چمن اگا سکتی ہے۔ وہ اس کی پہلی خواہش تھا اسے یوں تو نہیں جانے دیا جا سکتا تھا۔

''مجھے کوئی اور بچہ نہیں چاہیے۔''

اس بات پر اس کا دل دکھا تھا لیکن یہ تو جذباتی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی تھوڑی گزرتی ہے۔ اس نے مان لی تھی یہ شرط اور پھر ضوفشاں اسفند سے چاہتے ہوئے بھی ذمہ داری بن گئی۔

مما سے بیزاری، فری سے نفرت اور اس پر طرہ یہ کہ ضوفشاں شکل و صورت میں فری کا پرتو تھی۔ اس کی آنکھوں کا سبز سنہری رنگ اور چہرے کے تیکھے خدوخال سب کچھ ابھی سے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اسفند کی اس کی ذات میں عدم دلچسپی نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا تھا۔ میں اسے اس بچی سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس بچی کا قصور نہیں، اس لیے اس پر ترس بھی آتا تھا۔ ایک بار وہ اسے چومتی تو دس بار اسے اپنے زخموں کو رفو کرنا پڑتا۔

وہ ہر محاذ پر اکیلی لڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو ہوا اور پھر اسفند کی بے اعتنائی.... اچھی زندگی کے سارے خواب اوائل دنوں میں ہی چکنا چور ہو گئے تھے۔ ڈیڈی کی وفات اس کے حالات کی قبر میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔ ضوفشاں بڑی ہو رہی

تھی۔ نزہت کو چلتی پھرتی فری نظر آتی تھی۔ اسفند جس طرح اس کے ناز نخرے اٹھاتا، اسے سب دکھائی دیتا تھا اور اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔

ان جانے میں وہ ممّا کا کردار ادا کرنے لگی تھی لیکن اسفند اس کا باپ نہیں تھا جو اپنی بیٹی کی طرف سے آنکھیں بالکل بند کر لیتا۔ ضوفشاں کے ساتھ ساتھ اس کی نفرت اپنی ماں اور فری کے بعد اسفند سے بھی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ اسفند کے دل میں ضوفشاں کے لیے نفرت اور اپنے لیے محبت پیدا نہیں کر سکی۔ وہ اسفند کو ایک بچے کے لیے راضی نہیں کر سکی۔ یہ فری تھی، ضوفشاں تھی جس کی وجہ سے اس کی زندگی جہنم ہوئی اور یہ سارے حساب چکانے کا موقع قدرت نے تیمور کی شکل میں فراہم کیا تھا۔ تیمور ڈیڈی کے آبائی گاؤں سے آیا تھا اور نزہت سے چاہتا تھا کہ وہ اسفند سے کہہ کر اس کو کہیں جاب پر لگوا دے۔ اس نے سب سے پہلے تو اس کے کاغذات قبضے میں کیے تھے۔

''میں اسفند کو تمہارے پیپرز دکھا دوں گی تاکہ تم سے ملنے سے پہلے ہی اس کا ذہن بنا سکوں۔ تم دو دن بعد آنا۔''

یہ دو دن اس نے سوچنے کے لیے لیے تھے۔ گاؤں کا ہونا اس کے لیے شاید شرمندگی کا باعث تھا اسی لیے شہری نظر آنے کے چکر میں عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ شاکنگ پنک شرٹ کے ساتھ پیلے رنگ کی پینٹ میں عجیب جوکر لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نزہت کے دل میں جو پہلا خیال آیا تھا وہ اس پر سوچنا چاہتی تھی۔ یہ سوچنا چاہتی تھی کہ اس کا منصوبہ کس حد تک قابلِ عمل ہے۔

اسفند ملک سے باہر تھا اور وبا کی وجہ سے انٹرنیشنل فلائٹس بند تھیں، جو کہ نامعلوم مدت تک بند رہی تھیں۔ زیادہ سوچنے کا تردد کیے بغیر اس نے ایک زہریلا منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ دو دن بعد جب وہ لڑکا آیا تو اس نے اپنا سارا زہر اس کے سامنے اگل دیا۔

''میرے اسفند کے ساتھ کچھ اچھے تعلقات نہیں ہیں، اس لیے میری وجہ سے تو وہ تمہیں نوکری پر لگوائے گا نہیں بلکہ لگتے بھی ہوئے تو وہ کہیں لگنے نہیں دے گا کیونکہ میں نے تمہاری سفارش کی ہے۔''

''اوہ.. تو پھر میں کیا کروں؟'' وہ بے وقوفی سے منہ کھولے پوچھ رہا تھا۔

''میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''کیا آپ مجھے کہیں نوکری پر لگوا سکتی ہیں؟''

''نہیں، یہ مدد اس طرح کی نہیں بلکہ یہ کچھ لو تم میرا کام کرو گے اور میں تمہیں اس کے بدلے میں اتنے پیسے دوں گی کہ تم اپنا چھوٹا موٹا بزنس شروع کر سکو۔''

وہ چاہتی تھی یہ لڑکا ضوفشاں کی شکل میں فری کو روند ڈالے اور پھر وہ اسفند کو بتائے کہ لڑکیوں کو ڈھیل دینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اسفند کو وہ یہی بتاتی کہ یہ لڑکا ضوفشاں نے خود بلایا تھا۔ اس کے بعد اسفند کے لیے اس کی شادی اس سے کر کے گھر سے ٹالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ شادی تو اس کی یوں بھی اسفند کہیں نہ کہیں کر ہی دینے والا تھا لیکن وہ فری کی، اسفند کی بربادی دیکھنا چاہتی تھی۔

اسفند غیر ملکی دورے پر تھا اور اسی دوران وہ سارا کھیل سرانجام دے سکتی تھی۔ سارے معاملات باریکی سے ترتیب دیتے اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لگا کہ معاملہ اس طرح بھی بگڑ سکتا ہے۔ عین وقت پر وہ مکر گیا تھا۔

''میں نے بہت سوچا ہے، میں نہیں کر سکتا۔ میں ایسے کسی کی زندگی خراب نہیں کر سکتا۔''

تیمور ضرورت مند تھا۔ گاؤں کا سیدھا سادہ لڑکا تھا لیکن وہ بے ضمیر نہیں تھا۔ اس کے کاغذات دوبارہ بن سکتے تھے، وہ جانتا تھا۔ ان کے لیے جان اتنے جوکھم میں ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''میں تمہیں یہ سب بیچ میں چھوڑ کر جانے کی

اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہیں... ہر حال میں میری مدد کرنی ہوگی۔"

"آپ کا مسئلہ اس لڑکی سے جان چھوڑنا ہے ناں؟ اگر کچھ کیے بنا اس لڑکی سے جان چھوٹ جائے تو؟"

"کیسے؟" وہ سراپا سوال بن گئی۔

☆☆☆

وہ مقررہ دن اس گھر پہ پہنچا جہاں نزہت نے بساط بچھائی تھی۔ کیمرے کی زد میں آئے بغیر گھر میں داخل ہونے کا راستہ نزہت نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف چند باتیں.. جو اس کے اور نزہت کے درمیان ہوئی تھیں۔ اپنی طرف سے اس نے ضوفشاں کو خبردار کر دیا تھا۔

"تمہاری ماں نے بھیجا ہے مجھے اور مجھے تو اپنے لیے بھی اس عورت پر اعتماد نہیں۔ اس لیے اپنی حفاظت کے لیے جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ یہاں سے۔"

"کیا مطلب؟"

جواباً اس نے مختصر ساری کتھا کہہ سنائی۔

"میں کہاں جاؤں گی؟" وہ ششدر کھڑی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میں یہاں سے اپنے گاؤں نکل جاؤں گا اور چند دن بعد آ کر کہہ دوں گا، مجھے تم نہیں ملیں۔"

"میرے پاپا..."

"ان کے آنے تک کچھ نہیں بچے گا۔ میں نہیں تو کوئی اور وہ سب یا اس سے بھی زیادہ برا کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ میں بس آگاہ کر سکتا تھا۔ اس سے آگے نمٹنا تمہارا اپنا کام ہے۔"

وہ جانے کے لیے مڑا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔

"تم بے وقوف ہو؟ تمہیں کسی نے میرے ساتھ دیکھ لیا تو میری زندگی الگ عذاب ہو جائے گی۔"

چھوٹے سے بیگ میں کپڑے ٹھونستے نقدی اور زیورات رکھنے کا مشورہ بھی اسی نے دیا تھا۔

"منہ سر لپیٹ کر نکلو کہ کوئی تمہیں پہچان نہ سکے اور کرائے وغیرہ کے پیسے لے لو تاکہ آسانی سے کہیں دور نکل سکو بلکہ جو جو لے جا سکتی ہو لے جاؤ۔ اپنا فون بھی آف کر دو ورنہ کل کلاں کو ٹریس ہو گیا تو کیا پتا پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔"

اتنے گراں قدر مشوروں کے ساتھ اس نے بڑی مہارت سے اس کا چہرہ چھپانے میں بھی مدد کی تھی اور یہ وہی رات تھی جب وہ صبیح حیدر کو ملی تھی۔

☆☆☆

عید کا دن روزمرہ سے ہٹ کر بہت اجلا اور چمکیلا تھا۔ ضوفشاں کے لیے تو روئے زمین پر پہلی عید اتری تھی اور کیا ہی سعید عید تھی۔ نوریہ نے جی جان لگا کر ضوفشاں کے سب کے لیے منگوائے کپڑے سلائی کیے تھے اور اماں سمیت سب بہنوں نے وہی کپڑے پہنے تھے۔

کسی درزی نے ابا اور صبیح کے کپڑے نہیں پکڑے ورنہ صبیح نے تو بہت کوشش کی تھی کہ وہ بھی اس کا پسندیدہ لباس پہنے۔ خود اس نے وہی سوٹ پہنا تھا جو اماں نے رمضان سے پہلے ہی لا کر نوریہ کو سلائی ہونے دے دیا تھا۔ مونگیا سبز رنگ کی شلوار قمیص میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی اور کچھ خوشیوں کا عکس تھا۔ مہندی سے سجی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اماں نے بطور خاص اس کی نظر اتاری تھی۔

"یہ تم ابھی تک ایسے ہی کیوں پھر رہی ہو؟" باورچی خانے اور کمرے کے درمیان چکر کاٹتی نوریہ کو شمسہ نے پکارا۔

"تو اور کیا کروں؟ ابھی تک میرا موڈ لگنے والا ہے اور ساتھ والوں کے گھر سویاں بھجوانے کا کہہ رہی ہیں اماں۔ تم تو کمرے سے باہر نہیں نکل رہی تھیں۔" وہ چڑی ہوئی تھی۔

''تو کس نے کہا تھا، عید تک سوٹ لٹکانے کو؟ جاؤ جا کر اپنے کپڑے دیکھو۔ میں دیکھ لیتی ہوں یہاں۔''

اس کی بات پر نوریہ کمرے کی طرف بھاگی تھی اور شمسہ باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ تب ہی وہ بھی پانی لینے آ گئی۔

''مجھے بھول ہی گیا کہ آج روزہ نہیں ہے۔ کب سے پیاس لگی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''ایسے ہی ہوتا ہے۔ خود مجھے کتنے دن تک یہی وہم رہتا ہے کہ میں روزے سے ہوں۔''

''السلام علیکم۔ عید مبارک''

باہر ابا اور فصیح عید کی نماز پڑھ آئے تھے۔

''ایک منٹ یہ پلیٹوں میں نکالنا، میں عیدی لے کر آتی ہوں۔'' شمسہ آناً فاناً باہر نکل گئی تھی۔

اس نے ذرا سا اوٹ میں ہو کر باہر دیکھا۔ سامعہ ابا کے بازو سے لگی کھڑی تھی اور شمسہ فصیح سے بات کر رہی تھی۔ اسے پاپا یاد آئے تھے۔ پتا نہیں ان کی عید کا رنگ کیسا ہوگا۔ دل کے اندر گہری اداسی اتری تھی۔ فصیح نے نظر اٹھا کر اس سبز پری کو دیکھا تھا۔ کسی سوچ میں گم اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ بے ساختہ اس کی نگاہ گلاب کی باڑ کی طرف گئی۔

''تم بھی ابا سے مل لیتیں۔ تمہیں بھی عیدی ملے گی۔'' شمسہ واپس آئی تو اس کے گال خوشی سے تمتما رہے تھے۔

وہ سر نیچے کیے کھڑی رہی اور پھر خاموشی سے نکل کر باہر آ گئی۔ پتا نہیں کیوں دل اچانک ہی ہر شے سے اچاٹ ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دنیا میں اس کا صرف ایک رشتہ تھا اور وہ بھی اس سے گم ہو گیا ہے۔ جامن کے تنے سے ٹیک لگائے وہ جیسے سب سے چھپ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اماں کے آواز دینے تک وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ یہ پہلا دن تھا جب ان پرخلوص لوگوں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کا دل وہاں نہیں تھا۔ وہ کسی طرح پاپا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ان سے ملنا چاہتی تھی اور رہ رہ کر اسے رونا آ رہا تھا۔

یہ گھرانہ ایسا مہمان نواز تھا کہ سارا دن گھر میں مہمانوں سے رونق لگی رہی۔ وہ سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس کے بارے میں کیا بتایا گیا ہے لیکن اس سے جو بھی ملا، بہت محبت سے ملا تھا۔

سہ پہر میں جب شمسہ اور نوریہ خوش اسلوبی سے مہمان نوازیاں نبھا رہی تھیں، سامعہ اس کے پاس کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ اداس ہیں؟''

اس کا دل نہیں چاہا بچی کو پریشان کرنے کا ''نہیں بس ذرا سر میں درد ہے۔'' واقعی اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔

''میں دبا دوں؟''

''ارے نہیں۔ ہو جائے گا خود ٹھیک۔ میں کھانا کھا کر چین کلر لے لوں گی۔ آپ یہ بتاؤ، آج کتنی عیدی ملی؟'' وہ اسے باتوں میں بہلانے لگی۔

''ابھی گنتی نہیں کیے۔ برکت نہیں ہوتی ناں۔''

ضوفشاں کو اس کی معصومیت پر پیار آیا تھا۔

''آپ کو کتنی عیدی ملی؟''

''مجھے تو نہیں دی،'' اس نے کندھے اچکائے۔

''ابا نے بھی نہیں دی اور بھایا تو ضرور دیتے ہیں عیدی۔ انہوں نے بھی نہیں دی؟''

اس نے بتایا نہیں کہ وہ ان کے پاس گئی ہی نہیں۔ ''آپ کو پتا ہے، ایک لڑکی ہے جو مجھ سے بھی بہت زیادہ پیاری ہے۔'' اس نے موضوع بدلا۔

''ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے تو اصل میں جو سب سے پیاری لڑکی دیکھی ہے وہ آپ ہیں۔''

''ہے ایک لڑکی۔ اگر آپ نے دیکھنی ہو تو میں دکھا سکتی ہوں۔''

سامعہ کچھ دیر پہلے تو سوچتی رہی پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے آپ دکھائیں لیکن پھر میں بتاؤں گی مجھے وہ لڑکی کتنی پیاری لگی ہے۔''

''نہیں ایسے نہیں ہوتا ناں۔ اب مجھے وہ سب

سے پیاری لگتی ہے۔ اگر آپ یہ کہو، وہ آپ کو کم پیاری لگی ہے تو مجھے برا لگے گا ناں۔"

"اچھا نہیں کہتی۔"

ضوفشاں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر شیشے کے سامنے لے جا کھڑا کیا۔ ایک بار تو اس نے ناسمجھی سے ضوفشاں کی جانب دیکھا اور پھر شرما کر واپس بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"بے حساب سے پیاری؟"

"میں آپ کو پیاری لگتی ہوں؟" وہ کچھ سوچنے کے انداز میں پوچھنے لگی۔

"سب سے پیاری۔"

"اور میرے بھایا؟"

ضوفشاں کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ سارا درد سر ہوا ہو گیا تھا اور وہ چستی سے سیدھی ہو کر بیٹھی۔ وہ بھلا اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی؟ اور وہ اس سے ایسی بات پوچھ ہی کیوں رہی تھی۔ اس کی خاموشی اس چھوٹی سی لڑکی پر بہت بھاری تھی۔

"میرے بھایا آپ کو پیارے نہیں لگتے؟"

"اچھے ہیں تمہارے بھایا، کیوں نہیں اچھے لگیں گے۔"

"اچھے تو وہ بہت ہیں۔ آپ ابھی جانتی نہیں ناں انہیں۔ بس یہ بتائیں، وہ آپ کو پیارے لگتے ہیں یا نہیں؟"

"آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"وہ بھایا کہہ رہے..."

"سامعہ بیٹی ذرا جگ میں ٹھنڈا پانی تو لے کر آ۔"

کسی رحمت کے فرشتے کی طرح اماں نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔ بات ادھوری ہی رہ گئی۔ اور پھر اس ادھوری بات کو پورا کرنے کے لیے وہ خود آ گیا۔ شام کا پہر دھیرے دھیرے سرک رہا تھا اور رات کا رنگ بھی اندھیرا پھیلا جا رہا تھا۔ سارا دن سورج نے جی بھر کر بدلے لیے تھے یہی وجہ تھی گرمی آج پہلے سے زیادہ تھی۔ فصیح ابھی نوریہ اور شمسہ کو ان کی

کسی سہیلی کے گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ سارا دن اچھل کود کرنے کے بعد سامعہ شام کی اذان سے پہلے سو گئی تھی اور پھر اماں کے اٹھانے پر بھی نہیں اٹھی۔ وہ گھر پہنچا تو اماں کھانا گرم کر رہی تھیں۔

وہ یقیناً کمرے میں تھی۔ صبح سے وہیں چھپی ہوئی تھی۔ ایک آدھی ادھوری جھلک کے بعد سارا دن وہ دکھائی نہیں دی تھی اور فصیح نے جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زندگی میں پہلی بار ایک خواہش کی تکمیل میں چاندی کے جھمکے لیے تھے، ابھی بھی اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ اماں اس کی آمد سے بے خبر تھیں اور اسی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر وہ چپکے سے اس کمرے کی طرف آ گیا جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا۔

وہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر آئی تھی اور کندھے پر جھولتے لان کے دوپٹے سے چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔

"عید مبارک کہنے والے کو عیدی ملتی ہے۔ آپ سے یہ دو لفظ تو کہے نہیں گئے اور گلہ یہ کہ آپ کو عیدی نہیں ملی۔" سینے پر ہاتھ باندھے وہ جیسے بڑی فرصت سے آیا تھا۔

ضوفشاں کی جان پر بن آئی تھی۔ پتا نہیں اس سامعہ کی بچی نے اس سے جا کر کیا کہہ دیا تھا۔ "میں نے اس سے یہ نہیں کہا تھا۔"

"اور کیا کیا آپ نے نہیں کہا تھا... میرے بارے میں؟"

"میں نے.. میں نے تو اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ آپ نے شاید کچھ کہا تھا۔" دوپٹہ سر پر ڈالتے اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اس کی خواہش تھی کہ میں چاند چرا کر اپنا آنگن سجا لوں۔ میں نے اسے کہا آسمان کا چاند آسمان پر پیارا لگتا ہے۔ اگر جھیل کے پانی میں اتر آئے تو اسے اپنا بنانے کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ وہ نا سمجھ ہے.. اور دل بھی۔" آخری بات تک اس کی دھیمی آواز مزید دھیمی ہو گئی۔ ضوفشاں کا دل کنپٹیوں پر آ کر دھڑکنے لگا تھا۔

دو قدم آگے آ کر اس نے ایک چھوٹا سی ڈبیہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی۔ آئینے میں ان دونوں کا عکس بڑی مکمل تصویر بنا رہا تھا۔ ”عید مبارک“ اس کے ہونٹ کانپے عکس کو شیشے میں چھو کر وہ واپس مڑ گیا۔

”ہو سکتا ہے آنکھ کی جھیلوں میں اترنے والی وہ شبیہ، جسے آپ چاند سمجھ رہے ہوں وہ یہیں کہیں اس زمین کا کوئی دیا ہو اور قابل رسائی بھی۔“

وہ جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔ ”مگر آپ کہیں تو میں کوشش کر کے دیکھوں؟“

اس کے لہجے میں کتنا اشتیاق تھا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں جلتے دیوں کی آنچ سے صوفشاں اسفند موم سے بنی گڑیا جیسے پگھلنے لگی تھی۔ بمشکل اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”میری عید مبارک کرنے کا شکریہ۔“ سرگوشی میں کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور صوفشاں نے رکے ہوئے سانس بحال کرتے تمتماتے گالوں کے ساتھ وہ ڈبیہ اٹھائی۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو مٹھی میں وہ جھمکے اور آنکھوں میں بہت سارے خواب تھے جن کے دھاگے باہر صحن میں تاروں پر نظر جمائے اسے سوچتے صبح سے جا ملتے تھے۔ ابھی انہیں معلوم نہیں تھا خوابوں کی عمر تھوڑی ہوا کرتی ہے۔

☆☆☆

نزہت کو لگا تھا، صوفشاں کے جانے سے اس کے دل میں برسوں سے جلتی آگ سرد ہو جائے گی۔ یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اسفند کے سینے میں بھی کوئی چنگاری چھپی ہے جو باہر نکل کر سب کو تہس نہس کر دے گی۔

اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نزہت کی بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ صوفشاں خود گھر چھوڑ کر گئی ہے۔

”مجھ پر اعتبار نہیں تو سی سی ٹی وی فوٹیج نکلوا کر دیکھ لو۔ وہ خود گئی ہے اور کہاں گئی ہے، یہ میں نہیں جانتی۔“

”دعا کرو نزہت! میری بیٹی مجھ سے صحیح سلامت آ ملے ورنہ میں تمہارا جو حشر کروں گا، تمہاری سوچ بھی نہیں ہو گی۔“ اس کے انداز سے ٹپکتی سفاکیت سے نزہت کی روح تک کانپ گئی تھی۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم... تم نے جو جو کرنے کی کوشش کی ہے میں سب جانتا ہوں۔ میں نے اپنی بیٹی کی طرف سے آنکھیں بند نہیں رکھیں اور اگر اس کے غائب ہونے میں تمہارا ہاتھ ہوا تو مجھے تمہیں پولیس کے حوالے کرتے ہوئے ذرا سا بھی افسوس نہیں ہو گا۔“

یہ بات کہتے ہوئے بھی اسفند کو یقین نہیں تھا کہ واقعی صوفشاں کی گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے، وہ اسے ناپسند کرتی تھی لیکن اس حد تک وہ نہیں گر سکتی کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کچھ غلط کر سکے۔ پھر مین گیٹ کے سی سی ٹی وی میں اس نے صوفشاں کو خود منہ لپیٹ کر بیگ لیے جاتے دیکھا تھا۔

اس نے پولیس کو انوالو نہیں کیا تھا لیکن اپنے ذاتی ذرائع سے اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جانے وہ پاتال کی کون سی گہرائی میں جا چھپی تھی کہ اس تک جانے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

اور جب وہ ہر طرف سے قریباً ناامید ہو چلا تھا تو اب اس کا نشان ملا تھا۔ گھر کی ملازمہ عید کی چھٹیوں میں کسی عزیز کے گھر گئی تھی اور وہیں اس نے صوفشاں کو دیکھا تھا۔

تنگ سی گلی سے گزرتے وہ اپنے ساتھ چلتی لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ جتنی دیر میں ملازمہ نے اس کی آواز اور چال ڈھال سے اسے پہچانا، وہ سڑک پر کھڑے رکشے تک جا پہنچی تھی۔

”میں صاب جی آواز دی صوفی بی بی۔ اس نے سنا ہی نہیں، رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشے والا کوئی جانن والا لگ را تھا۔ وہ جی بس اک منٹ میں نکل گئے۔“

ہاں، یہ بہتر ہوا کہ اس نے رکشے کا نمبر نوٹ کر لیا تھا اور اس کے بعد سب آسان تھا۔

☆☆☆

آنچل میں زندگی کے کانٹے نہ پھول ہیں
کچھ خواب تھے سو آج وہ راہوں کی دھول ہیں
اک وقت تھا کہ نام سے پاتے تھے زندگی
اور آج ان کو دیکھ کر کتنے ملول ہیں

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی اسفند کی تصویر پر نظریں جمائے نزہت جانے ماضی کے کس دریچے کو وا کیے بیٹھی تھی۔ جب ضوفشاں نے اسفند کے ساتھ گھر میں قدم رکھا تھا۔ وہ وقت اس کے لیے یوم حساب ہوا تھا۔ وہ اندر تک کانپ گئی تھی، آنے والے لمحوں کا سوچ کر۔ تو وہ فری کے بعد فری کی بیٹی کے سامنے بھی ذلیل و رسوا ٹھہری۔ اس عمر میں جب بالوں میں چاندی جھلکنے لگی تھی، کیا ہو سکتا تھا لیکن اسفند کی پہلی بات نے ہی اسے گرداب سے نکال کر سنسان اندھیرے جزیروں پر لے جا پھینکا تھا۔

"میرا دل چاہا تھا، میں تمہیں گولی مار دوں یا تمہارا گلا دبا کر، رفتہ رفتہ تمہاری جان نکلنے کا منظر دیکھوں۔ جیسے تم میری بے بسی کا تماشا دیکھتی رہیں۔ تم سے کس نے زبردستی کی تھی مجھ سے شادی کے لیے؟ میری محبت سے مجبور ہو کر تم نے خود مجھ سے شادی کی خواہش کی تھی، ایک بچی کا باپ ہونے کے باوجود، یاد ہے؟" وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"ہاں اس بات سے بہت کچھ یاد آیا تھا اسے۔ وہ عذاب جو اس کے چھن جانے پر جان پر گزرے تھے اور وہ بھی جو اس کے ساتھ اس گھر میں گزرے۔ تو وہ جانتا تھا، وہ اس کی محبت میں مبتلا رہی ہے۔ اس کے باوجود اس نے جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا،

رائیگانی کا دکھ ایک اور طرح سے اس پر وارد ہوا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اسفند کو کبھی دکھائی نہیں دی لیکن وہ اسے دکھائی دیتی تھی۔ اسے سمجھتا بھی تھا۔ لیکن وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔

ایک جیتے جاگتے وجود کی نفی کتنا مشکل کام ہو سکتا ہے۔۔ وہ سمجھ سکتی تھی لیکن وہ شخص بڑی سہولت سے یہ کرتا رہا تھا۔ وہ اسے برا بھلا کہتا رہا۔ آخر میں اس نے اسے گھر سے نکل جانے کا کہا تھا۔ ساری عمر اس کے گھر میں بے وجہ بیگار کاٹنے کے بعد اب اسے آزادی مل رہی تھی۔ یہی اگر وہ شروع میں کر دیتا تو شاید وہ زندگی کو کسی اور نظر سے دیکھنے کی صلاحیت حاصل کر لیتی۔

"تمہارا گھر ہے، میرا کیا ہے۔ میرا جرم تمہاری عدالت میں ثابت ہوا اور دنیا کی ہر عدالت میں یہی فیصلہ ہو گا لیکن جو تم نے کیا، جو تم نے میرے ساتھ کیا۔ اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم سب ایک ہی نیچ ذات کے نکلے۔ کم ظرف... میں بھی تم جیسی ہی ہوں۔ پھر اس گھر سے میں ہی کیوں نکلوں؟ تم بھی میرے ساتھ نکلو۔"

الجھے بکھرے بالوں کے ساتھ خلاؤں میں نظریں جما کر بولتی وہ جیسے اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

"تم جانتے تھے، میں تمہیں چاہتی ہوں اور آج میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں، میری یہ چاہت یک طرفہ نہیں تھی، پھر وہ فری.. وہ تمہیں پتنگ بنا کر لے اڑی۔ تم اس کے ساتھ چل دیے۔ تمہیں تو مجھ سے بہتر مل گئی تھی، تم مجھے کیوں یاد کرتے؟ لیکن میرے پاس کیا تھا؟ ہاں یہ میری غلطی کہ فری کے بعد بھی تمہاری محبت کے پاگل پن میں تم سے شادی کر لی۔ مجھے کیا ملا؟ سوتن کا دکھ؟ تمہاری بے اعتنائی اور بے رخی؟ تب میرا کیا جرم تھا؟ تم سے محبت... تم سب نے مجھے انسان سمجھا ہی نہیں۔ ایک کے بعد ایک شخص نے اپنے بدلے نکالے مجھ سے.."

"میں نے تمہیں یہ بات پہلے ہی بتا دی تھی تم نے سوتن کو کیوں قبول کی؟ رہی چاہت کی بات تو وہ صرف پسندیدگی تھی۔ فری میری محبت تھی جو مجھے اس سے آج بھی۔"

جب خدو خال بگڑ جائیں تو آئینے تکلیف دیا کرتے ہیں اور وہ اس مسخ شدہ شکل کے سامنے آئینہ رکھنے کی غلطی کر رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتا۔

"تم نے بھی تو یہی کیا ناں؟ سارے بدلے

ضوفی سے نکالے۔"

"میری عمر جانتے ہو کتنی ہے؟ اس میں سے صرف وہ چند دن منفی کر دو جو فری سے پہلے تم مجھ سے ملتے رہے.. اس کے علاوہ کی زندگی میں میں نے جہنم جھیلے ہیں۔ اپنی زندگی کو عذاب کی طرح بھگتا ہے میں نے۔ میرے اندر اتنی آگ ہے کہ آج بھی قبر سے نکال کر ان کے مردوں کو جلا دوں جنھوں نے مجھے یہ دوزخ بخشے ہیں۔ میں ہوں ایسی اور تم تو سب جانتے تھے۔ تم سے بھی مسیحائی نہ ہو سکی بلکہ تمہارا رویہ میری زندگی میں خوشیوں کی خواہش کے تابوت کی آخری کیل ہے۔ تم نے سب سے بڑھ کر اذیت دی مجھے۔ کچھ نہیں دے سکے تو میری گود کو سونا کرنے کا حق کس نے دیا تمھیں؟ نہیں اسفند . . یہاں نہیں۔ میں روزِ حشر تمہارا گریبان پکڑوں گی۔"

"روزِ محشر میں دامن پکڑو گی کیا میں نے تمھیں دوھکا دیا؟ جھوٹ بولا؟ کیا تم اس سے بات سے آگاہ نہیں تھیں۔ دھوکا تم نے مجھے دیا۔ تم ضوفشاں کی ماں بن کر میری زندگی میں آئیں لیکن ایک دن، ایک لمحہ کے لیے اس کی ماں نہ بن سکیں۔"

وہ کمرے میں چلی آئی۔

اسفند نے اس کا وجود ہی بنجر کر دیا تھا۔ چند دن کی محبت نے اس کی پوری زندگی نگل لی تھی۔ اس وقت اگر اس نے وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا تو آج زندگی مختلف ہوتی۔ بلکہ وہ وقتی جذبہ کہاں تھا؟ وہ تو ایک مستقل درد تھا سینے میں جو آج بھی اپنی جگہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

وہ مما اور فری کے بعد ڈیڈی سے بھی ناراض تھی۔ وہ اس کا خیال کیوں نہیں رکھ سکے تھے۔ اسفند سے شادی کے بارے میں سوچتے اس نے اندر کہیں یہ تہیہ کیا تھا کہ ایک دن آئے گا جب وہ فری کو اس کے ذہن سے کھرچ دے گی اور پھر اس کے ساتھ زندگی خوب صورت ہو گی۔

ایک عرصہ پہلے وہ رونا بھول چکی تھی۔ لیکن اسفند کا ضوفشاں کے لیے التفات اس کے سینے میں نیزے کی انی جیسا گڑ جاتا تھا۔ وہ اس آگ میں جلتی تھیں۔ دکھ پر حسد غالب آ گیا تھا لیکن آج وہ بڑے عرصے بعد اسی ٹوٹی پھوٹی نزہت کو محسوس کر رہی تھیں جس کا دل دکھا ہوا تھا۔ اب اس دکھ کے ساتھ بدن پر اتری خزاں کی تھکن بھی تھی۔ اسے علم ہی نہیں ہوا اور وہ رونے لگی تھی۔

بنا آواز کمرے کا دروازہ کھول کر ضوفشاں اندر آئی تھی۔ اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اس نے نزہت کے ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے نہیں پتا فری ماما کیسی تھیں۔ میں نے تو آپ کو دیکھا ہے ماما اور میرے لیے فری ماما آپ سے زیادہ پیاری نہیں ہیں۔ آپ مجھے کیوں نہیں اپنی بیٹی سمجھ سکیں؟ مجھے بتائیں اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھ پر پیار نہیں آیا؟ کبھی نہیں لگا میں آپ کی بیٹی ہوں؟"

وہ کہہ رہی تھی اور نزہت کو یاد آنے لگا تھا جب ضوفشاں چھوٹی تھی۔ وہ کسی کسی وقت اسے سینے سے لگا کر رویا کرتی تھی۔ اس کا منہ چومتی تھی۔ وہ کتنا ہی ناراض ہوتی ضوفشاں اس کی گود سے نکلنے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو نزہت اس کے سامنے رو نہیں پائی تھی۔

"ماما! آپ کو کیا ہوا ہے؟"

"میری ماما کو کس نے مارا ہے؟ میں پاپا سے کہوں گی اس کی خوب پٹائی کریں۔"

کھوٹ اس کے اپنے دل میں تھا، بچی کیا جانتی تھی۔ وہی بچی آج اتنا کچھ ہو جانے کے بعد ایک بار پھر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔ قسمت نے اس کے ساتھ جو کیا، وہ اس کا زیر ہر سود سمیت اس لڑکی کی زندگی میں منتقل کرنے والی تھی۔ فری یہاں بھی جیت گئی تھی۔ نزہت کا زہر دم توڑ گیا تھا۔ وہ لڑکی محبت کا آبِ حیات بن کر اس کے سارے زخموں کی مسیحائی کر رہی تھی۔

"جو ہو گیا اسے بھول جائیں آپ نے مجھے بیٹی نہیں سمجھا مجھ سے نفرت کی لیکن میں آپ سے

نفرت نہیں کرسکتی میں تو آپ کو ماں ہی سمجھتی رہی تھی۔" "کیوں کیا آپ نے ایسا؟ وہ جانتے بوجھتے یہ سب پوچھ رہی تھی۔ نزہت کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس عمر میں خود احتسابی اور سود و زیاں کے حساب بڑے مشکل ہو جاتے ہیں۔ حق پر ہوتے ہوئے بھی ان کھاتوں پر نظر کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور وہ تو پھر کلی طور پر حق پر نہیں تھی۔ آنسوؤں کی روانی میں شدت آگئی تو اس نے ضوفشاں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیا۔

☆☆☆

کسی بھی شے کا خیال جتنی راحت دیتا ہے اسفند کی مسلسل تلاش سے خوف زدہ ہو کر وہ جب ضوفشاں کے اس گھر میں واپس آنے کا سوچتی تو ایک قیامت کا تصور ذہن میں آتا تھا لیکن ضوفشاں کے رویے نے ساری کہانی بدل دی تھی۔ وہ ہر وقت نزہت کے آس پاس رہتی، اسے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مصروف کرنے کی کوشش کرتی۔ نزہت کو اس کی کوششیں سمجھ میں آتی تھیں اور اسے۔ اس نے بھی اسے محبت کا اظہار کرنے کا اعتماد ہی نہیں دیا تھا اور اب اس کے ہر ہر عمل سے محبت پھوٹتی تھی۔

"ماما! آپ نے اس سال کوئی سوٹ نہیں سلوایا گرمیوں کا۔ چلیں کچھ شاپنگ کرکے آتے ہیں۔"

نزہت نے نہ نہیں کی تھی۔ محبتیں انمول ہوتی ہیں۔ محبت چاہے ماں باپ کی ہو، بہن بھائیوں کی ہو، اولاد کی یا شریکِ سفر کی۔ ساری محبتیں انمول ہوتی ہیں۔ اسے آج احساس ہوا تھا کہ ایک محبت کے سہارے زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ اگر مما یا فری اس سے محبت کرتی ہوتیں یا اس کے اپنے ڈیڈی.. تو اسفند کی ناقدری کا دکھ ایسا نہ ہوتا۔

ضوفشاں نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا تھا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا۔ کپڑوں کے بعد جوتے، ہینڈ بیگز اور جیولری۔ کتنا کچھ وہ خریدتی چلی جارہی تھی۔

"میں اس عمر میں یہ سب کیا کروں گی؟ مجھے نہ کہیں جانا ہوتا ہے نہ..."

"تو آپ جایا کریں ناں۔ پاپا سے کہوں گی آپ کو کہیں لے کر جائیں یا ایسا کریں وبا کی صورتحال بہتر ہوتی ہے تو کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔"

اسفند کی خواہش دل سے نکل گئی تھی اور وہ زندگی سے۔ پچھلے کتنے دنوں سے ان کا تعلق سرسری بات تک بھی نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کے ساتھ رہتے اسے مِس کرنا بڑا سکون آمیز ہوتا ہے اور نزہت اب اسی سکون سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ آگیا تھا کیسے عورتیں طلاق کے بعد یا شوہر کے گزر جانے کے بعد اپنے بچوں کے سہارے زندگی گزار دیتی ہیں۔ بچے پیارے ہوتے ہیں اور ضوفشاں جیسی اولاد قسمت والوں کو ملتی ہے۔ آج وہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتی تھی یہ لڑکی قدرت نے اسے دی تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں خوش تھی کہ قدرت نے اسے تلافی کا موقع دیا تھا۔

انہیں گاڑی سے نکلتا دیکھ کر اسفند ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ سالوں پہلے جب کالج میں نزہت کی اور اس کی دوستی ہوئی تھی۔ ان دنوں بھی وہ کھل کر کھلکھلا کر ہنستی تھی اور اس کے بعد زندگی نے اور خود اس نے جو نزہت کے ساتھ جانے ان جانے کیا، اس نے بھی اسے مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا کجا ایسے کھل کر ہنستے دیکھنا۔ وقت کی نقوش سازی اپنی جگہ لیکن چند ایک دن میں اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ بہاروں نے بڑی دیر کردی تھی ان لبوں پر غنچے کھلانے میں۔ ان کے جانے کے بڑی دیر بعد تک وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ آنے والے دنوں میں اس نے گھر کے دیوار و در تک میں تبدیلی محسوس کی۔ اب اس گھر میں دبی دبی ہنسی گونجتی تھی۔ ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں کے اوقات میں خصوصی طور پر نشست ہوتی تھی۔ اونچی آوازوں میں تبصرے ہوتے تھے۔ یہ کون سی ہوا تھی جو سب بدلتی جارہی تھی۔ ضوفشاں اس کے پاس بھی بیٹھتی تھی، اس کی بیٹی تھی لیکن آج کل معلوم نہیں کیوں وہ نزہت کی

زیادوگی لگنے لگی تھی۔ جو بھی تھا، زندگی اب اتنی خشک نہیں لگتی تھی۔ یوں جیسے تازہ ہوا کا جھونکا برسوں بعد کسی ویران مکان میں خوشبوئیں بھر دے۔

☆☆☆

وہ آخری رات اعصاب پر بہت بھاری تھی جس کی صبح فری نے سی سیکشن کے لیے جانا تھا۔

"اسفند! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے سورج کی طرح میری سانسیں بھی ڈوب رہی ہوں۔" ہر تھوڑی دیر بعد وہ ذرا سے ردوبدل کے بعد یہی باتیں کر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا یار۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے دروزہ سے بچنے کے لیے تمہی ساری خواتین تو اپنی مرضی سے اس طرف چلی جاتی ہیں۔" وہ خود بھی ڈرا ہوا تھا لیکن اسے حوصلہ بھی تو دینا تھا ناں۔

فری نے جھرجھری لی۔ "تمہیں ایک بات بتاؤں؟ مجھے بھلا کس شے کا خوف ہے؟ مجھے نزہت کی خاموشی سے خوف آتا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی گہری لگتی ہیں۔ اسفند مجھے اس کی آہ لگنے سے ڈر لگتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں میں اس لیے تمہاری جانب نہیں آئی تھی کہ تمہیں اس سے چھین سکوں۔ میں تو بس.. مجھے تمہارے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو میں مر سکتی تھی۔ شاید تم بھی یہ بات نہ سمجھ سکو لیکن نزہت تو بالکل نہیں سمجھ سکے گی۔ اسے لگے گا۔ میں نے اس کی ضد میں تمہیں اپنایا ہے، تمہیں جان بوجھ کر اپنی طرف راغب کیا ہے۔"

وہ اسے پہلے ہی بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اسفند کے لیے اپنے جذبات.. بنا کسی لگی لپٹی نزہت کا سوتیلا ہونا اور اپنا رویہ۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی صاف گو اور اپنے بھلے برے کو اون کرنے والی۔ خود اسفند چونکہ نزہت کے ساتھ ابھی تعلقات کے آغاز پر تھا تو تھوڑا بہت تو وہ بھی محسوس کر سکتا تھا۔ نزہت ایک جنگل جیسی تھی۔ اندر ہی اندر بہت ساری خوب صورتیوں سے مالا مال

لیکن ان خوب صورتیوں کی تلاش میں نکلنا پڑتا تھا۔ اس تیزی کے دور میں کون رکتا؟ اور فری.. وہ ایک تند خو ندی جیسے سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جاتی تھی۔

اس نے اسفند کو رکنے اور ٹھہر کر سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ بے بسی سے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہا۔ وہ نزہت کا تڑپنا محسوس کر سکتا تھا۔ شادی پر جس طرح وہ سرے سے ہی دکھائی نہیں دی تھی اور بعد میں گھر جانے پر جس طرح خاموشی سے انہیں دیکھتی۔ واقعی جھرجھری آ جاتی۔ کبھی کبھی لگتا تھا۔ اس نے بھی اس کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن یہاں وہ خود کو تسلی دے لیتا کہ ان کے درمیان کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اسفند! جو جان بوجھ کر کیا اور جو انجانے میں ہو گیا۔ پھر فون ملا کر مما سے کہنا کہ اس سے بات کروا دیں۔"

آنے والے کتنے سال اسفند کو اس نمبر ملانے کا دکھ رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیا اور جب نزہت کال پر آئی تو ریسیور فری کو تھما دیا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس کے بعد تم چاہو تو فون کرنا ورنہ نہیں۔" ریسیور پکڑتے اس نے کہا تھا۔

اس کے بعد وہ نہیں بولی۔ کوئی معافی تلافی نہیں۔ کچھ اچھا برا نہیں۔ اس مختصر کال کے کٹنے پر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

"وہ کہتی ہے، میں اس کے لیے مر چکی ہوں اور یہ کہ مجھے مر ہی جانا چاہیے۔"

اسفند کو غصہ آیا تھا اس بات پر۔ وہ اسی وقت فون کر کے اسے کھری کھری سنانا چاہتا تھا۔

اور جب اگلے دن آپریشن تھیٹر میں اس کے سارے خدشات سچ ہو گئے تو اس نے نزہت سے جی بھر کر نفرت محسوس کی تھی۔ اس سے شادی کرنے کا

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جیسے وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بات کرتی، وہ زیر ہو گیا تھا۔

ذہن میں بڑی متضاد سوچیں تھیں۔ ضوفشاں کی فکر اور ایک خواہش کہ شاید وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی ضوفشاں کو ماں کی محبت دے کر تلافی کرے۔ ایک نفرت کہ اس کا زندگی میں حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اسے سزا دے سکتا تھا۔ اپنی اور فری کی خوشیوں کو کھا جانے کی پاداش میں وہ اسے رلا سکتا تھا۔ سچ بات تو یہ کہ وہ کچھ بھی نہیں پار رہا تھا اسے کرنا کیا ہے۔ زندگی نے جو انتخاب اس کے سامنے رکھے تھے، ان میں سے کوئی بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر جو ہوا ہوتا چلا گیا۔ بنا کسی منصوبہ بندی کے بس ہو گیا۔

اور پھر فری کے ساتھ اس کمرے میں گزری رات بیس سال بعد دوبارہ زندہ ہو کر آ گئی۔ کمرے میں قرنطینہ ہوئے نزہت شاید اسی خوف سے گزر رہی تھی جس سے اس رات فری گزری تھی۔ فری کے لیے ایک رات تھی جبکہ یہاں چار راتیں گزر چکی تھیں۔ فری کے ساتھ وہ تھا جبکہ نزہت اکیلی تھی۔ ہر طرح سے اکیلی۔۔

اس نے ضوفشاں کو سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس اسٹور نما کمرے کے بند دروازے کے باہر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

"ماما۔۔ میں یہاں ہوں۔ آپ کے پاس ہوں۔ آپ نے پریشان نہیں ہونا۔ میں دعا کر رہی ہوں ناں آپ کے لیے۔"

"میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی سے بہت پیار کیا ہے۔" بالکل ہموار لہجے میں کہا یہ جملہ اسفند نے بھی سنا تھا۔ اسے اس عورت کی برداشت پر حیرت ہوئی تھی۔

یہ دل کا معاملہ تھا اور دلوں کے معاملے عجیب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ساری عمر کی وضاحتیں بیکار جاتی ہیں اور بعض اوقات دل کا قفل لاکھ زنگ آلود ہونے کے باوجود یونہی ایک ذرا سے جھٹکے سے کھل جاتا ہے۔ اس کے دل کا قفل بھی کھل چکا تھا۔ ماسٹر کی سے تالا کھول کر وہ اس کمرے میں چلا گیا۔

"قدرت نے دو بار ہمیں موقع دیا لیکن ہمارے مقدر میں ایک ساتھ زندگی گزارنا نہیں لکھا تھا۔ شاید ایک ساتھ مرنا لکھا ہو۔"

☆☆☆

کمرے کے کسی کونے میں رکھا ہوا دیا جیسے پورے کمرے کو مدھم ہی سہی لیکن روشنی سے بھر دیتا ہے ضوفشاں کی موجودگی نے بھی گھر کو ایسے ہی بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی آسمان کا چاند تھی، سب محسوس کر سکتے تھے لیکن اس کے باپ کو دیکھ کر فصیح حیدر کو کوئی تشبیہ نہیں سوجھی تھی۔ ضوفشاں کو اس جیسے باوقار شخصیت کے مالک انسان کی بیٹی ہونا ہی سجتا تھا۔ اس کا جانا اس گھر پر ایسا سانحہ تھا کہ کتنے دن تک دروازے پر آئی پولیس سے ہونے والی بدنامی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ محلے والیاں اماں سے پوچھتی تھیں۔

"وہ تیرے کسی بھائی کی بیٹی نہیں تھی، تو نے جھوٹ بولا زبیدہ۔" اور اماں کو ماننے میں کوئی عار نہیں تھا۔

"ایسے سچ کا کیا کرنا جو کسی کی عزت یا زندگی کو خطرے میں ڈالے۔ ایسا سچ تو فساد ہوا ناں۔ تو جو مجھے ٹھیک لگا، میں نے کر لیا۔" وہ مطمئن تھیں۔

دروازے پر باپ کو دیکھ کر جو اس کی حالت ہوئی تھی اور جیسے وہ جا کر باپ سے لپٹی تھی، ان کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

"رب کسی دھی، پتر کو ماں باپ کی ایسی جدائی نہ دکھائے۔"

جانے والی ایسی گئی کہ ان کا گھر خالی کر گئی تھی۔ فصیح حیدر کے لیے سارے موسم دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔۔۔ جب وہ یہاں تھی اور جب وہ یہاں نہیں تھی۔

اک ہجر کا موسم، اک تیری یاد کا موسم
ملتے ہیں تو بن جاتا ہے برسات کا موسم

زندگی کا شعور کہتا تھا کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔لوگ ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں۔زندگی گزر جاتی ہے۔سب ٹھیک ہے لیکن یہ حقیقت بھی جاننا تھا۔زندگی کے وہ معنی بھی نہیں رہتے۔وہ جا کر بھی وہیں تھیں۔اس کے جانے کے بعد یہ دوسری عید گزری تھی اور اماں ابھی تک بات بات پر اسے یاد کرتی تھیں۔

''اتنا سوہنا قرآن پڑھنے لگی تھی۔اتنے شوق سے تو آج تک میری اپنی اولاد نے نہ پڑھا، جتنی چاہ سے وہ کلام پاک کھولتی تھی۔''

''بڑی بھولی اور معصوم روح تھی۔جہاں بھی ہو اللہ اسے خوشیاں دے۔''

نوریہ اسے اور اس کے کپڑوں کو یاد کرتی۔عید کے بعد اس نے مشکل سے اس کا دیا سوٹ دو ایک بار پہنا تھا اور پچھلی عید تک تو اماں بھی منتظر تھیں کہ شاید وہ آئے لیکن اسے نہیں آنا تھا سو وہ نہیں آئی۔

زندگی ان کے لیے بھی یہاں رکی نہیں تھی۔فصیح کی سرکاری نوکری لگ گئی تھی۔دفتر میں کام زیادہ نہیں تھا اس لیے بڑی آسانی سے اس نے شام کی کلاسز میں ایم بی اے کے لیے داخلہ لے لیا تھا۔صحن کا ایک حصہ پکا ہو گیا تھا اور باورچی خانے کو باقاعدہ بنوا لیا گیا تھا۔بظاہر سارے معاملات ٹھیک چل رہے تھے لیکن سب جانتے تھے، کہیں کچھ کمی ہے بلکہ جانتے تھے کہ کس کی کمی ہے۔

سامعہ چھوٹی تھی لیکن بے جھجک اس سے بات کرتی تھی۔عید کا تیسرا دن تھا اور فصیح جامن کے درخت کے پاس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔عشاء کی اذان ہونے والی تھی۔سامعہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''میں ایک بات سوچ رہی تھی بھایا۔''

''ہوں بولو۔'' فون بند کر کے اس نے تکیے کی دوسری جانب رکھا۔

''وہ ایک تھی.. پھر بھی ہم سب اس کی کمی محسوس کرتے ہیں، آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ہم اتنے ہیں.. کیا وہ بھی ہمیں یاد کرتی ہوگی؟''

''بھولتا تو کوئی بھی نہیں ہے لیکن یاد کرنے کے انداز بدل جاتے ہیں، معنی بدل جاتے ہیں۔''

دل میں درد کی ایک لہر اٹھی تھی۔کتنا مشکل ہوتا ہے خود کو یہ بتانا کہ کہیں ہم اہم نہیں رہے۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' وہ ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ رکھے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں یاد ہے، کچھ سال پہلے جب ہم ابا کے دوست کے گاؤں گئے تھے اور تم ان کی بکری کا بچہ لینے کے لیے مچل گئی تھیں؟''

سامعہ کو ہنسی آ گئی تھی۔''یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ اماں کے منع کرنے پر میں کتنا روئی تھی اور کیسے ابا کے بازو سے لٹکتے ہوئے اسٹاپ تک آئی تھی۔''

''وہ بکری اور اس کی محبت یاد ہے؟''

اس سوال پر سامعہ چپ رہ گئی تھی۔

''ہم بھی کہیں نہ کہیں اسے یاد ہوں گے اور وہ ان دنوں کو یاد کر کے جاتے ہنستی ہو کہ کیا دن تھے جب اس کچے مکان میں اسے رہنا پڑا۔''

یہی سوچ اور یہی باتیں تھیں جو فصیح کو اس کی جانب قدم بڑھانے سے روکتی تھیں۔مجبوری میں اگر اسے چند دن یہاں قیام کرنا پڑا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہنسی خوشی ساری زندگی یہاں گزارنے پر راضی ہو جائے گی۔مجبور اور آزاد شخص کے فیصلوں میں فرق ہوتا ہے اور فصیح کے پاس تھا ہی کیا۔چند چور نگاہیں، چند چھپی مسکراہٹیں اور جگنو جیسے چند الفاظ۔وہ کیسے اس کی تلاش میں نکلتا کہ یہ جگنو اسے منزل تک پہنچا بھی دیتے تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ آگے ملنے والی کی مرضی ابھی بھی وہی ہوگی جو اس وقت تھی جب وہ یہاں تھی۔

جب اس کا باپ اسے یہاں سے لے کر گیا تھا تو اس نے اپنا کارڈ دیا تھا۔

''میں آپ کا مقروض ہوں اور یہ قرض کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔اس کے باوجود میں اگر آپ لوگوں کے کسی کام آ سکا تو مجھے خوشی ہوگی۔امید

کرتا ہوں ایک بار تو مجھے خدمت کا موقع ضرور دیں گے۔"

وہ کارڈ ابھی بھی اس کے والٹ کے کسی خانے میں موجود تھا۔نہیں تھا تو یقین۔اسے ایک بار تو مڑ کر دیکھنا چاہیے تھا لیکن اس نے شاید بھلا دیا تھا اور جو بھول جانا چاہیے۔اسے بھولنے کی آسانی دینے سے اپنے لیے آسانی ہوتی ہے۔

☆☆☆

تمبر کے بے رونق دنوں میں یونیورسٹی سے واپس پر وہ گھر نہیں گئی تھی بلکہ ان راستوں کو کھوجنے لگی تھی جہاں کبھی منزل کا شائبہ محسوس ہوا تھا۔خیال ایسے دنوں میں ایسی تپش جاتی تھی۔

پچھلے ہفتے ماما بتا رہی تھیں کہ پاپا کے ایک کاروباری دوست اس کے رشتے کے لیے گھر آنا چاہتے تھے۔جلد یا بدیر یہ وقت آنا ہی تھا لیکن اسے لگا جیسے یہ سب اچانک ہو گیا ہو۔ماما نے اس سے پوچھا تھا "اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو۔نہیں تو انہیں بلا لیں؟"

اور وہ چپ بیٹھی رہی۔پاپا نے کتنی بار اس سے کہا تھا "جب نزہت نے مجھے کہا کہ تم کسی لڑکے کے لیے گھر چھوڑ گئی ہو تو میں نے کہا ضوفشاں میری بیٹی ہے۔وہ ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔"

اب معلوم نہیں "ایسا کچھ" سے ان کی کیا مراد تھی لیکن وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کہہ سکی۔کہتی بھی تو کس بل پہ؟

اتنا وقت گزر گیا، ان میں سے کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔یہاں آنے کے بعد کتنا وقت تو اسے سب سیٹل کرنے میں لگ گیا تھا اور پھر ایک اور بات بھی تھی۔اماں نے ایک بار اس سے کہا تھا۔

"ہم غریب لوگ ہیں اور ہمارے پاس بس عزت ہی ہے۔ہم تمہیں عزت دیں گے لیکن تم ہمیں بے عزت نہ کرنا۔"

ان کے دروازے پر پولیس کا مطلب وہ سمجھتی تھی۔پھر جب وہ اس گھر سے باہر نکلی تو ارد گرد لوگوں کا ہجوم تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا۔وہ انہیں بے عزت کر کے آئی تھی۔وہ کیسے ان کے پاس واپس جا سکتی تھی۔

اب اتنا وقت گزر چکا تھا۔زندگی آگے بڑھ چکی تھی۔ہو سکتا ہے وہ ان کی زندگی کا وہ باب بن گئی ہو جسے کوئی بھی دہرانا نہ چاہتا ہو۔ایک سے بڑھ کر ایک اندیشے تھے۔

تب اس نے ماما کو بتایا تھا۔

"ہو سکتا ہے تمہاری امارت سے متاثر ہو کر..."

"نہیں ماما! ایسی بات نہیں ہے۔میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔میرا بیگ.. اس میں جیولری تھی اور کیش بھی۔اتنے دن وہاں رکھا رہا، کسی نے دیکھا تک نہیں۔ماما وہ اور طرح کے لوگ ہیں۔"

"اور تمہیں لگتا ہے جس طرح کے وہ لوگ ہیں تم وہاں خوش رہ سکو گی؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلائی تھی۔

"تو پھر تم خود وہاں جا کر دیکھ سکتی ہو کہ وہاں تمہاری جگہ ہے بھی یا وہ موو آن کر چکا ہے۔زندگی کے ساتھ زہریلے تجربے نہیں کرتے۔ایک بار کوشش ضرور کرتے ہیں اپنی خوشی کے لیے۔"

اور پھر وہ لوٹ آئی تھی اسی لباس میں جو اسے اماں نے عید پر بنوا کر دیا تھا۔دروازے سے اندر داخل ہونے میں ایک جھجک مانع تھی لیکن جب وہ اندر داخل ہوئی تو اسے پتا چلا اس گھر میں وقت رک رک کر چلتا تھا۔اب بھی سب وہیں پر ٹھہرا ہوا تھا۔

گھر میں آنے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے قطع نظر گھر والے سب ویسے ہی تھے۔ایک بار پھر اس گھر کے مکینوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے گلے لگایا تھا۔وہ صحن میں جامن کے پیڑ تلے بچھی بان کی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔شمسہ اور نوریہ تو ایسے ملی تھیں جیسے سگی بہنیں ہوں۔

"ہم سب نے بہت یاد کیا تمہیں۔ہمیں لگا تم

ہمیں بھول گئی ہو۔"

"اماں نے تو پچھلی عیدوں پر آپ کے لیے سوٹ بھی بنوا کر رکھے تھے۔"

سامعہ کے کہنے پر اماں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ "اس عید پر بھی بنوانا ہے۔ مجھے پتا تھا میری بیٹی آئے گی ضرور۔"

اسے لگا ہی نہیں وہ کبھی وہاں سے گئی بھی تھی۔

شمسہ اور نوریہ کے ساتھ مل کر اس نے کھانا بنانے میں مدد کی تھی۔ دھیان سارا اس کی طرف تھا جس کا کسی نے نام تک نہیں لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آرام کا بہانا کر کے اسی کمرے میں چلی آئی تھی جو کبھی اس کے استعمال میں رہا تھا۔

سب کچھ ویسے کا ویسے تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ بستر پر بیٹھی تو کھڑکی کی سلاخوں میں ابھی تک ان نگاہوں کا لمس موجود تھا جن سے گال تمتمانے لگتے تھے اور جن کے شوق سے پلکیں بوجھل ہو کر جھک جاتی تھیں۔

آئینہ دیکھ کر اسے لگا جیسے وہ کتنے وقت سے کسی قدیم کہانی کے کردار کی طرح اس میں مقید ہے۔ آئینے میں کہیں وہ عکس بھی سانس لیتا تھا جسے اس نے چھوا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اسے یہاں سے کہیں نہیں جانا تھا۔

☆☆☆

فصیح حیدر کے پاس دروازے کی چابی تھی لیکن اسے اچھا لگتا تھا جب اس کی دستک پر بہنیں بھاگی آتی تھیں۔ سامعہ نے دروازہ کھولا تو ہمیشہ کی طرح رک کر حال چال پوچھنے کے بجائے فوراً باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔ ذرا کی ذرا حیرت ہوئی تھی لیکن پھر با آواز بلند سلامتی بھیجنے کے بعد وہ اماں اور ابا کے پاس کمرے میں چلا گیا۔

"جا میرا پتر! پہلے کپڑے بدل لے۔ پانی پی پھر کھانا کھاتے ہیں۔"

وہ ان کے پاس سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ کھلے دروازے پر نیلا جالی دار پردہ پڑا ہوا تھا اور زیرو پاور کے بلب کے ساتھ کمرے کا پنکھا چل رہا تھا۔ اب وہ زیادہ حیران ہوا تھا کہ گھر میں کوئی بھی اتنا لاپروا تو نہیں تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے اس نے گلے سے ٹکٹائی نکالی اور ساتھ ہی بتی جلا دی۔

گزرے سالوں میں اس نے کتنی بار اسے یہاں اس گھر میں اس کمرے میں چلتے پھرتے ہوئے تصور کیا تھا لیکن یہ تصور کبھی اتنا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ مجسم دکھائی دے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک جھمکا کان میں تھا اور دوسرا وہ ہاتھ سے نیچے گرا بیٹھی تھی۔ ضوفشاں نے وہ جھمکے بیگ میں رکھے تھے اور اب پہن کر چیک کرنے لگی تھی کہ اگر وہ اسے ان جھمکوں میں دیکھے تو وہ کیسی لگے گی اور وہ ٹکٹائی ہاتھ میں پکڑے حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ ضوفشاں نے پہلی بار اسے پینٹ شرٹ میں ایسے تیار دیکھا تھا۔ بال کچھ کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر اشتیاق اور غیر متوقع خوشی کے عکس اتنے پیارے تھے کہ وہ دیکھتی چلی گئی۔

"نظر لگا دیں گی آپ۔" مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہتے وہ آگے بڑھا تو ضوفشاں کی نگاہ از خود جھک گئی۔ نیچے بیٹھ کر اس نے جھمکا اٹھایا تو ضوفشاں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

"کیا؟" وہ انجان بنا پوچھ رہا تھا۔

"میرا جھمکا۔"

جس مان سے اس نے "میرا جھمکا" کہا تھا، فصیح حیدر کا دل جھومنے لگا تھا۔ تو یہ معمولی سے جھمکے اس نے یونہی تو سنبھال نہیں رکھے تھے۔

"پہلے میری چیزیں لوٹائیے جو جاتے جاتے یہاں سے لے گئی تھیں۔"

"یہ جھمکے میرے ہیں۔ یہ تو واپس نہیں ملیں گے۔"

"اور میرا سکون؟"

دھڑکنیں منتشر کرتا گمبھیر لہجہ ضوفشاں کے گالوں

پر لالی بکھیر گیا۔

''اتنا عزیز تھا تو تلاش میں نکلتے۔ اب نہیں ملنے والا۔''

''میں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

''کریں وعدہ۔'' بڑی برجستگی سے جواب آیا۔ فصیح کھل کر ہنسا تھا اور اس کے لبوں پر بھی شرمگیں مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''وعدہ... یہ جھمکا اب میں خود اس وقت پہناؤں گا جب مجھے حق حاصل ہوگا اور تب تک یہ میرے پاس رہے گا۔ ڈن کریں؟''

اور یہ جھمکا نہیں تھا۔ یہ پہلے فصیح کا دل تھا جو وہ لے گئی تھی اور اب ضوفشاں کے وجود کا حصہ تھا جو فصیح نے رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہونے کو تھا۔ ضوفشاں نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اماں اعتکاف پر بیٹھنے والی ہیں اس لیے وہ دونوں ضوفشاں کی عیدی دینے جا رہے تھے۔ اس رشتے میں نزہت کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسفند ہچکچا رہا تھا۔

''میں نے دیکھا ہے وہ گھر اور وہ لوگ۔ وہاں کوئی آسائش نہیں ہے الٹا ڈھیر پریشانیوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔'' سچ بات تو یہ کہ وہ بے یقین تھا یہ بڑے بچپنے کی بات لگ رہی تھی اور بے وقوفی کی بھی۔

''میں آسائشوں والے گھر میں رہ کر بھی خوش نہیں رہی اور تم بھی۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ ہمارے درمیان محبت نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ کوئی وقتی کشش نہیں ہے۔ تین سال ہو چلے ہیں۔ وقتی معاملہ ہوتا تو ختم ہو جاتا کہ ان کا تو رابطہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اپنی زندگیوں کو اپنے کلیہ سے جیا ہے۔ اب یہ زندگی ہماری نہیں ہے۔ اسے اپنی زندگی پر اتنا تو حق ملنا ہی چاہیے۔''

بات جو بھی تھی، یہ اس کا لہجہ تھا جس میں ٹھہرے ہوئے سکون نے اسفند کو پرسکون کر دیا تھا۔ عمر کے اس حصے میں اسے نزہت کے دکھ کا احساس ہوا تھا۔ اب بھی لائٹ براؤن جدید طرز کے شلوار قمیص پر دوپٹہ سلیقے سے کندھوں پر پھیلائے وہ بہت گریس فل لگ رہی تھی۔ وقت کے سارے ستم سہہ لینے کے بعد بھی وہ اپنی عمر سے کہیں کم نظر آتی تھی۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس نے اسفند کی نگاہوں کا خود پر رکنا محسوس کیا تھا اور ان نگاہوں میں ایک تعجب آمیز احساس تھا اور کچھ ستائش بھی۔

''میرا پرفیوم تو نکال دو۔'' جان بوجھ کر وہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھاتا تھا۔

نزہت نے اس کا پسندیدہ پرفیوم نکال کر ڈریسنگ میز پر رکھا اور جانے کے لیے مڑی۔ اس نے نرمی سے اسے کلائی سے پکڑ کر روکا اور اپنے عین سامنے کھڑا کر لیا۔

''وقت کے سیل رواں میں خس و خاشاک کی مانند بہتے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اک تمہیں اب سوچتا ہوں تو کالج کے گراؤنڈ میں گھاس کو نرمی سے سہلاتی لڑکی یاد آتی ہے مجھ سے بہت کچھ غلط ہوا، شاید..... ہی غلط ہوا لیکن اس میں اکیلا ہی قصوروار نہیں تھا۔ تمہارے رویے کا بھی دخل تھا۔ ضوفشاں کے ساتھ تمہارا جو رویہ تھا اس نے میرے دل میں تمہاری جگہ بننے ہی نہیں دی۔ جب جب میں نے تمہاری طرف بڑھنے کی کوشش کی تم کوئی ایسی بات کر دیتیں کہ میرے جذبات سرد پڑ جاتے۔ میں نے تمہارے رویے پر تمہیں کبھی نہیں ٹوکا بس ضوفشاں کے سلسلے میں کبھی تم پر اعتماد نہیں کیا۔ جہاں اعتماد نہ ہو، وہاں محبت کیسے پنپ سکتی ہے۔ اور پھر تم نے ثابت کر دیا کہ میری سوچ غلط نہیں تھی۔ تم نے موقع ملتے ہی ضوفشاں کے ساتھ وہ کیا جو کوئی دشمن بھی کرتے ہوئے سو بار سوچتا۔ لیکن شاید یہ میرے اس ظلم کا ردعمل تھا جو میں نے تمہیں ماں بننے کے حق سے محروم کر کے

کیا۔ اسفند غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن غلط وہ بھی نہیں تھی، اس نے حسد اور نفرت کے جذبے ہی پائے۔ وہی لوٹا دیے۔ اس نے نفرت کو نفرت سے شکست دینا چاہی اگر وہ نفرت کو محبت سے شکست دیتی تو شاید آج خالی ہاتھ نہ ہوتی۔ اسفند نے اسے ماں بننے کے حق سے محروم رکھا تو اس نے بھی اولاد کا دکھ دینا چاہا۔

لیکن اب یہ سب سوچنا بے کار تھا۔ اب دونوں عمر کا ایک بڑا حصہ گزار چکے تھے۔ قدرت نے جو کچھ مقدر میں لکھا تھا اسے بھگت چکے تھے۔

''میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی لیکن اپنے جذبوں کا صحیح اظہار نہ کرسکی اور تم مجھے نہ سمجھ سکے ورنہ میری ایک محبت بھی کافی ہوسکتی تھی۔ بہرحال اب چلو، ضوفشاں انتظار کررہی ہوگی۔''

☆☆☆

موسم بڑا خوش گوار ہوا تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ نزہت اور اسفند کے جانے کے بعد ضوفشاں اپنے حصے کا کام نمٹا کر کمرے میں آئی تو فصیح ابھی مسجد سے نہیں آیا تھا۔ وہ نزہت اور اسفند کی لائی چیزیں ٹھکانے پر رکھنے لگی۔ زندگی میں سب پیارا تھا لیکن ایک گرہ دل میں ماما اور پاپا کے حوالے سے ہمیشہ تکلیف دیتی تھی۔ بظاہر مسکراتے اور ایک دوسرے سے بات کرتے وہ ایلیٹ کلاس کا کوئی مطمئن اور خوش جوڑا دکھائی دیتے تھے لیکن یہ ضوفشاں جانتی تھی کہ یہ سب کتنا مصنوعی اور جھوٹا ہے۔

''دعائیں پوری ہوتی ہیں؟'' اس رات سونے سے پہلے وہ فصیح سے پوچھ رہی تھی اور فصیح کو وہ لڑکی یاد آگئی تھی جسے دل نے ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی خواہش کی تھی اور اس خواہش نے اسے کتنا تھکایا تھا۔

''میرا تو ایمان ہے، دعاؤں کے ساتھ جو خواہشیں ہوں۔ وہ بھی بنا کہے مل جاتی ہیں۔''

اسے سب مل چکا تھا اس کا محبتوں سے چور لہجے میں یہی کہنا بنتا تھا۔

''آپ تو یہی کہیں گے۔''

تو فصیح نے اسے اماں کے نگاہ کے فلسفے سے لے کر اس لڑکی کے بیوی بننے تک کا قصہ سنایا تھا۔ وہ حیرت سے دم بخود بیٹھی تھی۔

تمہیں دیکھ کر دل میں شعلہ سا لپکا تھا لیکن اس شعلے سے خوشیوں کا گل زار بننے میں جو وقت لگا، اسے پراسس کا نام دیا جاسکتا ہے۔ دعا کرنے اور قبول ہونے کا درمیانی وقفہ۔ کبھی یہ مختصر ہوتا ہے کبھی طویل۔''

اور ضوفشاں فصیح کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ نزہت اور اسفند کے لیے یہ وقفہ طویل ہوگیا تھا۔ وہ ان کے لیے دعا کرسکتی تھی۔

ایک معافی، ایک توبہ یا درگزر کا کوئی ایک لمحہ کبھی کبھی سارے زخموں کا مرہم بن جاتا ہے اور آنے والی رتوں میں خوشیوں کے مہکتے والے گلابوں کا بیج بھی۔ اسے دعا کرنی تھی کہ نزہت ملال رفتگاں میں مبتلا رہنے کے بجائے زندگی کے دامن سے اپنے حصے کی خوشیاں اکٹھی کرسکے۔

ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ چاند رات کو جب اسفند اسے عمرے پر جانے کی خوش خبری سنائے گا اور آنے والے سالوں میں ان کی قسمت میں ایسے دن بھی ہوں گے جب وہ ضوفشاں کے بچوں کو گھر رہنے کے لیے لائیں گے اور نزہت ایک بار پھر زندگی کی تھکن بھلائے ان کے من پسند کھانے بنائے گی۔ انہوں نے زندگی میں مشکلات کے سوا دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو قسمت نے ان کی ساری بہاریں انہیں لوٹانی تھیں۔ ابھی وہ وقت تھوڑا دور تھا اور تب تک ضوفشاں کو صرف دعا کرنی تھی۔

☆☆

صدف عمر

یہ پاگل دل

"نشہ چڑھا جو شریفی کا اتار پھینکا ہے
بے شرم رنگ کہاں دیکھا دنیا والوں نے"

"بے شرم رنگ......" دادی جو عصر کی نماز کے بعد اونگھنے لگی تھیں، اس بے سری آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ سامنے صحن میں آٹھ سالہ مظہر سائیکل کم اور سر زیادہ چلاتا نظر آرہا تھا۔ ذرا ہوش و حواس بحال ہوئے تو گانے کے بولوں پر دھیان گیا۔

"توبہ استغفار! یہ آج کل کے بچے کیسے ہیں جو ایسے بے ہودہ گانے گاتے ہیں نہ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ نہ رمضان کا احترام، توبہ میرے مولا قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔"

مظہر اب منہ سے بھی میوزک دینے کی بھی کوشش کررہا تھا۔

"چپ بھانڈ کی اولاد۔" انہوں نے دانت کچکچا کر اسے ڈپٹا۔

"پاپا! دادی آپ کو بھانڈ کہہ رہی ہیں۔"

سائیکل کو گول گول گھماتے اس نے نجانے کس سے بلند آواز میں کہا تھا۔ دادی نے بے اختیار اس سمت دیکھا۔ فیاض گھر میں داخل ہورہے تھے، کچھ کھسیا کر انہوں نے دل میں اس آفت کو کوسا "خبیث کی......" آگے رک گئیں۔

"کیا ہوا مظہر! کیا کہہ رہے تھے تم؟" سلام کرکے انہوں نے سرکس کے جوکر کی طرح سائیکل چلاتے صاحب زادے سے استفسار کیا۔ دادی چوکس ہوگئیں۔

"وہ دادی آپ کو......"

"یاد کررہی تھی بیٹا! سلامت رہو، جیتے رہو۔ میری دوائیں لائے؟" انہوں نے پھرتی سے بات کو اچک لیا۔

ادھر مظہر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر بے دھیانی میں سائیکل لڑکھڑائی تو جلدی سے سائیکل کو سنبھالنے لگا۔

"جی خالہ بی! لایا ہوں۔ روزہ تو نہیں رکھا آپ نے پھر سے۔" وہ ان کی فکرمندی پر لاپروائی سے بولیں۔

"رکھا ہے پتر! کیا کروں، اب اس عمر میں بے روزہ اچھی لگوں گی۔" یہ وہ واحد ضد تھی جو ہزار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں چھوٹی تھی۔

"آپ بیمار ہیں خالہ بی...... یہ چھوٹ تو اللہ رب العزت نے خود دی ہے۔ پھر اگر آپ وقت سے دوائیں نہیں لیں گی تو صحت یاب کیسے ہوں گی۔"

"ہوجاؤں گی پتر! تو فکر نہ کر۔ اللہ مالک ہے۔"

"السلام علیکم!" نوشین باورچی خانے سے نکلی۔ وہ اسے سارے شاپر تھماتے گئے۔ افطاری میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا تھا۔ بیلا بھی اس کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ فیاض منہ ہاتھ دھونے چلے گئے۔ سامنے سائیکل چلاتا وہ مقتدا اب اونچی آواز میں نعت پڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

عشا کی نماز پڑھ کر دادی دوائیں لے کر لیٹ گئیں۔ جب تک بیلا تراویح سے فارغ ہوئی وہ دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ کل پھر فزیو تھراپسٹ کو آنا تھا۔ اب ایک دن چھوڑ کر آتا تھا۔ بیلا کچن میں چلی آئی۔ نوشین سالن گرم کررہی تھی۔

"اچھا ہوا تم بھی آگئیں کھانا کھاتے ہیں اب۔ تمہارے بھائی بھی تراویح پڑھ کر آچکے ہیں۔" بچے دونوں ٹی وی لگائے کارٹون دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔

"امی ابو کل عمرے کے لیے جا رہے ہیں۔ رات ایک بجے کی فلائٹ ہے۔ آپ افطاری کے بعد مجھے اور بچوں کو لے جایئے گا۔ پھر تراویح سے فارغ ہو کر آئیں گے تو آپ کے ساتھ آجاؤں گی۔" نوشین نے کہا۔

"اچانک سے کیسے پروگرام بن گیا ان کا۔" کھانا کھاتے فیاض نے سرسری سی حیرت سے پوچھا۔

"اچانک کہاں؟ کب سے تو بتا رکھا ہے آپ کو آپ کا دھیان میری طرف ہوتا ہی کب ہے۔"

اس نے اپنا پرانا شکوہ دہرایا۔ اس کی باتوں پر وہ دھیان نہیں دیتے تھے۔

"ٹھیک ہے لے چلوں گا۔" بچے نانو کے گھر جانے کا سن کر اچھل پڑے۔ بیلا ان کی خوشی کو

دیکھتی مسکرا دی۔

☆☆☆

دادی ٹھیک ٹھاک تھیں۔ اس عمر میں بھی چاق و چوبند اور تیز دست، مگر کوئی پندرہ دن پہلے وہ رات تہجد کے لیے اٹھیں تو نجانے کیسے اندھیرے میں ان کا پاؤں پھسلا۔ ہڈی تو شکر ہے بچ گئی مگر ٹانگ کا اندرونی پٹھا مڑ گیا۔ چھوٹا سا شہر تھا پہلے تو ادھر ہی ڈاکٹروں کو دکھاتے رہے مگر جب ڈاکٹر نے آرام نہ آنے کی وجہ سے بڑے شہر لے جانے کا مشورہ دیا تو افراز انہیں لاہور لے آئے۔

لاہور میں ان کی مرحومہ خالہ کے بیٹے فیاض رہتے تھے۔ اکثر شہر میں وہ کام کے سلسلے میں جاتے تو لازمی فیاض کے طرف چکر لگاتے۔ فیاض سے بات کی تو انہوں نے خوش دلی سے انہیں نہ صرف آنے کو کہا بلکہ ایک اسپیشلسٹ کا نمبر بھی لے لیا۔

اپنے دوست کی گاڑی میں وہ اماں اور دادی کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ ایکسرے وغیرہ ہوا تو انہوں نے دواؤں کے ساتھ فزیوتھراپی تجویز کردی۔ پندرہ دن فزیوتھراپی کرانی تھی پھر دوبارہ آ کر معائنہ بھی۔ ڈاکٹر کو امید تھی کہ وہ صحت یاب ہو جائیں گی۔

کام تو لمبا ہو گیا تھا۔ فیاض کے مشورے پر افراز اگلے دن دادی کو چھوڑ کر اماں کو ساتھ لے گئے۔ دادی کو مکمل علاج تک یہیں رہنا تھا۔ فیاض نے فزیو تھیراپسٹ کا بندوبست کر دیا تھا جو روز آ کر دادی کی تھراپی کر جاتا۔ اماں نے دادی کے کپڑے، سامان اور ان کی چہیتی ''بیلا'' کو بھیج دیا۔

افراز دادی کی حسب ہدایت دو درجن دیسی انڈے، دیسی گھی، من گڑ، دودھ کی خالص بوتلیں، گھر کا مکھن، گاجریں اور دیسی گندم بھی لایا تھا۔

دادی کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ حالانکہ فیاض سگے بھانجے اور بہت ہی اچھی طبیعت کے مالک بھی تھے اور وہ افراز کے اتنا کچھ لانے پر سخت ناراض ہو رہے تھے۔ شہر میں مہنگائی کے جو حالات تھے۔ افراز اس سے باخبر تھے۔ یہ سب چیزیں تو ان کے گھر کی تھیں۔ دادی نے بیلا کو بھی ہی بلو لیا تھا اپنی خدمت کے لیے۔ وہ یوں بھی اپنی اس اکلوتی پوتی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ جو آج کل کی لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہ تھی۔

انہیں ''دیدہ ہوائی'' لڑکیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں اور ان کی نظر میں سوائے بیلا کے سب ہی دیدہ ہوائی تھیں۔

☆☆☆

دروازہ زور۔۔۔ سے بج رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بچے اسکول سے آ کر سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ نوشین بھابی ان کے ساتھ کمرے میں تھی۔ وہ بھی شاید سو رہی تھی۔ دادی نے بیلا کو بلایا۔

''اٹھو بیلا، دیکھو تو ذرا، کون کم بخت ہے۔ لگتا ہے دروازہ اکھاڑ پھینکے گا۔'' جو بھی تھا یا تو واقعی بے صبرا تھا یا پاگل۔ وہ ذرا ہچکچائی۔

''میں کیسے دادی......''

''لو بھلا...... کیا تمہارے ہاتھ نہیں۔ جاؤ اب میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔'' انہوں نے گھور کر بےزاری سے اسے اٹھایا۔

''کون ہے؟'' دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے ذرا تیز آواز میں پوچھا۔

''مردم شماری والے...... دروازہ کھولیے۔'' قدرے رعب دار آواز آئی تھی۔ اسے کچھ حیرت ہوئی مردم شماری والے اس وقت اس مینے کہاں سے آ گئے۔

''گھر میں تو اس وقت مرد نہیں ہیں۔''

''مردم شماری کا مطلب صرف مرد شمار کرنا نہیں ہوتا اس میں معزز خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ محترمہ!'' بڑے تحمل سے یقین دلایا گیا۔

''اچھا ٹھہریے۔'' اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے دروازہ ذرا سا کھولا۔ مگر وہ جو بھی تھا۔ اس نے فراخ دلی سے سارا گیٹ چوپٹ کر دیا۔

''جی تو آپ کس چک، کس پنڈ سے ہیں۔'' اچانک سوال ہوا تھا وہ بھونچکا رہ گئی۔

''جی چک نمبر ستاسی۔'' بے ساختہ میں اس نے بتایا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ سامنے والے نے جیسے مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے۔ چھ یا گیارہ؟"

اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ یہ کیسا سوال تھا۔ کیا مردم شماری والے ایسے سوالات کرتے ہیں؟

"اوہو..... اس کا مطلب ہے، تعداد بہت ہے۔ بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔" سمجھ کر سر ہلایا گیا۔

اسے اب کہ ذرا غصہ آیا۔ کیا وہ واقعی شکل سے شادی شدہ لگتی ہے۔ اس نے اس لڑکے کو دیکھا جو کندھے پر بیگ اٹھائے پی کیپ پہنے ہوئے تھا۔ آف وائٹ ٹی شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس اب گھر کے اندر بڑی بے تکلفی سے گھس آیا تھا۔

"کون ہے بیلا؟" بھابھی شاید نہارہی تھی۔ اب سر پر تولیہ لپیٹے نکلیں اور اس کے برابر کھڑے اس نوجوان کو دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے آگے بڑھیں۔

"بدتمیز تم..... تم آگئے آخر کار۔"

اور وہ بدتمیز اب بڑی بے تکلفی سے ان کے گلے لگانے کے بعد ان کے گلے سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی مسکراتی نظریں۔ شرارت سے اس پر تکتی ہوئی بیلا کو سخت خفت میں مبتلا کررہی تھیں۔ وہ جلدی سے بھابی کی پکار کو نظر انداز کر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"توبہ ہے میری، ذرا بالوں کا حشر تو دیکھو اپنا۔ تنکوں جیسے خشک، اوپر سے یہاں خالص لسی بھی نہیں۔ ورنہ ابھی تیرا سر دھلواتی۔"

اپنے "سامان" سے نکالا نایاب تیل اس کے بالوں میں لگاتی ہوئی دادی بہت پریشان تھیں۔ ان کے بال اس عمر میں بھی لمبے تھے۔ وہ خود بھی دیسی ٹوٹکے شوق سے آزماتی تھیں اور بیلا کو بھی فیض یاب کرتیں۔ تب ہی تو اس کے بال اتنے گھنے اور لمبے تھے۔

"بس کریں ناں دادی، مجھے نیند آرہی ہے۔" اس نے ابھی تراویح نہیں پڑھی تھی اور دادی کی چمپی سے نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔

"ایک تو مجھے بڑے بڑے شہروں کی مشینوں کی سمجھ نہیں پڑتی۔ اب دیکھو ذرا نوشین کو کوئی پوچھے کہ بی بی پیچھے اتنا بڑا وجود اور بال دیکھو تو چٹکی سے۔ ارے بال تو عورت کا حسن ہوتے ہیں۔ مگر یہ کٹوا کٹوا کر خود کو کاکی بنائے پھرتی ہیں۔" اسے ہنسی آنے لگی۔ نوشین بھابی قدرے صحت مند تھیں۔ اسٹیپ میں کٹے کندھے تک بمشکل آتے ان کے بالوں پر دادی کو سخت اعتراض تھا۔

"بری بات دادی۔ نوشین بھابی سن لیں تو کتنا برا مانیں گی۔" اسے نوشین اچھی لگتی تھی پرخلوص، خوش مزاج سی۔

"نا..... کتنی دفعہ سمجھایا ہے تجھے کہ وہ رشتے میں تیری چاچی لگتی ہے۔ بھابی مت بولا کرو۔"

"دادی! وہ اتنی عمر کی تو نہیں ہیں پھر فیاض بھائی کو میں چاچو تو نہیں کہتی۔ آپ بھی ناں۔"

واقعی یہ حقیقت تھی کہ ان کی شادی کو تیرہ سال ہوئے تھے ایک دس سالہ بیٹا تھا۔ دوسرا آٹھ سال کا چھوٹی سی نیلی تھی۔ مگر دادی کی عادت تھی یونہی بات کر جاتیں۔ بعد میں خود بھی بھول بھال جاتیں۔

"اوپر سے وہ لونڈا۔ اسے ادھر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ فیاض کو منع کروں گی۔ جوان بچی ہے میری۔"

آریز کے آنے پر انہیں سخت اعتراض تھا۔ وہ بھابی کا اکلوتا بھائی تھا چونکہ امی ابو عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے تو آریز نوشین کے اصرار پر اور امی کی ہدایت پر ان کی طرف آگیا تھا۔ وہ بھی ایک خوش مزاج اور من موجی لڑکا تھا۔ ادھر آنے پر بمشکل ہی راضی ہوا تھا۔ دادی کو وہ ایک نمبر کا شوخا لگا تھا۔ سو آج سارا دن انہوں نے بیلا کو اپنے پاس سے ہلنے بھی نہیں دیا۔

بے چاری نوشین اکیلے ہی لگی رہی اور بیلا سخت شرمندہ ہوتی رہی۔

دادی کے حفاظتی اقدام کہاں تک اس کا سامنا ہونے سے روک سکتے تھے؟ ایک ہی گھر تھا۔ تاہم انہوں نے دل میں سوچ لیا اب بیلا کو زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھیں گی۔

☆☆☆

"بے شرم رنگ کہاں دیکھا دنیا والوں نے۔"

یہ گانا آج کل اظہر کے منہ پر چڑھا رہتا افطاری کے لیے سب میز پر بیٹھے تھے۔ جب وہ میز بجا کر گانے لگا۔ دادی نے ناگواری سے پہلو بدلا۔

"بری بات اظہر......" فیاض نے ٹوکا۔ ہیلا دادی کے پہلو میں سر جھکائے دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔

"آپی! آج کھانے میں کیا ہے؟" آریز ابھی آیا تھا کرسی دھکیل کر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ماموں جان! آج دادی کی فرمائش پر کدو شریف بنے ہیں۔" مظہر نے اطلاع دی۔

"اوہو...... مگر مجھے تو مرغی نالائق کھانی تھی۔ آپ کو کہا بھی تھا کہ مرغی کا لذیذ سا قورمہ بنائیے گا۔" اسے افسوس ہوا۔ مرغی نالائق کہنے پر دونوں چیلے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ مسکراہٹ تو فیاض کے چہرے پر بھی پھیلی تھی۔ دادی کو برا لگا۔

"بنایا ہے قورمہ بھی۔ تم فکر مت کرو۔ جانتی ہوں کہ سبزیاں تمہارے حلق سے نیچے نہیں اترتیں۔" شربت کا جگ ٹیبل پر رکھتی توشین بھابھی نے تسلی دی۔

"کدو شریف کھانے ہی پڑتے۔ ویسے سچ بتاؤں کدو کدو کو دیکھ کر مجھے اپنا ایک محلے کا لڑکا یاد آ جاتا ہے۔ بچپن میں جب وہ گنجا ہو کر آتا تھا تو اس کے سر کو دیکھ کر بے ساختہ مجھے کدو یاد آ جاتا تھا۔ پھر اسے سب چھیڑتے بھی خوب تھے۔"

اس کا انداز سنجیدہ تھا مگر بچوں کی ہنسی رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کی کدو کدو کی گردان سن کر دادی سے صبر نہ ہوا۔

"سبزیاں صحت کے لیے مفید ہوتی ہیں۔"

"اچھا......؟" تعجب کا اظہار ہوا۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ شکریہ دادی آئندہ میں بھی کوشش کروں گا کہ سبزیاں کھاؤں۔" اس کے عقیدت مندانہ انداز پر توشین نے تنبیہی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اذان شروع ہوئی تو سب ٹیبل کی طرف متوجہ ہوئے۔

دادی نے دیکھا کہ اس نے تین گلاس شربت پیا تھا۔ پکوڑے، سموسے، دہی بھلے، غرض پلیٹ میں ایک پہاڑ سا بنائے وہ رغبت سے کھا رہا تھا۔

"یہ فروٹ چاٹ بھی لو نا۔ خاص تمہارے لیے بنائی ہے۔" توشین نے محبت سے ڈش بڑھائی۔

"بس کرو بہو، طبیعت خراب نہ ہو جائے کہیں۔" ان سے اس بسیار خوری برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"بے فکر رہیے، دادی، جوان ہوں، ہیضہ ویضہ مجھے نہیں ہوتا۔ آپ البتہ احتیاط سے کھایئے گا۔ اس عمر میں ویسے بھی معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔"

وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑ رہا تھا۔ بدتمیزی کا یا بدتہذیبی کا عنصر نہیں تھا مگر انہیں تو پتنگے لگ گئے۔ خفگی سے پکوڑا ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر لاکھ ہیلا نے اشارے کیے فیاض اور توشین نے بھی کہا۔ انہوں نے کچھ نہ لیا۔ توشین بھابی شرمندہ ہوتی رہی۔

آریز کو ملامتی نظروں سے گھورا۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"تمہاری وجہ سے خالہ بی ناراض ہو گئی ہیں۔" وہ نماز پڑھ کر کچن میں آیا تو توشین نے اسے ڈانٹا۔ وہ ٹیبل سے برتن اٹھا رہی تھی۔

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا آپی۔" وہ بھی اس کی مدد کرنے لگا۔

"وہ برا مان گئی ہیں۔ آزی! تمہاری اس عادت سے میں بھی عاجز ہوں۔ ہر جگہ ہر کسی سے مذاق نہیں کرتے۔"

"چلیں کسی کسی سے تو کر لیتے ہیں ناں۔" وہ لاپروا تھا۔

"تمہیں کون سمجھائے۔ چلو، تم کمرے میں ذرا بچوں پر نظر رکھو۔ میں آتی ہوں۔"

"تو جی میں کوئی آیا ہوں حد ہو گئی ہو یے۔"

وہ برا مان گیا۔ توشین نے جواب نہیں دیا۔ جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے۔

"اندر آ سکتا ہوں۔" دروازے سے گردن نکالے آریز اجازت مانگ رہا تھا۔ دادی خفگی سے لیٹی ہوئی تھیں۔ ہیلا بڑی بے بسی سے ان کو تکے جا رہی تھی جب آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ اسے شاید اجازت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اندر آ گیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا دادی آپ کی؟" الفاظ کے برعکس چہرے پر فکر مندی کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ دادی اٹھ بیٹھیں۔

"تم سے مطلب؟"

"غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا دادی! آپ کیوں اپنی صحت کا ستیاناس مارنا چاہتی ہیں۔ دیکھیں تو ذرا رنگت کیسی پیلی پڑ رہی ہے ہونٹ سفید یقیناً دل بھی تیز تیز دھڑک رہا ہوگا۔ اور یہ سب نشانیاں خالی پیٹ کی ہیں۔" ان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھے وہ تشویش سے گویا ہوا تھا۔

"یہ ساری نشانیاں تو ہارٹ اٹیک کی ہیں میاں۔ یعنی تم مجھے اب دل کا عارضہ لگانا چاہتے ہو۔" دادی ہنوز اکھڑی ہوئی تھیں۔

"توبہ میری توبہ۔ میں اور ایسی گستاخانہ بات سوچوں۔ بھئی آپ سے میری کوئی رنجش کوئی دشمنی تھوڑی ہے۔"

"چلو اٹھو تم بھی دیکھ نہیں رہیں کہ دادی جان بھوکی ہیں۔ خود تو پیٹ بھر کر کھالیا۔ دادی کا خیال ہی نہیں جاؤ کچن سے کھانا لاؤ۔"

دادی کو جواب دے کر وہ اب بیلا کو ڈپٹ رہا تھا۔ جو حیرانی سے منہ کھولے اس کی دھونس بن رہی تھی۔

"اور کدو شریف اور مرغی نالائق دونوں لانا۔ میں بھی اپنی پیاری دادی جان کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔"

بڑے رعب سے اسے ہدایت دے رہا تھا دادی کے تیور بھی بگڑنے لگے اس نے نکل جانے میں ہی عافیت جانی۔

"میں تمہاری دادی کب سے ہوگئی؟" اس کا یوں بیلا پر رعب جتانا انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔

"جب سے میں نے آپ کا نورانی چہرہ کو دیکھا ہے تب سے میرے دل میں یہ خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی ہے کہ کاش یہ روشن پیشانی اور نورانی چہرے والی حسینہ بزرگ، میری دادی ہوتیں۔" اس کی پور پور سے عقیدت چھلک چھلک کر رہی تھی۔ دادی نے آنکھیں بھینچ کر بغور اسے دیکھا۔

"میری حقیقی دادی تو ایسی کائیاں، ایسی فسادی ہٹلر ٹائپ کی تھیں کہ جب تک زندہ رہیں ہمیں عذاب میں رکھا۔"

دادی ناک پر انگلی رکھے، منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ اس لڑکے کی زبان تھی کہ تیز گام، مرحومہ دادی کے لیے ایسے "گستاخانہ" خیالات رکھتا تھا سخت افسوس ہوا بڑی دل سوزی سے سمجھایا۔

"نہ بیٹا، یہ تو گناہ ہے مردوں کے پیچھے، ایسے ان کی عیب جوئی کرنے سے سخت منع فرمایا گیا ہے توبہ کرو۔" آریز ان کی پھیلتی آنکھوں اور صدمے سے بے حال چہرے کو دیکھ کر مسکراہٹ دبا رہا تھا۔

"مگر انہوں نے بھی تو ہمیشہ دوسروں کی برائیاں کی تھیں۔ کیا وہ ٹھیک تھا۔"

"ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے۔ وہ جانیں تم کیوں ان کی برائیاں کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک ہی رہی ہیں۔ ویسے اب دیکھیں ناں آپ بھی تو ہیں۔ جب سے آیا ہوں آپی نے آپ کی تعریفیں کر کر کے کان پکا..... مطلب ہے مجھے اتنا مشتاق بنا دیا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ آپ کا مرید بن جاؤں۔ التماس ہے کہ مجھ گناہ گار کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے گا اے نیک دل دادی۔"

اس کی تعریف پر وہ ذرا نرم پڑ گئیں۔ بیلا ٹرے سجائے آگئی۔ اس نے فوراً ٹرے تھام لی۔ پھر ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ دونوں سالن اور رائتہ۔

"آیا.....کیا خوشبو آ رہی ہے۔ مگر.... اس میں پکوڑے۔ فروٹ چاٹ نہیں ہے۔" تنک کر ڈپٹا۔

"نہایت کم عقل لڑکی ہو۔ جاؤ جا کر دیکھو دادی کے حصے کی افطاری رکھی ہے۔ اٹھا لاؤ۔" بیلا فوراً مڑی۔

"ارے ارے رکو.....ٹھہرو..... میں ویسے بھی اس وقت کھانا کھاتی ہوں۔ رہنے دو باقی سب۔"

دادی نے ٹوک دیا۔ بیلا منتظر نظروں سے کھڑی وہ بھی اب کھانے کی طرف متوجہ تھا۔ بیلا کو اور بھی کام کرنے تھے۔ وہ دادی کو اس کے ساتھ مصروف دیکھ کر چلی گئی۔

گرم خوشبودار قورمہ دادی کی بھوک بڑھا گیا۔ کھانے پینے کی وہ ویسے بھی شوقین تھیں۔ آریز نے جان بوجھ کر قورمے کی پلیٹ ان کی جانب کھسکائی اور تھوڑی دیر بعد ہی، وہ شوربے میں نوالے ڈبو ڈبو کر

رغبت سے کھا رہی تھیں۔ پلیٹ میں رکھے کدو ایک طرف ویسے ہی پڑے رہ گئے۔ آریز مسکرا دیا۔

☆☆☆

تہجد پڑھ کر دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے ساختہ اماں اور گھر یاد آنے لگا۔ نماز پڑھ کر اس نے شاہنواز کو فون ملایا۔ وہ لاہور یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔ آج کل چھٹیوں کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔

''اداس مت ہو بلی۔ آج کل میں چکر لگا لوں گا۔ اماں بھی بہت اداس ہو رہی ہیں تمہارے بغیر۔''

اسے تسلی دیتے اس نے فون رکھ دیا۔ اپنا چھوٹا شہر، اپنا گھر سب بہت یاد آ رہے تھے۔ نوشین ابھی تک نہیں جاگی تھی۔ وہ آنسو صاف کرتی کچن میں آئی۔ اماں سے اس وقت بات کر کے وہ انھیں اپنے آنسوؤں سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دادی اب پہلے سے قدرے بہتر تھیں۔ تھوڑے دنوں کی بات تھی پھر انہیں واپس چلے ہی جانا ہے۔ خود کو تسلی دیتی وہ فریج سے آٹا نکالنے لگی۔ جب تک نوشین جاگی، وہ سحری کی تیاری شروع کر چکی تھی۔

ہاتھ میں شاپر پکڑے وہ مگن انداز میں کچن میں آیا تھا مگر ٹھٹک کر چوکھٹ پر ہی رک گیا۔ سامنے خوب صورت لمبے بالوں کی ایک چمکتی آبشار تھی جو بہہ رہی تھی۔ ایسے خوب صورت و لمبے بال، اس نے شاید ہی دیکھے ہوں۔ خوش گوار حیرت میں گھرا وہ قدرے اشتیاق سے آگے بڑھا تھا اور اسی اثنا اقمر اور منتظر کی نظر اس پر پڑی۔

''ماموں...... ہماری چیزیں لے آئے۔'' وہ شور مچاتے اس کی جانب بھاگے۔ بیلا بھی چونک کر مڑی۔ لمبے بال جھٹکا کھا کر چھپ گئے۔ اس کی نگاہوں کا ارتکاز خود پر محسوس کر کے، اسے عجیب سا احساس ہوا تو قدرے ناگواری سے دوپٹے سے فوراً سر ڈھانپ لیا۔

بچے کب سامان جھپٹ کر بھاگ گئے اسے پتا ہی نہ چلا۔ آدھ پھٹا شاپر اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس رات نوشین کے کمرے میں اس کے بیڈ پر اوندھا لیٹا وہ کہہ رہا تھا۔

''آپی! بیلا کے بال کتنے لمبے اور خوب صورت ہیں۔''

نوشین فیاض بھائی کا سوٹ استری کر رہی تھی۔

''تم نے کہاں سے دیکھ لیے۔''

''بس دیکھ لیے۔'' وہ خیالوں میں کھویا کھویا بولا۔ آج فیاض کے فرینڈز کی طرف افطار پارٹی تھی۔ وہ وہیں تھے۔

''ویسے ایک بات تو بتائیں۔ بیلا کے بال اتنے لمبے کیسے ہیں۔ آپ کے تو بالکل ہی چوہیا کی دم کے جتنے ہیں۔''

اس کی سوئی لگتا تھا اس کے بالوں میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ نوشین نے مڑ کر مشکوک نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ اس جیسا لاابالی و من موجی سا لڑکا کبھی بھول کر بھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔

''لگتا ہے اس کے بال کچھ زیادہ ہی تمہارے حواسوں پر چھا گئے ہیں۔ اور ہاں۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بالوں کو چوہیا کی دم سے تشبیہ دینے کی۔'' یاد آیا تو برا اڑ پنا۔ وہ تکیہ سینے پر رکھ کر سیدھا ہو گیا۔

''جی ہاں، کیا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کا اپنا تجربہ جو ہے۔'' اس کا اشارہ سمجھ کر سر جھٹکتی فخر سے مسکرائی۔

''فیاض ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت شریف النفس انسان ہیں۔''

''تو کیا میری تصویریں تھانے میں لگی ہیں۔ آپی! آپ اپنے بھائی کے لیے ایسے خیالات رکھتی ہیں۔ واقعی سچ کہتے ہیں لوگ، شادی کے بعد بہنیں بدل جاتی ہیں۔'' وہ افسوس سے سر ہلاتے صدمے سے نڈھال سا ہو گیا۔ نوشین ایسی اداکاری کی عادی تھی خاطر میں نہ لائی۔

''میں تو آپ کو اپنی سہیلی سمجھ کر صرف ایک بات کہہ رہا تھا۔'' وہ باقاعدہ ناراض ہو گیا۔

''اچھا! اور شاپنگ کے لیے اگر میں تمہیں اپنی بہن سمجھ کر، جو ساتھ لے چلتی ہوں تب تو جناب کا منہ سوج جاتا ہے۔ سو نخرے کیے جاتے ہیں وہ کس کھاتے میں؟''

''تو اور کیا کہوں؟ رابنزل کی چوٹی کہنے سے تو رہا۔'' اس نے منہ بنایا۔ نوشین نے مڑ کر اسے گھورا۔

''دیکھو آریز! بیلا بہت سادہ و باحیا لڑکی ہے۔

تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ وہ کیسے سٹ کر خود کو ڈھانپ کر رکھتی ہے۔ فیاض اسے بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ یہاں وہ ہماری مہمان بھی ہے اور عزت بھی۔ خبردار جو بھی الٹی سیدھی۔"

"ارے واہ...... بس بھی کریں۔ میں آپ کو کیا ایسا لوفر لفنگا لڑکا لگتا ہوں۔ فلرٹ قسم کا۔"

ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ تیزی سے بولا۔

"سارے ہی مرد ایسے ہوتے ہیں۔" ڈنگر وارڈ روب میں لٹکاتی وہ اطمینان سے بولی۔ لگتا تھا وہ بھی آج سارے حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھی۔

"بڑی ہی احسان فراموش ہیں آپ بھول گئیں؟ ہر بار آپ کی خدمت میں گاڑی لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ بہنوں کی طرح مشورے دیتا ہوں مگر سچ ہے نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ آپ کے میاں تو ایک بار میں ہی میدان سے دم دبا کر بھاگ لیئے تھے تب سے میں ہی آپ کے بھتے چڑھا رہتا ہوں۔" افسوس سے سر ہلا کر وہ تکیہ پھر سے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ نوشین قطعی متاثر نہیں ہوئی۔ اس کے یہ ڈرامے اکثر و بیشتر چلتے رہتے تھے۔ ڈرامے باز کہیں کا۔

☆☆☆

لیلیٰ او لیلیٰ ...... ایسی میں لیلیٰ
ہر کوئی چاہے مجھ سے ...... ملنا اکیلا

"واہ واہ...... آفرین ہے، کیا انداز ہیں، کیا سر ہیں، آپی! لگتا ہی نہیں کہ یہ تمہارے شریف النفس میاں کی اولادیں ہیں۔"

آریز لیمن اتارتے سر دھن رہا تھا۔ بیلا اور نوشین ٹیبل سیٹ کر رہی تھیں۔ افطار کا وقت تھا آج موسم نسبتاً گرم تھا سو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کولڈ ڈرنک جمبو بوتل فریج سے نکالتی نوشین کچھ نہیں تھی۔

"کیوں ایسا کیا کر دیا میرے شہزادوں نے۔"

"رمضان کا بابرکت مہینہ دیکھیں اور ان کے اونچے سر دیکھیں۔ اب جب کہ شیطان بھی قید میں ڈال دیے جاتے ہیں مگر ان کے تو سر پر چڑھ کر ناچ رہے ہیں گویا۔"

وہ آج پیزا بیک کر رہا تھا اسی لیے کچن میں تھا اور اس کی وجہ سے دادی نے، کچن کے عین سامنے ڈیرا جما رکھا تھا۔ تسبیح پڑھتے پڑھتے وہ اندر بھی "جھاتی" مار لیتیں۔ گو کہ آریز نے اب تک کوئی ایسی چھچھوری حرکت تو نہیں کی تھی مگر ان کے حفاظتی اقدامات اور حصار کمزور نہیں ہوئے تھے۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے بڑے شیاطین قید کیے جاتے ہیں چھوٹے نہیں۔"

"اچھا سمجھ گیا۔ تب ہی یہ پھدکتے پھر رہے ہیں۔" اس نے گویا سمجھ کر سر ہلایا آپی نے تو بس اپنی معلومات جھاڑی تھیں۔ مگر آریز کے بے ساختہ انداز پر بیلا کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ دیکھی تو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

"بڑے ہی خبیث ہو تم، خبردار جو میرے معصوم سے بچوں کو شیطان سے ملایا ہو تو۔" وہ کھسیانی ہو کر اسے ڈانٹنے لگی۔

"مجھے ملانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ تو خود بصد شوق ملتے رہتے ہیں کیوں آنسہ بیلا!" بیلا مخاطب کیے جانے پر گڑبڑائی۔ دادی بھی بیلا کے نام کی گردان پر چوکنی ہوئیں۔

"نہیں...... کیا کہہ رہے...... ذرا تیز بولو نا......" اور آریز ہونے مسکراتے ہوئے اوون بند کر دیا۔ پیزا ریڈی تھا۔

"میں کہہ رہا تھا دادی! کہ بیلا بھی پیزا بنانا سیکھ لے۔ مستقبل میں کام آ سکتا ہے۔"

ان کی بے چینی محسوس کرتے اس نے بلند آواز میں کہا۔ وہ سر جھٹکتے بولیں۔

"بھیا، ہم نہیں کھاتے یہ انگریزی کھانے نہ ہی ہماری بچی کو سیکھنے کی ضرورت ہے یہ حلوائیوں والے کام۔" بیکنگ ان کے نزدیک حلوائی والا کام تھا تو پیزا انگریزی کھانا۔

"اٹالین دادی، یہ اٹالین فوڈ ہے۔" اس نے تصحیح کی۔

"جو بھی ہے، تو فرنگیوں کا کھانا۔"

اور جب افطاری کے وقت وہ فرنگی کھانا کیچپ

لگا کر مزے سے کھا رہی تھیں تو آریز سے مسکراہٹ روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بیلا کچھ کچھ شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی تھی۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے اور وہ سر ہلا ہلا کر وصول کرتا رہا۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ ایم بی اے کرنے کے بعد باپ کا آفس سنبھال رہا تھا۔ وہ ہر فن میں طاق تھا اور ہر خانے میں فٹ بزعم خود۔

☆☆☆

اس بابرکت مہینے کی ہر ساعت سے فیض، قسمت والے ہی اٹھاتے ہیں۔ بیلا کی دیکھا دیکھی نوشین بھی اب تراویح پڑھ لیتی تھی۔ وہ دادی کو سنبھالنے کے ساتھ نوشین کی بھی مدد کرتی، یہ تھا کہ اس کے آنے سے نوشین کو کتنی سہولت ہو گئی تھی۔ صفائی کے لیے کام والی آتی تھی وہ دو گھنٹوں میں اپنا کام نمٹا کر چلی جاتی۔ بیلا نے پکانے کی تقریباً ساری ذمہ داری اٹھا لی تھی اور یہ سچ تھا کہ اس کے ہاتھ میں لذت بھی بہت تھی۔ بیلا اپنی تسبیحات، نوافل اور قرآن کی تلاوت کو بھی مکمل وقت دیتی۔ نوشین اسے دیکھ کر حیران بھی ہوتی اور شرمندہ بھی۔ وہ تو مارے باندھے صرف ایک قرآن پاک بھی ختم کر لے تو بڑی بات تھی۔

بی اے میں پڑھتی، چھوٹے شہر کی یہ لڑکی ہر رنگ میں نمایاں تھی۔ ہر انداز میں خوب صورت اور اپنی خوبیوں سے بے پروا اس لڑکی کو وہ ایک نئے روپ میں، ایک نئے رشتے میں دیکھنے لگی۔ آریز کی اس میں دلچسپی وہ محسوس کر رہی تھی۔ مگر متذبذب تھی کہ اپنے بھائی کی من موجی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ نجانے وہ ایسا سوچتا بھی ہے یا نہیں۔ خیر بات کرنے میں کیا حرج تھا۔ وہ آریز سے بات ضرور کرے گی۔ اس نے دل میں ارادہ باندھا بس مناسب موقع کا انتظار تھا۔

قہقہوں کی آواز پر اس نے حیرت سے برآمدے کی طرف دیکھا۔ آریز اور شاہ نواز دونوں نجانے کس بات پر یوں ہنس رہے تھے۔

"لڑکے اتنی جلدی دوست کیسے بنا لیتے ہیں۔" حیرانی سے سوچتی وہ بیسن گھولنے لگی۔ وہ خود بہت شرمیلی اور کم گو تھی۔ پہلی ملاقات میں کسی سے یوں فری ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

شاہ نواز دوپہر کے بعد آیا تھا۔ اماں نے اس کے لیے کتنی چیزیں بھجوائی تھیں اور پیسے بھی کہ وہ عید کی خریداری شہر سے ہی کر لے۔

نوشین نے اسے روک لیا کہ افطاری کر کے جائے۔ دادی بھی اپنے خوب رو جوان پوتے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

"بھابھی ہماری بلی کو اچھی سی شاپنگ کروا دیں گی ناں۔" وہ بلی کہنے پر جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ فوراً خوش دلی سے بولی۔

آریز نے اس کے سرخ چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔

"بھئی بیلا نے تو ہمیں بہت سکھ دیا ہے۔ ورنہ اپنی بیگم کے ہاتھ کے ابلے اور پھیکے کھانے کھا کھا کر ہم نے تو خود کو مریض ہی تصور کر لیا تھا۔

فیاض نے نوشین کو چھیڑا تھا۔ وہ برا ماننے کے بجائے تائید کرنے لگی۔

"یہ تو ہے۔ بیلا ماشاءاللہ سے ہر کام میں طاق ہے۔ مزاج کی بھی بہت اچھی ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر اکثر حیران ہوتی ہوں کہ آج کل کے دور میں ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔"

وہ سب یوں اس کی ذات کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ اسے شرمندگی سی ہونے لگی۔ دادی کو خوشی ہو رہی تھی۔ ان کی پوتی کی تربیت و کردار کی تعریف ان کی محنت کی وصولی تھی۔ شاہ نواز نے اپنی شرمیلی بہن کو مسکرا کر دیکھا۔

"واقعی بھابھی! یہ جتنی اچھی ہے اتنی احمق بھی ہے۔"

اب وہ اس کی حماقتوں کے چند واقعات سنا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سب دلچسپی سے سن اور ہنس رہے تھے۔ دادی بھی مسکرائے جا رہی تھیں اور بیلا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جادو کے زور سے غائب ہو جائے۔

☆☆☆

نوشین کا پروگرام افطاری کے بعد شاپنگ پر جانے کا تھا۔ اس نے بیلا کو بھی تیار رہنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ متذبذب ہوئی۔

''بھابھی...... دادی کیا کریں گی۔ آپ ایسا کریں ناں کہ میرے لیے بھی آپ ہی خریداری کر لائیں۔'' اس کا ارادہ جانے کا نہیں تھا سو عذر تراش حل پیش کر دیا۔

''نہیں بھئی، تم ساتھ چلو، سچ کتنا مزہ آئے گا۔ آرام سے خریداری کریں گے اور رہ گیا خالہ بی کا مسئلہ، فیاض گھر پر رہیں گے۔ بچوں اور خالہ بی کا خیال وہ ایک دن کے لیے بخوشی رکھ لیں گے۔'' وہ سارا پلان کر کے بیٹھی تھی۔

''مگر بھابھی......''

''اگر مگر نہیں...... خالہ بی سے میں نے بات کر لی ہے۔ انہیں کوئی مسئلہ نہیں اور سچ بتاؤں، بیلا تم مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح عزیز ہو۔ مجھے ہمیشہ حسرت رہی کہ میری بھی کوئی بہن ہوتی۔ ہمیشہ میں اکیلی خریداری کرنے جاتی ہوں اگر کوئی بہن ہوتی تو اس کے ساتھ خریداری کرنے میں کتنا مزہ آتا۔ اب تم آئی ہو تو میری خواہش پوری نہیں کرو گی۔'' اس کا مان بھرا انداز دیکھ کر وہ راضی ہو گئی۔

''چلیں جان چھوٹی میری۔ ورنہ ہر سال ان کی بہن کا رول پلے کرنے میں سچ مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے بس صرف ایک دوپٹا اوڑھنے کی کسر باقی رہتی ورنہ ہر دکان پر ان کے شانہ بشانہ چلتے وقت تو میں مشکوک ہی ہو جاتا کہ میں لڑکا ہوں یا کوئی چھوٹی موٹی سی حسینہ۔''

اندر آتے آریز نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ نوشین نے مسکراتے ہوئے گھورا۔

''کیوں...... ایسا کون سا پہاڑ توڑتے ہو تم۔''

''بس ہر دکان پر تو آپ رک جاتی ہیں۔ خریداری کرنی ہو یا نہیں۔ بے چارے دکان دار سے سارے تھان لازمی کھلوانے ہیں۔ پھر آپ کی بحث آپ کے بھاؤ تاؤ کے چکر میں اکثر سحری کے بغیر روزہ رکھنا پڑتا تھا۔''

''بھابھی اتنا ٹائم لیتی ہیں۔'' بیلا تو سن کر پریشان ہو گئی۔ نوشین نے اس کے چہرے کو دیکھ کر تسلی دی۔

''یہ ایویں فضول بول رہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

''آج خود دیکھ لینا تم...... رات میں سورج نہ نظر آیا تو نام بدل دینا۔'' لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہتا وہ سنجیدہ تھا۔

''کیوں بیٹا جی! آپ بھی خود دیکھ لیجیے گا ناں۔ آپ بھی تو چل رہے ہیں۔'' نوشین متی خیزی سے مسکرائی۔

''کیا...... میں...... ! نہیں آپی، پلیز آج تو آپ کو واقعی ایک عدد اصلی بہن میسر آگئی ہے۔ اس دفعہ تو مجھے بخش دیں۔'' وہ مصنوعی کراہا۔

''بہن تو میسر آگئی ہے پر ڈرائیور بھی تو چاہیے ناں...... تم گھر سے جا کر گاڑی لے آنا۔ افطار کے بعد...... یاد سے۔ اس کے کراہنے کو نظر انداز کرتی نوشین نے حکم دیا۔ بیلا مزید پریشان ہو گئی۔ یہ بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ اسے نئی فکر لاحق ہو گئی۔

☆☆☆

اور واقعی آریز کی بات درست تھی۔ بھابھی کے ساتھ شاپنگ بہت صبر آزما تھی۔ افطار کے بعد بازار کی رونقیں عروج پر تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے سارا شہر ہی اٹھ کر خریداری کرنے آگیا ہو۔ نوشین نے دادی کے لیے سوٹ پسند کر لیا تھا۔ اب وہ بیلا کے لیے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ ان کو کوئی جچ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی بے بسی سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

''ایک بھی ڈھنگ کا ڈیزائن نہیں ہے۔ سارے ہی فضول ہیں۔ ایسا کرتے ہیں مال چلتے ہیں۔''

اس نے نہ صرف سوچا بلکہ عمل بھی کر لیا۔ آریز کو فون کر کے آگاہ کیا۔ پھر اس رش میں اس کا ہاتھ تھام کر وہ تیزی سے اسے گاڑی تک لے آئی۔ اس کے اڑے حواس اور بے بس شکل دیکھ کر آریز کو ہنسی آگئی۔ آپی کے بھیجے اس بار وہ چڑھ گئی تھی۔

''جلدی...... چلو...... بچوں کے کپڑے بھی وہیں سے لوں گی۔'' فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر نوشین نے آرڈر دیا۔ اس نے سر ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ مال میں وہ

پہلی بار آئی تھی۔ وہاں چلتے پھرتے ماڈرن لوگ، مغربی لباس پہنے لڑکیاں وہ قدرے حیرت و تاسف سے یہ سب دیکھتی رہی، ٹی وی میں دیکھنے اور حقیقت میں دیکھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اسے ان ——— لڑکیوں پر افسوس ہونے لگا۔ اگر دادی ادھر ہوتیں تو یقیناً اب تک اسے بغل میں دبا کر اپنے شہر چلی گئی ہوتیں۔

وہ قدرے گھبرائی سی بھابھی کے پیچھے چل رہی تھی۔ آریز جیسے اس کی کیفیت سمجھ گیا پھر اس نے بڑی تیزی سے آپی کی شاپنگ میں مدد کی۔ فیاض بھائی کے کرتے بچوں کے سوٹ ہو چکے تھے۔ اب بھابھی اور بیلا کے کپڑے رہ گئے تھے۔

آریز اپنے لیے شرٹس لینے چلا گیا تو نوشین اسے لیے ایک مشہور بوتیک میں آ گئی وہ کپڑے لگا لگا کر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔

بیلا کو پتا ہی نہیں چلا کہ کدھر غائب ہوئی۔

وہ قدرے پریشانی سے اسے ڈھونڈنے لگی۔ وہ نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ کتنی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد وہ اسے نہ ملی تو اسے رونا آنے لگا۔ اسے تو گھر کا راستہ بھی نہیں آتا تھا نہ فیاض بھائی کا موبائل نمبر کہ کال تو کیا کرے۔ وہ زرد رنگت اور آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ بوتیک سے باہر نکل آئی۔ باہر ایک الگ دنیا تھی۔ بے فکری سے آتے جاتے لوگ شور، آوازیں، روشنیاں، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سمت جائے۔ یونہی اندازے سے سیدھی چلنے لگی۔ دل میں آیتوں کا ورد کرتی۔ اس نے اپنی چادر کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ کبھی یوں اکیلی نہیں نکلی تھی۔ اس کی دنیا تو محدود سی تھی گھر سے کالج تک، ابا کی وفات کے بعد تو یوں بھی اماں بہت ڈری ہوئی تھیں۔ کالج بھی وہ وین میں آتی جاتی جو افراز بھائی کے کسی جاننے والے کی تھی۔ بازار بھی کم ہی جاتی۔

اماں اکثر اپنی پسند کی چیزیں لے آتیں۔ اسے رش سے گھبراہٹ ہوتی تھی مگر آج محبت و مروت میں وہ آ تو گئی تھی مگر اب...... اس نے گردن موڑ کر دیکھا کہ شاید آپا ہی نظر آ جائے مگر اسی پل کسی سے زوردار ٹکر ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی۔ سامنے والے کے ہاتھ سے پوپ کارن اور شاپرز ایک ساتھ گرے۔ اس نے پیشانی سہلاتے دیکھا۔

بکھرے پاپ کارن یہاں وہاں عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ وہ لڑکا جھک کر اپنے شاپرز اٹھاتا ناگواری سے بڑبڑا رہا تھا۔ ساکت کھڑی بیلا کے لب گویا سل گئے تھے۔ الفاظ حلق کے اندر ہی پھنس گئے۔

"اندھی تو لگتی ہی ہیں مگر مینرزلیس بھی ہیں۔" اس نے قدرے غصے سے اس ساکن مجسمے کو دیکھا۔ جس کے منہ سے معذرت کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔

"نجانے کیسے کیسے عجوبے اب اس جگہ پر آنے لگے ہیں۔" اکتائے انداز میں طنز کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے۔ وہ بھاری ہوتے قدموں کو زبردستی دھکیلتی آگے بڑھنے لگی۔ چوٹ، بے عزتی، دونوں رلا رہی تھیں۔

"اوہو...... لگتا ہے بوائے فرینڈ نے دھوکہ دیا ہے جو اتنا رو رہی ہے۔"

تین لڑکوں کا ٹولہ، شرٹس کے نیچے شارٹس پہنے۔ گلے میں موٹی چین اور ہاتھوں میں آئس کریم کپ تھامے اس شکل سے بدتمیز نظر آنے والے لڑکے نے ایک قدم اس کے قریب آ کر کہا تھا وہ ڈر کر اچھلی۔ وہ خباثت سے ہنسا۔ پھر اس کے لپٹے لپٹائے وجود کو حریص نظروں سے دیکھتے سرگوشی کی۔

"وہ نہیں آیا تو کیا ہوا۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ آزمائش شرط ہے۔" بیلا کا سانس اکھڑنے لگا۔ خوف سے وجود جام ہو رہا تھا۔ اس نے ادرگرد دیکھا۔ اس جگہ پر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ زیادہ تر ٹریول ایجنسیز کے آفس تھے جو کہ بند پڑے تھے۔ وہ کیا کرے۔

اس کا خوف زدہ چہرہ انہیں اور شیر کر رہا تھا۔ بلیو شرٹ والا، جس کے کان میں بالی تھی۔ اب اس کے بائیں طرف آ کھڑا ہوا تھا۔ دائیں طرف پہلے ہی وہ چین والا تھا۔

"بچی کو ڈرا دیا تم نے موٹی، ڈرو مت میں ہوں ناں...... ارے تمہیں تو پسینے آ رہے ہیں۔ رومال کہاں ہے میرا۔" وہ جیبیں ٹٹولتا اداکاری کرتا اسے مزید

ہراساں کررہا تھا۔

"اوہ...... وہ تو ہے ہی نہیں۔ چلو خیر...... ہاتھ سے ہی کام چلالیتا ہوں۔" اس کے دونوں ساتھی ہنس رہے تھے۔ بیلا کو لگا اگر وہ مزید یہاں کھڑی رہی تو شاید زندگی بھر کی کمائی لٹا دے گی۔

"اے اللہ رحم...... اے اللہ مدد فرما۔" شدت سے پکاری گئی فریاد خالی نہیں گئی۔ اسی وقت ایک مانوس آواز آئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟"

☆☆☆

بارش پھر برس رہی تھی۔ دو دن قبل شروع ہونے والا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ موسم جو کچھ قدرے گرم ہو گیا تھا پھر سے اپنے اندر خوش گوار ٹھنڈک سمائے بدلی سا گیا۔ آج دادی کو بھی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ افطاری کے وقت اور سونے سے پہلے بھی چائے نے چکی کی تھیں۔ رات کے سناٹے میں یا تو بارش کی مدھم رم جھم کی آواز تھی یا پھر اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی۔ مسجد سے آتی تلاوت کی آواز اس کی آنکھوں میں جیسے پانی کو قطرہ قطرہ پگھلا رہی تھی۔ دو دن سے چڑھا بخار آج کم ہوا تھا اور اس بخار نے اس کا بھرم رکھ لیا ورنہ دادی اگر جان جاتیں تو۔

وہ مصلے پر بیٹھی اپنی کوری ہتھیلیوں میں گرتے ان آب دار موتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو قطار در قطار اس کے چہرے کو بھگوتے ان میں گر رہے تھے۔

شکر گزاری کے احساس نے الفاظ کو منجمد کر دیا تھا۔ اگر وہ کچھ کر لیتے؟ ان کے ناپاک ہاتھ اس چھو لیتے؟ یہ احساس اسے بے چین کر دیتا۔ اس نے ساری زندگی بہت محتاط گزاری تھی۔

وہ تو مان تھی اماں کا، دادی کا، بھائیوں کا، برآمدے میں مصلے پر بیٹھی وہ اپنی سسکیوں کو گھونٹ رہی تھی اور کمرے کی کھڑکی میں کھڑا آریز یوسف دکھ سے اس اچھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس دن اگر وہ وقت پر نہ پہنچ پاتے تو وہ شاید زندگی بھر خود کو معاف نہ کر پاتا۔ آپی کی کال پر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ کیسے گم ہو سکتی ہے؟ انجان شہر میں۔ انجانی جگہ پر ان کو کھوج نہیں سکتی تھی۔

اس نے نوشین کی بات سنی تو جلدی سے سب چھوڑ کر ان تک جا پہنچا۔ خود گھبرائی ہوئی تھی وہ تو صرف ٹرائل روم میں سوٹ چیک کرنے گئی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ پیچھے سے وہ غائب ہو جائے گی۔ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتے اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی صورت حال سے دوچار ملے گی۔ ان تینوں کی تو اس نے ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کی۔ کانپتی لرزتی بیلا کی حالت دیکھ کر اسے جیسے خود پر قابو نہیں رہا۔

جس لڑکی کے بالوں کو اتنے دنوں سے اس نے نہیں دیکھا تھا۔ جسے دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا اس باحیا لڑکی کو وہ تینوں لفنگے گھیرے ہوئے تھے۔ اپنا وہ روپ اس کے لیے بھی باعث حیرت تھا۔ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ خود سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تینوں کو مال کی سیکیورٹی کے حوالے کر کے وہ جب گھر لوٹے تو آپی کو اس نے سمجھا دیا کہ گھر میں کیا بتانا ہے۔

وہ قابل ترس نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی کو اس کی ذات پر بات کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ سو شرمندہ سی آپی نے بھی بتایا کہ رش کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہونے لگی تو انہوں نے جوس پلا دیا۔ جو شاید خراب تھا کہ اسے الٹیاں شروع ہو گئیں۔

فیاض بھائی نے اسے خیال رکھنے کی تاکید کی۔ دادی بھی مطمئن ہو گئیں۔ سو اس کا بھرم قائم رہا۔

مگر اندر جو توڑ پھوڑ تھی اس کا نتیجہ بخار کی صورت نکلا۔

☆☆☆

"ماموں، آئیں نا پلیز۔"

مظہر مسلسل آریز کا دماغ کھائے جا رہا تھا۔

وہ زچ ہو گیا۔

"آپی، بتائیں ذرا اپنے لاڈلے سپوت کو کہ ان کے گھر پری کب آئے گی۔" مظہر کے دوست کی بہن ہوئی تھی تب سے جناب مصر تھے کہ انہیں بھی ایک چھوٹی سی بہن چاہیے۔ اب انہیں اس بات کا

تجسس تھا کہ بہن صاحبہ ملتی کہاں پر ہے۔

"بیٹا! اب تو آپ کے ماموں کی زندگی میں پری آئے گی۔ ہمارے گھر نہیں۔" نوشین نے شرارتی انداز میں آریز کو دیکھا۔ وہ کھنکھارا۔

"آپی...... بری بات۔" نوشین ہنس کر مسکرائی۔

اس وقت وہ لوگ صحن میں بیٹھے تھے، آج سارا دن دھوپ نکلی رہی مگر اس وقت بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھیں۔ نوشین چائے کے ساتھ حلوہ بنالائی۔ دادی بیلا کو بھی زبردستی کھینچ لائیں۔ ان کے معنی خیز اشاروں سے بے نیاز بیلا اب مظہر کو سمجھا رہی تھی۔

"اچھا...... روز دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ ایک ننھی سی پری بھیج دیں گے؟" اس نے ہنس کر سر ہلایا۔

"مگر آپی...... وہ آئے گی کیسے۔ کون لائے گا اسے؟" اسے فکر تھی۔

"اسے ایک پرندہ لائے گا پھر وہ آپ کی چھت پر چھوڑ کر چلا جائے گا۔" آریز نے دیکھا وہ بڑے پیار سے ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی مگر مظہر کے اگلے سوال نے اسے ذرا ٹھٹکا دیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

آریز اس صورت سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو دادی انگشت بدنداں تھیں جو حرے سے کہہ رہا تھا۔

"آپ غلط کہہ رہی ہیں بیلا آپی، بچے تو ہاسپٹل میں ہوتے ہیں۔ آپ کیا ڈرامے نہیں دیکھتیں؟ وہاں بتاتے ہیں ناں کہ......"

اور اس کا اگلا جملہ جہاں بیلا کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا وہیں نوشین بھابی بھی شرمندگی سے اسے ڈانٹنے لگی، آریز کا قہقہہ البتہ بے ساختہ تھا۔ دادی تو مارے صدمے کے منہ کھولے ہنستی ہی رہ گئیں۔ بچے تھے کہ قہر۔

☆☆☆

دادی کی رپورٹس اچھی آئی تھیں۔ وہ لوگ اب گھر جاسکتے تھے۔ بیلا یوں بھی ادھر سے جلد جانا چاہ رہی تھی سو اسی دن واپسی کی رٹ لگا دی۔ فیاض بھائی ناراض بھی ہوئے۔ وہ چپ تو ہوئی مگر اس شرط پر کہ کل واپسی ہر حال میں ہوگی۔

"آپی! آپ نے بات کی بھائی جان سے۔" آریز نے گفٹ پیک کرتی نوشین سے پوچھا۔

"کرلی ہے۔ امی سے بھی بات ہوگئی ہے میری۔"

"پھر؟" اس کا سوالیہ انداز سمجھی نہیں۔

"پھر کیا؟"

"آپی......" وہ زچ ہوا۔ "آپ نے دادی سے بات کی؟"

گفٹ کے گرد ربن لپیٹ کر اس نے اطمینان سے ٹیپ چپکائی پھر دانتوں سے اسے کاٹ کر فارغ ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تم اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو آریز۔"

"آپ اتنی دیر کیوں کر رہی ہیں۔"

الٹا سوال ہوا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔

"دیکھو آریز۔ بیلا ہر لحاظ سے اچھی لڑکی ہے مگر......" وہ رک گئی۔ آریز مزید زچ ہوا۔

"مگر تم ایک نہایت خبیث لڑکے ہو۔" اس نے بے ساختہ گہرا سانس بھرا۔ نوشین اب ہنس رہی تھی۔

فیاض نے یہ بات خالہ بی کے کانوں میں ڈال دی ہے۔ امی ابو یوں بھی آ جانے والے ہیں پھر باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں گے۔ دھوم دھام سے۔" وہ مسکرا دیا۔

"ویسے سوچ لو آریز۔ وہ چھوٹے سے شہر کی لڑکی ہے۔ کل کو تمہیں ہی اعتراض نہ ہو اس کی سادگی اور حلیے پر۔" نوشین نے سنجیدگی سے کہا۔ اسے بیلا واقعی عزیز تھی۔

"میں نے محبت اسی وجہ سے تو کی ہے آپی جو حیا جو پاکیزگی اس میں ہے وہی تو اس کا اصل حسن ہے۔ پھر میں نہیں چاہتا کہ ایسی بیوی لاؤں جو کل کو گھر میں آپ کا داخلہ بھی بند کر دے۔" الٹا ان پر احساس جتایا گیا۔

"لو...... اگر لاتے تو اسی وقت چٹیا سے پکڑ کر باہر نہ نکال دیتی۔ کم نہ سمجھو مجھے۔"

"جانتا ہوں۔ جانتا ہوں، فیاض بھائی کا حال

میرے سامنے ہے۔" عقیدت سے کہتا وہ اسے تپا گیا۔

"بدتمیز۔" اس نے تکیہ اٹھا کر دے مارا۔ ہنستے ہوئے اس نے کیچ کر لیا۔

☆☆☆

ماں اس کے صدقے جا رہی تھیں۔ گھر آ کر لگا جیسے محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔ ہر سرد و گرم سے محفوظ ہو گئی ہو۔ طاق راتوں میں وہ اماں کے ساتھ مل کر عبادت کرتی تھی اس بار دو راتیں گزر چکی تھیں۔

اس کی سکھیاں اس کے آنے کا سن ملنے آ گئیں۔

دادی نوشین بھابھی اور فیاض بھائی کی تعریف کرتے تھکتی نہیں تھیں۔ بھابھی نے کتنے سارے تحائف ساتھ کر دیے تھے۔ پیلا دادی کو سن کر مسکرا دیتی۔ اسے ان کے شروع کے دنوں کے جملے یاد آ جاتے۔

آج انتیسواں روزہ تھا۔ اماں کئی بار کہہ چکی تھیں کہ وہ جا کر چوڑیاں لے آئے۔ وہ ہر بار ٹال جاتی۔ اماں مصروف تھیں۔

راحیلہ اپنی امی کے ساتھ جا رہی تھی اس نے دو بار جواب بھجوایا مگر اس کے انکار پر وہ چلی گئی۔ اماں ناراض ہوتی رہیں۔ دادی نے بھی بتیرا کہا مگر وہ سستی سے لیٹی رہی۔ بازار کے نام سے اسے وہ واقعہ یاد آ جاتا تھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اماں نجانے کس اہتمام میں مصروف تھیں۔ اس نے ہاتھ بٹانا چاہا مگر انہوں نے منع کر دیا۔

وہ دادی کے پاس آ گئی۔ محلے سے بچوں کی پرجوش آوازیں آ رہی تھی۔ سب خوش تھے۔ کل عید متوقع تھی سو ایک خوشی کا احساس۔ عیدی ملنے کی آس انہیں پرجوش کر رہی تھی۔ دادی نے اسے جو یوں اجڑے حلیے میں دیکھا تو جلدی سے انڈا اور شہد منگوایا پھر اس کے نہ نہ کرتے بھی ماسک لگوا کر سر کی خوب مالش بھی کی۔ اماں نے کچن سے جھانکا۔

"افراز عید کے جوڑے لے آیا تھا وہ استری کر لو۔ میرے اور اماں کے بھی جوڑے نکال لینا۔"

اماں کو جیسے پکا یقین تھا کہ کل ہی عید ہو گی۔

کپڑے استری کر کے وہ فارغ ہوئی تو نہانے گھس گئی۔ شہر میں گزشتہ چھ سالوں سے وہ لوگ رہ رہے تھے۔ ابا کو شوق تھا کہ ان کے بچے پڑھیں۔ گاؤں میں اسکول صرف پرائمری تک تھا۔ افراز بھائی روز شہر آتے جاتے۔ پھر ابا نے گاؤں کی تھوڑی زمین رکھ کر ساری بیچ دیں۔

دادی خوش تو نہیں تھیں مگر مجبوری تھی ابا کو شہر آ کر رہنا زیادہ نصیب نہ ہوا۔ تین سال پہلے وہ ایک رات ایسے سوئے کہ پھر اٹھے ہی نہیں۔ ان کا جانا ایک بڑا صدمہ تھا مگر وقت ہر زخم کا علاج ہے۔ ان سب کو بھی صبر آتا گیا۔

افراز بھائی نے زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ ایک باغ تھا وہ بھی ٹھیکے پر تھا۔

دادی نے اس چھوٹے شہر میں بھی اپنا پورا پنڈ سا بنا رکھا تھا۔ گھر کی بھینس تھی۔ سو دودھ لسی کی فراوانی تھی۔ مرغیاں بھی رکھیں مگر اس سال اماں نے ہٹوا دیں۔ پکا بنا گھر تھا۔ مرغیاں بہت گند ڈال دیتی تھیں۔ سال کے سال گاؤں سے سوغاتیں آ جاتیں اور عید کے تیسرے روز وہ لوگ عید کرنے گاؤں والے گھر چلے جاتے جہاں زیادہ تر رشتے دار رہائش پذیر تھے۔ اماں نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔ تلنے کا کام باقی تھا۔ وہ ان کے سپرد کر کے وہ نکلنے لگیں تو کچھ یاد آنے پر واپس مڑیں۔

"میں نے عید کے جوڑے کے پیسے بھجوائے تھے۔ تم نے جوڑا لیا نہیں تھا؟"

ان کے یوں استفسار پر وہ چپ ہی رہ گئی کیا کہتی۔

"چلو رہنے دو۔ نوشین نے بھی بڑے خوب صورت دو جوڑے دیے ہیں۔ ان میں سے کوئی پہن لینا۔" وہ نکلیں تو اس نے گہری سانس لی۔

ہر بار وہی ذکر کیوں آ جاتا تھا۔ اس ذکر کے ساتھ اسے آریز کی وہ دیوانگی یاد آ گئی۔ اس نے کیسے دھنک کر رکھ دیا تھا تینوں کو۔ نجانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اب سوچتی تو دل عجیب سی سرگوشی کرنے لگتا۔

وہ نظر انداز کر دیتی۔ ضروری تو نہیں کہ دل کی ہر بات ہی سنی جائے۔ اسے تو عادت ہے راہ سے بھٹکانے کی۔

اور اماں کے اتنے اہتمام کا پول بھی کھل گیا۔ جب افطار سے آدھے گھنٹے پہلے۔ فیاض بھائی کی فیملی آریز اور اس کے امی ابو کے ساتھ آئی۔ وہ حیرانی سے سب کو دیکھ رہی تھی اور آریز بھرپور مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیرت میں ڈوبی آنکھیں دیکھنا اسے اس کی وہ آنسوؤں بھری سی نگاہیں یاد آ گئیں جسے دیکھ کر وہ دیوانہ وار ان لفظوں پر جھپٹ پڑا تھا۔

وہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔ چمکتی رنگت میں زردی کم ہو چکی تھی اور جب نوشین بھابھی نے اس کے گلے لگتے، شوخی سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"دیکھو...... ہم پری کو لینے آ گئے ہیں۔"

تو وہ چونک اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی بے اختیار آریز کو دیکھنے لگی۔ وہ شاہ نواز سے مل رہا تھا۔ مسکراتا ہوا۔ ویسا ہی تھا۔

جو سمجھ میں آ رہا تھا پر ذہن و دل یقین نہیں کر پا رہے تھے۔ مگر بھابھی کی امی کا التفات اماں کی مسکراہٹ یہ سب کہہ رہے تھے کہ دل کی سرگوشی سچی تھی۔

نوشین اسے لگاتار چھیڑے جا رہی تھی۔ اس کا سامنا کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں بند گئی اور جب چاند کا اعلان ہوا تب نوشین نے زبردستی کمرہ کھلوایا۔

"کہو کیسا لگا ہمارا سرپرائز؟"

"بھابھی...... یہ سب کیوں؟" دل میں مچلتا سوال لبوں پر آ گیا۔ وہ محبت سے مسکرائی۔

"میرا بھائی بہت اچھا ہے بیلا۔ بہت مخلص اور اسے تم جیسا خالص ہم سفر چاہیے۔ وہ یہ اظہار چاہتا تو خود بھی کر سکتا تھا مگر تمہاری حیا نے اسے سمجھا دیا کہ اگر تمہیں پانا ہے تو سیدھا راستہ اپنانا ہوگا۔ تم بہت اچھی ہو اور اچھے لوگوں کو انعام بھی تو ملنا چاہیے نا۔"

وہ سر جھکا کر آنسو پینے لگی۔ اس بدنما واقعہ کی ساری کلفت جیسے اترنے لگی۔

"اونہوں۔ اب اور آنسو نہیں بہاؤ گی۔ تم زندگی میں اچھے برے ہر طرح کے واقعات ہوتے ہیں۔ بہتر ہے جو برا ہوا ہے بھول کر آگے بڑھو اور۔

"یہ چوڑیاں پہن لو۔" یہ جملہ کھڑکی کے راستے سے آیا تھا۔ آریز نے ہاتھ میں پکڑی سنہری خوب صورت چوڑیاں اچھالیں۔ وہ ادھر نجانے کب سے کھڑا سن رہا تھا۔ نوشین نے چیخ کیا پھر اسے گھورا۔

"تم ادھر کیا کر رہے ہو؟"

"میں تو بس اس امید پر کھڑا تھا کہ ابھی یہ محترمہ بھی کوئی خوب صورت بات کہیں گی۔ مگر لگتا ہے ان تلوں میں تیل نہیں۔ سو میں ہی کہہ دیتا ہوں کہ...... میرا لایا ہوا جوڑا پہن کر یہ چوڑیاں بھی چڑھا لینا کیونکہ"

وہ رک گیا بیلا کا سر شرم سے جھک کر سینے سے جا لگا۔ نجانے وہ کیا بول دے۔

"اس پر میں نے بہت خرچا کیا ہے۔" جہاں بیلا کا سر اٹھا اور منہ کھلا۔ وہاں اس کا قہقہہ اور نوشین بھابھی کی قل قل کرتی ہنسی نے اسے ایک دم احساس دلا دیا کہ اس کے چہرے پر بکھرے رنگوں کو تو وہ پہلے ہی دیکھ کر اس کے دل کا حال معلوم کر چکا ہے۔ گرم سے گلنار چہرے کے ساتھ وہ مسکراہٹ چھپاتی منہ موڑ گئی۔

چاند رات کی ساری خوب صورتی اس پل اس چھوٹے سے گھر میں اتر آئی تھی۔ آریز جاتے جاتے بھی چھیڑ گیا۔

"مظہر کو بتا دیتا ہوں کہ اگلے سال ایک چھوٹی سی پری کی آمد متوقع ہو سکتی ہے اگر کوئی اعتراض نہ کرے تو۔"

نوشین نے گل رنگ چہرے والی بیلا کو گلے لگا لیا۔ وہ کٹی کٹی سی بیٹھی اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور دل تھا کہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ پاگل۔

☆☆

مکمل ناول

تجھ کو میں رکھ لوں وہاں
جہاں پہ کہیں ہو میرا یقین
میں جو تیرا نہ ہوا
کسی کا نہیں۔ کسی کا نہیں
لے جائیں جانے کہاں یہ ہوائیں
بیگانی ہیں یہ راہیں
لے جائیں جانے کہاں۔ نہ تم کو خبر نہ مجھ کو پتا

وہاج لاج کے گیٹ سے گاڑی اندر لاتے ہوئے اس کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔ جیسے ہی چوکیدار نے گیٹ وا کیا تھا۔ بلیک مرسیڈیز کچھ آگے کو چلتی ہوئی پورچ میں آ کر ٹھہر گئی تھی، جھٹکے کے ساتھ گاڑی کا دروازہ کھولتا وہ ایک بازو پر کوٹ گرائے دوسرے ہاتھ سے اپنی کنپٹی دباتا گاڑی سے باہر آیا تھا۔

وہ شخص جو آج بھی زویا تالپر کی محبت کا زہر اپنی رگ رگ میں اتار کر گھر لوٹا تھا۔

وہ وہاج ابراہیم جس نے کبھی اپنی زندگی میں سگریٹ تک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس نے آج پھر پی لی تھی۔

مگر سوال یہ تھا، اس زہر کو اس کی زندگی میں شامل کس نے کیا تھا۔ یہ وہی تو تھی دشمن جاں جس کا عشق اس کے دل میں کسی بپھرے ہوئے سمندر کی مانند شور مچاتا پھر رہا تھا۔ عشق بھی ایسا شدید کہ اگر کبھی ذرا سا من سے باہر جھانک لے تو یہ شہر تنگ پڑ جائے۔ سارا نگر تنگ پڑ جائے۔

سحرش خان بھٹو

یہ یادیں جانے میرے سنگ کب تک چلیں
ان ہی میں تو میری صبح ڈھلے
شامیں ڈھلیں، موسم ڈھلیں
خیالوں کا شہر تو جانے
تیرے ہونے سے ہی آباد ہے
تیری ہیں یہ میری ساری وفائیں
مانگی ہیں تیرے لیے دعائیں
لے جائیں جانے کہاں یہ ہوائیں
نہ تجھ کو خبر نہ مجھ کو پتا...... ہو ہو

ٹوٹے بکھرے لہجے میں گنگناتا وہ لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

مگر جیسے ہی نظر اس پتھر کی مورت پر پڑی اس کے ہلتے لب سل گئے۔

"وہاج! آ گئے آپ؟" سفید رنگ کی ڈبل جارجٹ کی انتہائی خوب صورت میکسی میں ملبوس وہ بے چین سی ہو کر اس کی جانب بڑھی تھی۔

اس کی اس اداکاری پر وہاج نے نفرت سے اپنے لب بھینچ لیے تھے۔

"کھانا لگا دوں آپ کے لیے؟" قریب آتے، اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں زہر لا دو میرے لیے۔" وہ زہر خند ہوا۔
وریشہ ٹالپر کی آنکھوں کی سطح نم ہونے لگی۔

"اچھا چلیں، آپ فریش ہو جائیں۔" ہمیشہ کی طرح وہ ایسے بولی تھی جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

تب اس کی ڈھٹائی پر غصے سے بے قابو ہوتے وہاج ابراہیم ٹالپر نے ہاتھ میں تھاما سیاہ کوٹ صوفہ پر پھینکنے کے بجائے اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اور اتنی ذلت پر وہ ساکن کھڑی رہ گئی تھی۔

جبکہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا، اور خلاف بھی نہ ہوا
عجب تھا جرم محبت کہ جس پر دل نے میرے
سزا بھی پائی نہیں اور معاف بھی نہ ہوا

وریشہ رضا ٹالپر نے دونوں ہاتھوں میں اپنا دلکش چہرہ چھپا لیا اور گرنے کے انداز میں کاؤچ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

☆☆☆

یہ پیری مریدی کے سلسلے ہم نہیں جانتے
صاحب دل پر حکمرانی محبت ہی کی چلے گی بس

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔

لمبا سانس کھینچتا دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دباتا وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"یا وحشت! آخر یہ اذیت کم کیوں نہیں ہوتی۔"
بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس نے یاسیت سے سوچا۔

"گڈ مارننگ وہاج۔" ٹھیک اس وقت وریشہ ٹالپر نے کمرے کے اندر جھانکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میر وہاج ٹالپر نے سرعت کے ساتھ اپنا منہ دوسری سمت موڑ لیا تھا۔

"یہ لیجیے جناب! آپ کے لیے گرما گرم کافی حاضر ہے۔" خوش گوار لہجے میں کہتے اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے بیڈ پر وہاج کے سامنے رکھ دی تھی۔ پھر پلٹ کر وارڈ روب کھولا اور اس کے آفس پہن کر جانے کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

ایک چبھتی ہوئی نگاہ بیوی کی پشت پر ڈالنے کے بعد وہ سامنے رکھا بھاپ اڑاتا ہوا مگ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگا تھا۔ کیونکہ یہ بات تو بہر حال وہ بھی جانتا تھا کہ اس کے نشے کا توڑ تو بلیک کافی میں ہی تھا۔

"آپ شاور لے کر فریش ہو جائیے...... جب تک میں آپ کے لیے، آپ کا فیورٹ ناشتہ بناتی ہوں۔" کمرے سے باہر جاتے ہوئے حسب عادت وہ کہہ گئی تھی۔

کافی ختم کرنے کے بعد خالی مگ وہاج نے

ٹرے میں پنچا تھا۔ اور خود اٹھ کر واش روم میں گھس گیا تھا۔

"وہاج سائیں! نیند سے اٹھ گئے وریشہ بی بی۔" ماسی زرینہ نے اسے قیمے والا پراٹھا بیلتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں ماسی! اٹھ گئے وہ۔ اب تو شاید شاور بھی لے چکے ہوں گے۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

ٹھیک اس وقت سیڑھیوں پر وہاج ابراہیم کے قدموں کی آہٹ ابھری۔

"ماسی! ایسا کرو، یہ پراٹھا تم توے پر ڈال دو پلیز۔" وریشہ نے عجلت میں کہتے فرائی پراٹھا توے پر سے اتار کر پلیٹ میں ڈالا اور لاؤنج کی طرف آ گئی۔

"وہاج! ناشتہ کر لیں پلیز۔" مضبوط کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے وہ جو سرعت سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر دانت پیس کر رہ گیا۔ مگر رکا پھر بھی نہیں۔

"وہاج سنیے تو...... رکیں پلیز۔" اس کو لاؤنج کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ اس کے سامنے آ گئی۔

وہاج فار گارڈ سیک۔ ناشتہ کر کے جایئے۔ دیکھیے، میں نے آپ کے فیورٹ قیمے کے پراٹھے بنائے ہیں۔" لجاجت بھرے انداز میں کہتے اس نے پلیٹ وہاج کے سامنے کی تھی۔

"یہ پراٹھے ہونہہ!" اس نے دانت کچکچائے۔

"یہ جا کر تم اپنے اس ایڈیٹ بھائی کو کھلاؤ، بلکہ ابھی کال کر دو، دوڑا چلا آئے گا وہ۔ میری طرح اس کے بھی یہ فیورٹ ہیں۔" طنزیہ نگاہیں اس کے چہرے پہ جمائے وہ الفاظ کو چبا کر ادا کرتا وریشہ ٹالپر کی آنکھیں بھگو گیا تھا۔

"انہیں تو بھابی کھلاتی ہوں گی۔ مگر میں نے یہ تو آپ کے لیے بنائے ہیں۔" حد درجہ معصومیت کے ساتھ وہ بولی تھی۔ لیکن اس کا اتنا کہنا غضب ڈھا گیا تھا۔ زویا ٹالپر کو وریشے کا بھابی کہنا میر وہاج کے دل کو چیر گیا تھا۔ وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔

"یو نان سینس۔" طیش میں آ کر ہاتھ مارا اور پراٹھوں والی پلیٹ دور اچھال دی۔

"یہ تم بار بار...... میرے سامنے بھابی...... بھابی، کی رٹ لگا کر کیا جتانا چاہتی ہو؟ یہ ہی کہ تمہارا بھائی کتنا بڑا شاطر کھلاڑی ہے۔ خاندان بھر میں اس جیسا کوئی سازشی دماغ نہیں رکھتا۔ رو رو کر ناٹک کر کے اس نے میری محبت کو مجھ سے چھینا ہے۔ اور تم جیسی میسنی بلی کو میرے گلے میں ڈال دیا۔ لیکن میں بتا دوں تمہیں کہ تمہاری اوقات ہمیشہ وہی رہے گی جو پہلے دن سے تھی...... نہ کبھی تم میرے قابل تھیں...... نہ کبھی بن سکو گی...... سمجھیں تم۔"

الفاظ کے زہریلے تیر اس کے دل میں اتار کر وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی، اس کے ساتھ ہی موتیوں کے دو قطرے گھنی پلکوں کی باڑھ توڑ کر فرش پر آ گرے تھے یہ ہی تو مقدر تھا وریشہ رضا ٹالپر کے آنسوؤں کا۔ وہ یونہی تو رلتے تھے۔

ایک دکھ پر ہزار آنسو
اف یہ آنکھوں کی شاہ خرچیاں

☆☆☆

حیدر آباد کے ڈیفنس ایریا میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر میوزک سسٹم آف کر دیا تھا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے زمینوں پر اچانک کھڑے ہونے والے تنازعے کی وجہ سے گاؤں میں رکا ہوا تھا۔

بابا جانی نے فون کر کے اس کو خود بلایا تھا۔

کیونکہ انہیں اس کی فہم و فراست پر بڑا مان تھا۔ جو کہ کسی حد تک درست بھی تھا۔ وہ بے حد ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ نڈر اور بہادر بھی تھا۔

فی الحال تو وہ دشمنوں کو مات کا مزا چکھا کر شہر لوٹا تھا مگر پھر بھی یہ مسئلہ کسی حد تک پھیلا ہوا تھا۔

رضا ٹالپر کی جانب سے خاندان بھر کے مردوں کو اپنے ساتھ ہتھیار رکھنے کی ہدایت دی گئی تھی۔

دشمن چالاک تھا سو احتیاط لازمی تھی۔

میر زریاب رضا ٹالپر محتاط انداز میں ڈرائیونگ

کرتا شہر کی حدود میں داخل ہوا تھا۔

اور گھر کا خیال آتے ہی دھیان اس پری وش کی جانب چلا گیا۔ جو اس کے حواسوں پر چھائی رہتی تھی۔ زویا تالپر اس کی بچپن کی محبت اور حسن اتفاق کہ بچپن کی منگ بھی تھی۔ وہ اس کی ضد تھی۔ اس کا جنون تھی مگر کیا غضب تھا کہ جواب باوجود اس کی دسترس میں ہونے کے اس سے میلوں کے فاصلے پر تھی۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے مگر دو اجنبیوں کی طرح۔ زویا کے مسکراتے لب اس پر نگاہ پڑتے ہی کملائے ہوئے گلاب بن جاتے۔ نرگسی آنکھوں کی جلتی روشنیاں بجھ کر دھواں ہو جاتیں۔

وہ لڑکی جو اس کی پہلی محبت تھی۔ اور شاید پہلی ہی خطا بھی۔ اس کی زوج میں تو کسی اور ہی کے عشق کا جہاں آباد تھا۔

وہ جس موم کے پیکر کو دیوانہ وار کن انکھیوں سے تکتا رہتا۔ وہ تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہاج ابراہیم کے ہجر میں سسکتی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی شریک حیات تھی۔ مگر زریاب نے کبھی ہاتھ بڑھا کر اس کانچ کے پیکر کو چھوا تک نہ تھا۔

وہ تو بس اس سے خاموش محبت کیے جاتا۔ لیکن کبھی کبھار تھکن اس کے اعصاب پر غالب آنے لگتی تھی۔ جب باوجود کوشش کے اپنا عکس وہ زویا تالپر کی آنکھوں میں ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا۔ تب اس کا دل چاہتا۔ وہ ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اس پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ مگر اس شخص میں کمال کا ضبط تھا۔

وہ اذیت بھری ہنسی ہنستا پھر لہجے کو لاپروا بناتے گویا ہوتا۔

"اے زندگی تھکا دیا تو نے تو مجھے۔"

زویا تالپر جانتی تھی۔ وہ "اے زندگی" کہہ کر اس کو ہی مخاطب کر رہا ہے۔ سو فوراً آنکھوں میں نمی سجا کر کہہ دیتی۔

"تھکا تو مجھے ڈالا ہے زریاب تالپر! زندگی نے۔ دیکھیں میرے پیروں کی ایڑیوں سے لہو رسنے لگا ہے۔" وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہتی خاموشی سے اٹھ جاتی۔

اور وہ اس جگہ کو تکتا رہتا جہاں کچھ دیر پہلے زویا تھی کیا وہ چاہتی تھی وہ کہ میر زریاب تالپر اپنے فیصلے پر پچھتانے لگے۔

تو کیا وہ واقعی پچھتانے لگا تھا! اپنی بہن کا گھر بچانے کے فیصلے پر، اپنا دل بچانے کے فیصلے پر؟

☆☆☆

ابراہیم تالپر، رضا تالپر، فاروق تالپر، یہ تینوں آپس میں بھائی تھے۔ سوہن پور گاؤں میں ان کی بہت ہی بڑی حویلی تھی۔ کئی مربع پر زمینیں تھیں۔ شہر میں کئی فیکٹریاں تھیں۔ جن کی دیکھ بھال ابراہیم تالپر کرتے تھے۔ جبکہ زمینوں کا تمام انتظام بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے رضا تالپر سنبھالے ہوئے تھے۔

فاروق تالپر ڈاکٹر تھے اور خیر پور میرس میں ابراہیم تالپر کے ساتھ تالپر ہاؤس میں رہائش پذیر تھے۔

رضا تالپر کے تین بچے تھے بڑے بیٹے عباد رضا جو شادی شدہ تھے گاؤں میں انہوں نے اپنا پرائیویٹ ہاسپٹل بنا رکھا تھا۔ دوسرا اور چھوٹا بیٹا زریاب تالپر تھا۔ پھر دریشہ تالپر تھی چھوٹی اور اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے وہ بابا اور زریاب دونوں کی بے حد لاڈلی تھی۔

میر ابراہیم کا ایک ہی فرزند تھا میر وہاج ابراہیم، فاروق تالپر کی دو بیٹیاں تھیں۔ زویا تالپر جو وہاج اور زریاب سے ایک سال ہی چھوٹی تھی عمر میں۔ یہ ہی وجہ تھی بچپن میں ان تینوں کی آپس میں بے حد دوستی ہوا کرتی تھی۔ زویا تالپر کے بعد ردا تھی جو پورے تالپر ہاؤس کی کمانڈو تھی۔

☆☆☆

بابا نے زریاب کو شہر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ خیر پور میرس کے ہی ایک بڑے اسکول میں وہاج کے ساتھ پڑھتا تھا۔ زویا تالپر ان دونوں سے صرف دو جماعتیں ہی پیچھے تھی۔

تالپر خاندان میں رواج تھا۔ بچوں کے رشتے بچپن میں ہی طے کر دیے جاتے، زویا تالپر میر

زریاب رضا کی منگ تھی۔ اور یہ بات وہ جانتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی وہ اس کو بچپن سے ہی چاہتا آرہا تھا۔

جبکہ زریاب کی بہن وریشہ رضا وہاج ابراہیم کی منگ تھی۔

وریشے، رضا تالپر کی بے حد لاڈلی تھی سو وہ اسے شہر اپنے سے دور بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے گاؤں کے قریبی شہر کے اسکول میں اس کا ایڈمیشن کروادیا۔ اور وریشے کے لیے گاڑی ڈرائیور کا انتظام بھی کردیا۔ یوں وہ روز پورے دو گھنٹے کا سفر کر کے شہر پڑھنے جایا کرتی تھی۔

تھی تو وہ پڑھائی میں زریاب ادا ہی کی طرح ذہین مگر جانے کیا وجہ تھی کہ جب بھی زویا۔ ردا اور وہاج گاؤں گھومنے آتے، اس کو اپنے ساتھ کھیل میں شامل کرنے سے انکار کردیا کرتے۔

شاید وہ اپنی اس کزن کو گاؤں میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے جاہل، ان پڑھ سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ وریشے ابراہیم چاچا سائیں کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے شہر رہنے کے لیے آگئی تھی جب اس کو اندازہ ہوا۔ زویا آپی اور وہاج ابراہیم اس کو کس درجہ جاہل خیال کرتے ہیں۔

اس روز اتوار تھا۔ زویا اور وہاج دونوں لاؤنج میں بیٹھے کمپیوٹر پر گیم کھیل رہے تھے۔ جب اپنی لمبے بالوں والی گڑیا لے کر وریشہ بھی ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر کھیلنے لگی۔

”ہے وہاج!...... لک ہر ڈول......“ (دیکھو اس کی گڑیا) زویا اچانک اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”چچ، چچ! بے چاری گاؤں میں رہتی ہے ناں ۔ جب ہی ایسا اسٹوپڈ گیم کھیل رہی ہے...... مما نے مجھے بتایا تھا۔ گاؤں میں ساری لڑکیاں کپڑے سے بنی گڑیا کے ساتھ ہی کھیلتی ہیں۔“ وہاج طنزیہ مسکرایا تھا۔

”اوہ رئیلی وہاج! اسے تو پھر کمپیوٹر پر گیم کھیلنا بھی نہیں آتا ہوگا۔ اور نہ ہی فیری ٹیلز پڑھنا آتی ہوں گی۔“

”یس زی یو سے رائیٹ۔ (تم ٹھیک کہہ رہی ہو زی!) یہ تو شکل سے ہی گنوار لگتی ہے۔“ وہاج اس کی بات کی تائید کرتے زور سے ہنسا تھا۔ زویا کی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔

وہ بس خاموش بیٹھی انہیں ہنستا دیکھتی رہی تھی۔ بس اس کی جگنوؤں جیسی آنکھوں میں آنسو بننے کا عمل تیزی سے جاری رہا تھا۔

وہ ان دونوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ جاہل گنوار نہیں تھی۔ اس کو فیری ٹیلز آتی ہیں۔ کیونکہ اس کے پاس فیری ٹیلز کی بک ہے۔ جو اس کے لیے بابا شہر سے لے کر آئے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی اسے کمپیوٹر پر گیمز کھیلنا آتا ہے۔ لیکن وہ باوجود کوشش کے کچھ بھی بول نہ پائی تھی۔ کیونکہ وہاج کے سامنے بولنے سے اس کی جان جاتی تھی۔ جانے کیا وجہ تھی۔ وریشہ شروع سے ہی اس سے مرعوب رہا کرتی۔

شاید اس کا سبب بابا اور ابراہیم چاچا سائیں کی وہ باتیں تھیں جو اس روز اتفاقاً اس نے سن لی تھیں۔

”بس ادا سائیں! فیصلہ ہوگیا، وہاج بڑا ہو جائے، میں وریشہ کو اس کی دلہن بناؤں گا۔ آپ یاد رکھنا......اج کان وریشہ تھی وہاج جی منگ آ۔“ (آج سے وریشہ میرے وہاج کی منگ ہے) ابراہیم چاچا سائیں کا لہجہ اٹل تھا۔

اور یہ ہی وہ دن تھا جب اس کی آنکھوں میں وہاج تالپر کا عکس بس گیا تھا۔ یوں ننھی عمر میں ہی محبت کی آکاس بیل اس کے وجود میں اپنی جڑیں اتار چکی تھی۔

شہزادے تو میری نیند کاٹ چکا ہے
ٹھہرا ہی نہیں یہ جنگل تیری تلوار کے آگے

وریشے تالپر ہر رات خواب میں خود کو سنڈریلا اور وہاج کو اپنے پرنس کے روپ میں دیکھتی تھی۔ پر جانے کیا بات تھی جیسے ہی وہ سنہری بگھی سے اتر کر شاہی محل کی سیڑھیوں کی سمت آتی۔ سیڑھیوں پر بچھے سرخ مخملی کارپٹ پہ پرنس بنا کھڑا وہاج اس کو اپنی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر سرعت سے رخ موڑ کر

کھڑا ہو جاتا تھا۔

اور وہ اپنے خوابوں کے شہزادے کی بے رخی پر بوکھلا کر واپس بگھی میں آ کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ تب بگھی میں بیٹھ جانے کے بعد وریشے کو پتا چلتا کہ اس کے پاؤں میں پہنی ایک سینڈل تو سیڑھیوں پر ہی رہ گئی۔ بگھی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر وہ بے بسی سے سیڑھیوں پر چمکتی سینڈل کو تکتی اور کبھی وہاج کو جو ہنوز پشت موڑے کھڑا تھا۔ کیوں وہ سنڈریلا کے پرنس کی طرح پلٹ کر وریشے کی سینڈل نہیں اٹھا لیتا۔

آخر وہ اسے کس طرح ڈھونڈ پائے گا بنا سینڈل کے، وہ تاسف سے سوچ کر رہ جاتی۔ اور بگھی تیز رفتاری کے ساتھ حویلی جانے والی سڑک پر دوڑنے لگتی۔ تب اس کی آنکھ بھی کھل جایا کرتی تھی۔ مگر اس وقت تو وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہاج اس کی سینڈل اس لیے نہیں اٹھاتا تھا کیونکہ وریشے ٹالپر تو اس کی سنڈریلا تھی ہی نہیں اس کی سنڈریلا تو کوئی اور ہی تھی۔

☆☆☆

جس طرح رنج میں خوشی کا ہونا
اس طرح ہوتا ہے محبت میں کسی کا ہونا
تیرا سورج کے گھرانے سے تعلق تو نہیں ہے
پھر کہاں سے سیکھا ہے ہر کسی کا ہونا

وقت کا کام تو گزرنا ہے اور یہ تیزی سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ میٹرک میں ٹاپ کرنے کے بعد زریاب رضا کو مزید تعلیم کے حصول کی خاطر لندن روانہ کر دیا گیا۔ اور یہ ہی وہ دن تھے جن دنوں میں میر وہاج ٹالپر اور زی ٹالپر کی دوستی گہری سے گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

وہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ نظر آنے لگے۔

کبھی ٹالپر ہاؤس میں بنے ٹینس کورٹ میں ٹینس بال کھیلتے ہوئے۔

کبھی کرنٹ افیئرز پر بحث کرتے ہوئے تو کبھی شاعری پر تبصرے کرتے ہوئے۔

''وہ شاہ جو رسالو'' کے سر سوہنی کو لے کر بیٹھ جاتے اور گھنٹوں تبصرہ کرتے رہتے۔

نہ کاتی نہ کاٹھن نہ کی ژ د قلم جو
لنگ اتی لکیو، جتی نہ اسکی پاٹھن
کٹھن کی زبان دا ٹھن قضا قلم واھیو
(نہ چاقو، نا ہی لکڑی، نہ ہی قصور قلم کا
حرف وہاں لکھا گیا جہاں ہاتھ کی رسائی ممکن نہیں
کس سے شکایت کریں، کاتب تقدیر نے قلم چلا دیا)

زی سر سوہنی میں سے ایک شعر کا انتخاب کرتی۔

وہاج ٹالپر اس پر سیر حاصل تبصرہ کرتا۔ کبھی وہ اسد اللہ خان غالب کی کسی غزل کو چھیڑ کر بیٹھ جاتے۔ کبھی دور حاضر کے شاعر علی زریون تو کبھی عاطف سعید کے اشعار کو زیر بحث لاتے ان کے پاس ان گنت موضوعات تھے بات کرنے کے لیے۔ ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے بحث کرتے وقت دونوں کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ میر وہاج اکثر بحث کے اختتام پر اس سے کہتا۔

''زی! باتوں میں تو کبھی میں تم سے جیت ہی نہیں سکتا۔ یو آر جینئس۔'' وہ ہنس پڑتی۔

اس دوستی نے کب محبت کا روپ دھارا دونوں کو علم نہ ہو سکا۔

وقت گزرتا گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنے کے بعد وہاج اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے کے ارادے سے کراچی شفٹ ہو گیا۔

ان دنوں زویا خیر پور یونیورسٹی سے انگلش میں ماسٹرز کر رہی تھی جب زریاب ٹالپر کی پاکستان واپسی کی خبریں ٹالپر ہاؤس میں گردش کرنے لگیں۔

☆☆☆

عشق ہوا میں
عشق گھٹا میں
عشق کنک کے ہر خوشے میں
کو کو کرتی امبوا سے پیار جتاتی کوئل میں
گھر کے دروازے پر لٹکی دل جیسی اس کنڈی میں
جس میں کسی سسی کا، ہیر کا، جتی کا دل اٹکا ہو
روپ روپ میں، روم روم میں، رنگ رنگ میں

عشق رچا ہے
دریا کے پانی میں دیکھو
ساتھ گھڑے کے سوہنی کے سنگ تیر رہا ہے
مول کے گجرے میں، جوڑے میں
عشق کلائی کے چوڑے میں
عشق گلوں میں، عشق سفر میں
عشق سجن کی مست نظر میں
عشق دے وکھرے رنگ او ماہی
عشق دے وکھرے رنگ

وہ حویلی کی چھت پر لگے بڑے سے سفید جھولے پر بیٹھی تھی۔ ثریا نے بڑے سے تھال میں عرق گلاب اور شہد ڈالا اور گلاب کی پتیاں تھال میں ڈال کر چھت پر آ کر دریشے بی بی کے پاؤں دھونے لگی۔

فہمیدہ پیچھے کھڑی اس کے بالوں کو سنوارنے میں مصروف تھی۔ سفید رنگ کے بے حد اسٹائلش سوٹ میں اس کا حسن چاند کو شرما رہا تھا۔

غزال چشم چھت پر لگے بڑے سے آہنی پنجرے میں رکھے آسٹریلین طوطوں پر ٹکی تھیں۔ پر سوچ کی پرواز اس شہزادے میں اٹکی تھی جو اس کا رانجھا تھا۔ وہ ایسی ہیر تھی جو اپنے رانجھے کی منگ تھی۔ اپنی خوش بختی پر اس کے کلیوں سے لب مسکا اٹھے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی کتاب کو اس نے نگاہوں کے سامنے کر لیا۔

عرق گلاب اور شہد سے اس کے خوب صورت پیروں کو دھوتی ثریا اپنی مالکن کی ایسی پیاری سی مسکراہٹ دیکھتی رہ گئی تھی۔

''آپ کو نظر نہ لگے دریشے بی بی اس نے دل میں کہا تھا۔''

☆☆☆

اس روز کچھ زیادہ ہی گرمی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے جلدی واپس آ گئی تھی۔ گھر آتے ہی شاور لیا اور پھر لنچ کے بعد کمرے میں آ کر میوزک سسٹم پر ایف ایم سننے لگی۔

دوپہر کا وقت تھا، ایف ایم پر اس وقت غزلوں کا پروگرام آ رہا تھا۔

پیار اک پھول ہے، اس پھول کی خوشبو تم ہو
میرا چہرا، میری آنکھیں، میرے گیسو تم ہو

اس کے گھنے سلکی بال بیڈ پر بکھرے تھے۔ اورنج کلر کی پرنٹڈ لان کی شرٹ اور بلیو جینز میں وہ موم کی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔

''زی! تمہاری آنکھیں بے حد خوب صورت ہیں۔ یہ سرمئی ہیروں جیسی آنکھیں اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہیں۔'' میر وہاج ابراہیم کی سرگوشی اس کے کانوں کے قریب گونجی تھی۔

وہ یک لخت گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

یہ پہلا تعریفی جملہ تھا جو وہاج ٹالپر نے اس کے لیے ادا کیا تھا۔ اس نے کبھی زویا فاروق سے نہیں کہا تھا۔

''زی! مجھے تم سے محبت ہے۔''

پھر بھی اس کی آنکھیں اظہار کیے جاتی تھیں۔ ان آنکھوں سے پھوٹتی روشنیاں زویا ٹالپر کو بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ وہاج ابراہیم کے لیے کتنی خاص تھی۔ اتنی خاص کہ اگر وہ کبھی اس کی نظروں کے سامنے نہ رہی تو یہ جگمگاتے ہوئے نینوں کے چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ جائیں گے۔

''وہاج ابراہیم! تم بہت ہی عجیب ہو۔'' چھت پر نگاہیں جمائے وہ اس کے تصور سے مخاطب ہو کر گنگنائی تھی۔

زندگی بن کے جو چھایا ہے، وہ جادو تم ہو
میرا چہرا، میری آنکھیں، میرے گیسو تم ہو

☆☆☆

زریاب رضا نے لندن سے واپس آتے ہی زمینوں کے تمام معاملات خود سنبھال لیے تھے۔ حیدر آباد میں زمین خرید کر اس نے اس پر فیکٹری بنوانا شروع کر دی تھی۔ وہ لندن کی کوئین میری یونیورسٹی سے بزنس میں ایم بی اے کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ سو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس نے

حیدر آباد میں ہی ایک خوب صورت سا گھر بھی خرید لیا تھا۔ اور اس گھر کو زویا ٹالپر کے لیے سجانے میں مصروف تھا۔ اپنے بیڈ روم کی کلر اسکیم سے لے کر لاؤنج کی دیواروں پر سجی تصاویر تک اس نے جیسے ہر ایک شے کو زویا ٹالپر کے لیے سجایا تھا۔ وہ فیکٹری شروع ہونے کے فوراً بعد شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔

جبکہ دوسری جانب مناج نے بھی کراچی میں خریدے گئے اپنے ذاتی گھر کو زویا کے لیے سجایا تھا۔

اور یہ بات جو کب سے وہ دل میں دبائے بیٹھا تھا اس مرتبہ ٹالپر ہاؤس گیا تو مما کے سامنے کہہ ڈالی۔

''مما! آپ بابا سے کہہ دیں...... وہ فاروق چاچا سائیں سے زویا کا ہاتھ میرے لیے مانگ لیں۔'' رات کو سونے سے پہلے سعدیہ اس کے لیے دودھ کا گلاس اٹھائے کمرے میں آئیں تو وہاج نے دھماکہ کر دیا۔ جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''وہاج! کیا بکواس ہے یہ۔ تم ہوش میں تو ہو۔''

''کیا ہوا مما؟'' وہ حیران ہوا۔

''تم مجھ سے پوچھتے ہو...... کیا نہیں جانتے تمہارے فاروق چاچا کی بیٹی زریاب کی منگ ہے؟'' انہوں نے جیسے لفظ ''منگ'' کو چبا کر ادا کیا۔

''واٹ دی ہیل؟ منگ منگ...... میں نہیں مانتا ان فضول رسموں رواجوں کو...... ان جاہلانہ طرز کے فیصلوں کو۔ 'میں صرف اتنا جانتا ہوں۔ میں زی سے محبت کرتا ہوں اور وہ صرف میری ہے۔''

''نہیں ہے وہ تمہاری۔'' مما سرد لہجے میں بپھری تھیں۔ ''آج سے پہلے بھی اس خاندان میں ایسا ہوا ہے نہ کبھی ہو گا۔ غیرت مند مرد کے لیے منگ چھوڑنے کا تصور ہی موت کے برابر ہوتا ہے...... وہاج...... زریاب تمہارا قتل تو کر سکتا ہے مگر اپنی منگ وہ کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

''ہونہہ! وہ کیا قتل کرے گا میرا۔ میں ہی دادا سائیں کے پہلو میں قبر بناؤں گا اس کی۔'' میر وہاج ابراہیم کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔

سعدیہ ابراہیم کا وجود سرد پڑ چکا تھا۔ کتنی آسانی سے ان کا بیٹا اپنے سگے تایا زاد کی قبر کھودنے کی بات کر رہا تھا۔

انہوں نے وہاج کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور کانپتے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''وہاج میری جان...... آخر تم کیوں بھول رہے ہو کہ میر زریاب رضا کی بہن تمہاری منگ بھی تو ہے۔ کیوں طوفان لانا چاہتے ہو اس خاندان میں۔''

''مما! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می...... طوفان میں نہیں لانا چاہتا بلکہ آپ لوگ لانا چاہ رہے ہو طوفان کو میری زندگی میں۔ بتا رہا ہوں میں...... کسی بھی قیمت پر زریاب رضا کی اس جاہل بہن سے شادی نہیں کرنے والا میں۔ وہ گاؤں کی ان پڑھ گنوار لڑکی۔ میری زندگی کو تو بس زویا فاروق ہی سنوار سکتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ مما اس کی اور میری پسند بے حد ملتی ہے۔ زی کو بھی میری طرح شاعری سے لگاؤ ہے، اس کا ٹیسٹ بہت اعلا ہے۔ مما، وہ رنگوں خوشبوؤں سے پیار کرنے والی لڑکی ہے میری زندگی کو جنت بنا دے گی وہ۔'' وہاج ٹالپر کا لہجہ زویا فاروق کا نام لیتے ہی مہک گیا۔

سعدیہ ابراہیم اس کی آنکھوں میں چھائی دیوانگی دیکھ کر لب بھینچتے ہوئے سسک اٹھی تھیں۔

''وہاج...... وہاج میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔'' وہ سسکی تھیں۔

وہ سر جھٹکتے ہوئے تلخی سے ہنس دیا۔

''مما آپ نہ سمجھا سکیں گی اب مجھے۔ میں سوچنے سمجھنے کی حدوں سے بہت دور نکل آیا ہوں...... وہ لڑکی سراپا عشق بن کر میری نس نس میں لہو کی جگہ دوڑتی ہے۔

بس اتنا جان لیجیے اگر میں اس کو حاصل نہ کر پایا تو یہ لب کبھی مسکرا نہ سکیں گے۔'' جنوں کی سرحد پر کھڑا وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنا ہاتھ دل پر رکھ لیا تھا۔

جبکہ وہاج ابراہیم دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں سر کے بال جکڑتا اپنی آنکھوں میں اندتی نمی کو

چھپانے کی خاطر سر جھکا گیا تھا۔

دل کو کہاں قبول رواجوں کے فیصلے
دل تو محبتوں کے قبیلے کا فرد ہے

☆☆☆

سعدیہ ابراہیم کو جس بات کا ڈر تھا آخر وہی ہوا تھا۔ ان کے بیٹے نے نا صرف ابراہیم ٹالپر کے سامنے وریشے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تھا بلکہ زدیا کا ہاتھ فاروق چاچا سائیں سے مانگنے کے لیے باپ سے کہا تھا۔ میر ابراہیم تو وہاج کی اس درجہ جرات پر ایسے سیخ پا ہوئے تھے کہ اگلے ہی پل اس کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا تھا۔

''ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ نامراد۔'' انہیں گھر چھوڑنے کا حکم دیتے ہوئے وہ چنگھاڑے۔ وہ لب بھینچے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے بابا سائیں! جیسا آپ چاہیں۔ میں ٹالپر ہاؤس سے چلا جاتا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''واہ! کتنے فرماں بردار ہو تم میرے؟'' وہ زہر خند ہوئے۔

''بابا! اس طرح طنز کر کے کیوں مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا رہے ہیں؟'' اس کے ضبط کا پیمانہ چھلکا۔

''میں کسی بھی صورت میں زریاب رضا کی بہن کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، اسے آپ میری ضد سمجھیں یا مجبوری۔''

''وہاج۔'' اس کی گستاخی پر وہ اتنی قوت کے ساتھ چلائے تھے کہ ٹالپر ہاؤس کے آہنی در و دیوار ہل کر رہ گئے تھے۔

''سعدیہ! بتاؤ اسے، میں باپ ہوں اس کا ...... یہ میری اولاد ہے، میں اس کی نہیں۔''

''میں نے تو کبھی اپنے بابا کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرنے کی جرات تک نہیں کی تھی...... اور یہ کیسی گستاخی سے میرے منہ لگ رہا ہے۔'' وہ بپھرے۔

''بابا! میں خادم ہوں آپ کا ...... مگر اس معاملے میں ......''

''بکواس بند کرو اپنی۔'' اس کا نادم لہجہ بابا کی دبنگ آواز میں دب کر رہ گیا تھا۔

''تمہارا یہ اکلوتا سپوت سعدیہ بیگم...... وریشے ٹالپر کو ان پڑھ، گنوار کہتا ہے...... پوچھو اس سے، یہ خود کیا ہے......؟'' وہ شریک حیات کی سمت دیکھتے ہوئے استفسار کر رہے تھے۔

''ہاں بتاؤ وہاج اہم مجھے......؟'' ابراہیم ٹالپر نے سوالیہ انداز میں بھوئیں اچکائیں۔

''شہر کی بڑی بڑی درس گاہوں میں یہ تمیز سکھائی گئی ہے تمہیں ...... یہ میعار سکھائے گئے ہیں کہ ...... اس طرح باپ کے سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں اچھالتے ہیں اس کی پگڑی جس نے بچپن میں بھی آپ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہوتا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ مسکرائے تھے۔

''بابا۔'' وہاج کا جھک گیا تھا۔ ''مجھے معاف کر دیں بابا سائیں۔'' چھلکتی آنکھوں کے ساتھ وہ باپ کے پاؤں پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

ابراہیم ٹالپر کے وجود نے جنبش تک نہ کی۔

''بابا...... پلیز۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں کے ساتھ لگاتے ہوئے منمنایا تھا۔

''نکل جاؤ وہاج! یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔'' بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ سرد مہری سے گویا ہوئے تھے۔

''بابا! آپ ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔''

''میں ایسا کر سکتا ہوں وہاج...... اس سے بھی برا کر سکتا ہوں میں، اگر تم اپنی ضد سے نہ ہٹے تو۔''

''میں اپنی محبت نہیں چھوڑ سکتا بابا۔'' ہارے ہوئے لہجے میں تھکن تھی۔

''ٹھیک ہے پھر نکلو ٹالپر ہاؤس سے ابھی۔'' میر ابراہیم نے طیش میں آ کر اسے کو شرٹ کے کالر سے پکڑ کر گھسیٹا تھا۔ اور اس طرح کھینچتے ہوئے لاؤنج کے بیرونی دروازے کے قریب لائے تھے۔

مگر دروازے کے قریب پہنچ کر جیسے ان کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ سامنے ہی فاروق ٹالپر اپنی پوری فیملی سمیت کھڑے نظر آئے۔

کمانڈو روانے زندگی میں پہلی بار ابراہیم چاچا سائیں کو اس درجہ شدید غصے کی حالت میں دیکھا تھا۔

وہ پورے وجود کے ساتھ کانپ رہی تھی۔

جبکہ فاروق ٹالپر اور ان کی بیوی صوفیہ ٹالپر کسی قدر معاملے کی نوعیت سے آگاہ معلوم ہوتے تھے۔

شاید وہ وہاج اور ابراہیم صاحب کی گفتگو سن چکے تھے۔ بس صرف ایک وجود وہاں ایسا تھا جو کسی لاش کی طرح کاریڈور کی دیوار سے ٹیک لگائے ساکت کھڑا تھا۔

اور وہ تھی زویا ٹالپر۔ ٹالپر ہاؤس کے ہر فرد کی لاڈلی میر وہاج ابراہیم کی زی...... وہ موم کی گڑیا جو اپنے خوابوں کو ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر خود بھی ٹوٹ رہی تھی۔

اس کے نازک عنابی لب ضبط کی کوشش میں ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ سرمئی آنکھوں کی قندیلیں جل بجھ رہی تھیں۔

وہاج سے جدائی کا خوف اس کے وجود میں درد بن کر چھا رہا تھا۔ موت کی غشی حواسوں پر کس طرح چھاتی ہے، زی فاروق نے آج جانا تھا مگر اس وقت جیسے اس کی شہ رگ پر کسی نے تیز دھار چھری گھما ڈالی تھی۔ جب اس نے میر وہاج ٹالپر کو اپنے باپ کے قدموں میں گرتے دیکھا تھا۔ تو کیا وہ آج زویا فاروق کے لیے میر فاروق سے بھیک مانگنے والا تھا۔

"چاچا سائیں! خدا کے واسطے مجھ سے میری خوشیاں مت چھینیں۔ پلیز رحم کھائیں مجھ پر۔ میں ...... میں بھیک مانگتا ہوں آپ سے اپنی خوشیوں کی۔ میری جھولی میں...... میری زندگی ڈال دیجیے۔" اس نے سسکتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میر فاروق ٹالپر کے آگے جوڑ دیے تھے۔

"وہاج ہاؤ ڈیر یو۔" بابا اچانک مٹھیاں بھینچتے ہوئے آگے بڑھے اور اس مرتبہ پہلے سے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

"بے غیرت، ناخلف اولاد...... اور کتنا سر جھکاؤ گے میرا؟" ابراہیم ٹالپر دھاڑے۔

"اس سے پہلے کہ میں ملازموں کو آواز دوں اور وہ دھکے مار کر تمہیں باہر پھینک آئیں۔ نکل جاؤ تم فوراً اپنی یہ صورت لے کر۔" انہوں نے جارحانہ انداز میں بیرونی دروازے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ جبکہ فاروق چاچا سائیں نفرت سے لب بھینچے ہنوز رخ موڑے کھڑے تھے۔ تب دفعتاً وہاج کو احساس ہوا، وہ اپنا سر کن پتھروں کے ساتھ پھوڑ رہا تھا۔

وہ کیوں لہولہان کر رہا تھا خود کو۔ اس کی آنکھوں کے کنارے یکایک خشک ہوئے تھے۔

پلٹ کر کن اکھیوں سے ایک الوداعی نگاہ زی پر ڈالی۔ وہ بھی اسی جانب دیکھ رہی تھی، نگاہوں کے تصادم پر وہاج کو محسوس ہوا تھا۔ زی کی آنکھوں میں بکھرے خوابوں کی ساری کرچیاں اس کے لہولہان وجود میں کھب گئی ہوں۔ اس کو لگا اگر وہ وہاں مزید ایک پل بھی رکا تو پتھر کا ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی اس نے اپنی نگاہیں جھکالی تھیں اور جانے کا قصد کرتے ہوئے فوراً سے پیشتر اپنے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

تب وہاج ٹالپر کو آگے کی سمت قدم اٹھاتے دیکھ کر اس موم گڑیا کے لبوں پر اذیت بھری اک سسکی آٹھہری تھی۔ کیسی کربناک تھی وہ سسکی بالکل موت کی آخری ہچکی کی طرح......

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ ٹالپر ہاؤس میں آنے والے اس طوفان کا علم سوھن پور کی حویلی کے مکینوں کو نہ تھا۔ ٹالپر ہاؤس کے اندر کام کرنے والے گاؤں سے آنے والے ملازموں کے ذریعے جلد ہی یہ بات میر رضا ٹالپر تک جا پہنچی تھی۔ تمام معاملات جاننے کے بعد وہ جیسے دھک سے رہ گئے۔

برسوں پرانے فیصلوں پر آج نظر ثانی کی ضرورت پڑ گئی تھی کیونکہ وہاج انہیں بے حد عزیز تھا۔ بالکل زریاب ہی کی طرح۔ وہ ان کے بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔

بہت غور و خوض کرنے کے بعد میر رضا ٹالپر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کو تیار ہو ہی گئے۔ ان کے نزدیک بیٹی کا معاملہ اتنا بڑا نہ تھا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہاج کی منگ ہونے کی وجہ سے کوئی دوسرا ان کی بیٹی کو بیاہنے ہرگز ان کی حویلی نہیں آئے گا۔ وریشے ٹالپر تمام عمر ان کی حویلی میں پڑی بیٹھی رہ جائے گی۔ لیکن وہ تمام عمر اپنی بیٹی کو بٹھا کر کھلا سکتے تھے۔ بھتیجے کی محبت میں رضا ٹالپر کے لیے یہ قربانی نہایت ہی چھوٹی تھی۔

پر اصل مسئلہ تو زریاب ٹالپر کا تھا۔ وہاج نے وریشے کو ٹھکرا کر زریاب کی منگ کا نام لیا تھا۔

اور وہ جانتے تھے، زریاب ان کے سمجھانے کے باوجود کسی صورت میں اپنی منگ سے دست بردار نہیں ہونے والا۔ وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا پھر بھی پہلی و آخری کوشش کے طور پر انہوں نے کال کر کے زریاب ٹالپر کو حیدرآباد سے سوھن پور آنے کا حکم دیا تھا۔

☆☆☆

منتوں مرادوں سے پایا ہے دل کو
اس کے نخرے اٹھاتے ہیں کسی شاہ کی طرح

وہ بے حد ریش ڈرائیو کر کے گاؤں پہنچا تھا۔ زریاب کے دل کو پنکھے لگے تھے۔ ایسی کون سی خبر تھی جسے دینے کے لیے بابا جانی نے یوں ایمرجنسی میں اس کو گھر بلایا تھا۔

تمام سفر کے دوران وہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتا رہا تھا۔ پھر بھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا۔

"بسم اللہ! چھوٹے وڈیرے آ گئے۔" جیسے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا، مورن کاکا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ زریاب نے مسکراتے ہوئے اس سے اس کے بچوں کی خیریت دریافت کی تھی۔

پھر اوطاق میں مزید رکنے کے بجائے سیدھا حویلی کے اندرونی حصے کی جانب آ گیا۔

"اداسائیں آ گئے۔"

اس پر نگاہ پڑتے ہی وریشے نے نعرہ لگایا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔

"آئی لو یو اداسائیں۔ میں صبح سے آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔" وہ چہکی تھی۔ زریاب ہنس دیا۔

"واہ میری ادی! صبح سے تو میں یہاں آنے کے لیے نکلا بھی نہیں تھا..... اور تم نے انتظار کرنا شروع کر دیا۔ بھئی کیا کہنے وریشے ٹالپر کے۔" وہ پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے بولا تھا۔

وریشے جھرنوں جیسی ہنسی ہنس دی۔

اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے زریاب نے بے ساختہ وریشے کی ہنسی کی نظر اتاری تھی۔

پھر اس کا ہاتھ تھاما اور ہال کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"بابا جانی کہاں ہیں؟"

بہن کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے استفسار کیا تھا۔

"وہ تو اپنے کمرے میں ہیں......مگر پہلے آپ فریش ہو جائیں...... کھانا کھا لیں...... پھر بابا جانی سے ملیے گا۔" وریشے نے آنکھیں مٹکائیں۔ "کیونکہ یہ آپ کے لیے ان کی جانب سے آرڈر ہے۔"

رضا ٹالپر کے آرڈر کو سننے کے بعد وہ فریش ہونے کے ارادے سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

بعد میں کھانے سے فارغ ہو کر جب بابا جانی کی خواب گاہ میں پہنچا تو......عباد ادا کو بھی وہیں بیٹھا پایا۔

یقیناً کسی بے حد گمبھیر مسئلے پر بات چیت ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر دونوں اچانک خاموش ہوئے تھے۔

بابا جانی سے ملنے کے بعد عباد ادا سے ملا پھر وہ سامنے والے صوفہ پر براجمان ہو گیا تھا۔

"خیریت ہے بابا جانی......؟" عباد ادا کے بعد ایک گہری نگاہ سر اٹھا کر بابا جانی کے چہرے ایک گہری نگاہ ڈالی۔

"آپ نے یوں فوراً سوھن پور آنے کا آرڈر

دیا تو میں پریشان ہوگیا...... سب ٹھیک تو ہے؟" متفکر لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔

میر رضا تالپر کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں آن بسیں۔

"ہوں۔ بابا کی جان۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "سب خیریت ہے..... بس ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوگیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟" فراخ پیشانی پر سبز رگ ابھر آئی۔

"کیا پھر صداتیوں نے ہماری زمینوں پر جھگڑا شروع کردیا ہے؟"

"نہیں بابا! صداتیوں کا مسئلہ نہیں ہے۔" رضا تالپر کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"مسئلہ خاندانی نوعیت کا ہے۔" انہوں نے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"دراصل! وہاج نے دریشے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کردیا ہے۔" انہوں نے جو بھی بات مکمل کی تھی۔ میر زریاب بت ہی بن گیا تھا۔ شاک ہی ایسا پہنچا تھا اس کو..... مگر یہ کیفیت لمحاتی ثابت ہوئی تھی۔ دوسرے ہی پل اس کی دونوں مٹھیاں بھینچ گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"زریاب! رکو..... کہاں جا رہے ہو؟" اس کو غصے کی حالت میں دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر عباد رضا نے اٹھ کر اس کو شانوں سے تھام کر روک لیا تھا۔

"اداسائیں! چھوڑیں مجھے..... جانے دیں۔" وہ دانت پیس کر غرایا۔ "میں وہاج تالپر کو جا کر اس کی اوقات بتا آؤں۔ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھوں گا میں اس سے..... ایک تالپر ہو کر وہ اپنی غیرت کہاں بیچ کر آیا ہے۔ اپنی منگ تو کوئی بھی غیرت مند مرد نہیں چھوڑتا۔" غصے سے کانپتے لہجے میں وہ بولا تھا۔

جبکہ اس کو اس درجہ اشتعال میں دیکھ کر بابا جانی تھم سے گئے تھے۔ وہ جو سوچ بیٹھے تھے کہ زریاب کو اپنی منگ چھوڑنے کا کہہ دیں گے۔ بہن کے، مسئلے پر اسے اس طرح بھڑکتا دیکھ کر وہ جیسے اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔

"زریاب!" رضا تالپر نے اسے پکارا تو وہ جو غصے سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ بابا جانی کی رعب دار آواز پر پلٹ کر بے بسی سے ان کی جانب دیکھا۔

"ادھر آؤ میری جان..... اپنے بابا کے پاس آؤ۔" انہوں نے اپنے پاس بلایا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر اپنے ساتھ بٹھاتے گویا ہوئے۔

"یوں آدھی ادھوری بات سن کر ہی بھڑک اٹھے میرے شیر..... اپنے بابا کی پوری بات تو سنتے۔" وہ رکے۔

"آپ نے پوچھا تک نہیں..... وہاج نے دریشے کو ٹھکرا کر کس لڑکی کا نام لیا ہے۔" زریاب رضا کی نگاہوں میں استفہام کے رنگ ابھرے۔

رضا تالپر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"زریاب..... وہاج نے فاروق سے زویا تالپر کا ہاتھ مانگا تھا۔ جس پر ابراہیم نے طیش میں آ کر نہ صرف وہاج پر ہاتھ اٹھایا بلکہ اسے گھر سے نکل جانے کا حکم بھی دے دیا۔"

"بابا جانی یہ کیا کہہ رہے تھے؟" اسے لگا تھا جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

تو کیا وہاج تالپر اتنا گر سکتا تھا؟ ایک طرف تو وہ اس کی بہن کو ٹھکرا رہا تھا اور دوسری طرف اس کی بچپن کی منگ کا ہاتھ اپنے لیے مانگ رہا تھا۔ وہ دریشہ تالپر کا وہ گھر بھی اجاڑ رہا تھا جو ابھی بسا بھی نہیں تھا اور زریاب رضا کا دل بھی جس پر زویا فاروق کا سایہ تھا۔

"آئی ول کل یو وہاج، ابراہیم..... آئی ریئلی کل یو۔" نفرت کی آگ میر زریاب رضا کی رگ رگ میں جل اٹھی تھی۔

بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے بابا جانی کی جانب دیکھا تھا۔ جو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تم سن رہے ہو زریاب؟ ابراہیم کے ہاتھ

اٹھانے پر وہاج اس سے روٹھ کر کراچی چلا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں، یہ معاملہ سلجھ جائے..... وہاج میرے بھائی کا اکلوتا بیٹا ہے..... اور اسی لیے میں تم سے کہوں گا..... تم پیچھے ہٹ جاؤ زریاب!

تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی ..... پر یوں ضد اچھی نہیں ہوتی بیٹا..... ضد کا نتیجہ برا ہوتا ہے..... میں نے ان آنکھوں سے زمانہ دیکھ رکھا ہے زریاب..... اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ پیچھے تم.....'' ناصحانہ انداز لیے وہ اس کو سمجھا رہے تھے اور وہ فکر فکر ان کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

تو کیا بیٹے کے مقابلے میں اکلوتے بھتیجے کی محبت جیت چکی تھی؟ جب ہی تو میر رضا تالپر نے اپنا ووٹ وہاج ابراہیم کے حق میں دے دیا تھا۔

ایک استہزائیہ مسکان نے اس کے بھرے بھرے لبوں کو چھو لیا۔

''ٹھیک ہے بابا جانی۔'' فیصلہ لمحوں میں ہو گیا تھا۔

''میں پیچھے ہٹنے کو تیار ہوں۔'' چند ثانیے اسے سوچنے میں لگے تھے اور وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے گویا ہوا۔

رضا تالپر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بھلا اس کے اس قدر جلد مان جانے کی توقع کہاں رکھتے تھے۔

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے زریاب! ہر شرط۔'' وہ فوراً مسکرائے۔ زریاب رضا بھی ان کی عجلت پر مسکرا دیا۔

''ٹھیک ہے بابا جانی..... پھر۔'' عجیب سے لہجے میں کہتا وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھا عباد ادا سائیں کا لوڈڈ ریوالور اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ رضا تالپر یا عباد رضا اس کا ارادہ بھانپ پاتے۔ زریاب نے یک لخت ہاتھ میں موجود پستول اپنی کنپٹی پر تان لیا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر بابا جانی۔'' ریوالور کی چمکتی نوک خود پر تانے وہ مسکرایا تھا۔

''میں پیچھے ہٹ رہا ہوں..... اللہ نگہبان۔'' اس نے ہتھیار ڈال لیے۔

''زریاب۔'' بابا جانی اتنی قوت سے چلائے کہ کمرے کی دیواریں لرز گئیں۔

''زریاب..... یہ کیا حرکت ہے..... نیچے پھینکو ریوالور۔'' عباد ادا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے وہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ کر دور پھینک دینا چاہتے تھے۔

''اونہوں ادا سائیں۔'' زریاب نے انہیں وہیں رک جانے کا اشارہ کر دیا۔

''ٹھہر جائیں آپ..... اگر ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو..... ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا خود کو شوٹ کر ڈالوں گا۔'' اس نے بھیگتی آنکھوں کی نمی کو پیچھے کی سمت دھکیلتے ہوئے دھمکی دی۔

عباد تالپر میر رضا کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''زریاب! یہ کیا حرکت ہے بیٹا! کیوں امتحان لے رہے ہو میری جان اپنے بابا جانی کا.....؟ میرے جگر پھینک دو یہ پستول۔'' وہ ہانپ گئے۔

''دیکھو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' رضا تالپر نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے تھے۔

زریاب کی آنکھوں میں اضطراب جھلکا۔

''بابا جانی۔'' اس کا لہجہ لرزا۔ ''آپ ہاتھ جوڑ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' میں تو آپ کی خوشی کے لیے پیچھے ہٹ رہا ہوں..... میرے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' وہ کراہا۔ ''اس مسئلے کا حل یہ ہی ہے..... میں نہیں رہوں گا تو تمام معاملہ خود بخود سلجھ جائے گا..... پھر آپ جسے چاہیں، فاروق چاچا سائیں کی بیٹی کا ہاتھ تھما دیجیے گا۔ لیکن میں اپنے جیتے جی۔'' زریاب کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ لبوں پر درد بھری سسکی ابھری۔

''بابا جانی..... میں اپنے جیتے جی یہ سب ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میری غیرت کا معاملہ ہے اور میری زندگی کا بھی۔ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ میں نہیں چھوڑ

سکتا اپنی منگ۔" بھرائے ہوئے لہجے میں وہ یہ سب بنا رکے کہتا چلا گیا تھا۔

زریاب اس وقت مکمل طور پر بابا جانی کی سمت متوجہ تھا اور اسی موقعے کا فائدہ عباد رضا نے اٹھایا۔

سرعت سے آگے بڑھ کر انہوں نے زریاب کے ہاتھوں سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی۔

اس چھینا جھپٹی کے دوران ٹریگر پر زریاب کی گرفت کا دباؤ بڑھا تھا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کی خاموش فضاؤں میں فائر کی زوردار آواز گونج گئی تھی۔

"یا اللہ سائیں خیر۔" بابا جانی نے دفعتاً اپنا سینہ مسلا۔

عباد ٹالپر نے دہشت سے پھٹی نگاہیں چھوٹے بھائی کی طرف اٹھائیں۔ ریوالور سے نکلی گولی جو اگر زریاب کے سینے میں اتر جاتی تو شاید سب کچھ لمحوں میں خاک ہو چکا ہوتا۔ جانے کیسے معجزاتی طور پر محض اس کے بازو کو چھو کر گزر گئی تھی۔

مضبوط بازو سے پھوٹتی تازہ سرخ خون کی پھوار سفید قمیص کی آستین کو رنگتی چلی گئی۔

"زریاب میرے بھائی!" عباد ادا نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

بابا جانی نے اٹھ کر اس کا خوبرو چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو دیوانہ وار چومنے لگے۔

تب بے ساختہ امڈتی نمی نے زریاب ٹالپر کی آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔

اور ایسے کتنے ہی اشک تھے جو دروازے کے باہر کھڑی وریشہ رضا ٹالپر کی ریشمی دراز پلکوں پر ستاروں کی مانند دمک اٹھے تھے۔

وہ اپنے اور اپنے ماں جائے کے نصیب پر جتنا روتی کم تھا۔

گردش دوراں، زمانے کی نظر، آنکھوں کی نیند
کتنے دشمن ایک رسم دوستی سے ہو گئے
زندگی آگاہ تھی صیاد کی تدبیر سے مگر؟
ہم اسیر دامن گل اپنی خوشی سے ہو گئے

چائے کی ٹرالی تھامے اپنے پیچھے کھڑی ثریا سے نگاہ چراتے ہوئے اس نے آنکھوں کی نمی کو پلکوں پر روکنے کی سعی کرتے ہوئے لبوں پر مچلتی سسکی کا گلا گھونٹا تھا اور پھر لپک کر کمرے میں اندر داخل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سیاہ اور سلور کلر کے جدید تراش کے اسٹائلش سوٹ میں ملبوس سیاہ ہی رنگ کی چمکتے شیشوں والی شال کندھوں پر لیے سرمئی آنکھیں "کورٹ آف میرس" کی گلاس وال پر جمائے وہ اس وقت سندیلا جی میوزیم میں رکھا کوئی مجسمہ ہی تو لگ رہی تھی۔

براؤن کلر کے کھدر کے کلف دار سوٹ پر سیاہ لیدر کی چمکتی جیکٹ پہنے آنکھوں براؤن گلاسز لگائے وہ کچھ ہی فاصلے پر کھڑا میوزیم میں سانس لیتے اسی واحد اسٹیچو کو تکنے میں محو تھا۔

زریاب ٹالپر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح آگے بڑھ کر اس سنگ مرمر کے مجسمے کو اٹھا کر اپنے دل میں چھپا لے۔

کرنے کو بہت کچھ تھا مگر
طے یہی پایا
ہم اہل محبت ہیں، محبت ہی کریں گے

دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ زیر لب گنگناتا اس کے نزدیک آیا تھا۔

تب دفعتاً اس کے قدم ٹھہر گئے تھے کہ اس نے سیاہ جینز اور شرٹ میں ملبوس وہاج ابراہیم کو کورٹ آف میرس کے ہال میں اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

دو باوردی گارڈز دروازے کے دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔ وہاج نے تلے قدم اٹھاتا ان دونوں کے قریب آیا تھا۔

ان تینوں میں دوستی تھی اور یہ بچپن سے تھی۔ وہ تینوں ہی خیر پور میرس سے آج خاص طور پر سندھو پر پکنک منانے کے ارادے سے بائی روڈ حیدر آباد پہنچے تھے۔

راستے میں زی نے اچانک سندھ یالاجی میوزیم کی سیر کرنے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

سندھ یونیورسٹی جام شورو کے ساتھ بنایا گیا یہ میوزیم سندھی ثقافت کے تمام رنگوں کو اجاگر کرتا تھا۔

گراؤنڈ فلور پر بنے استقبالیہ سے انہوں نے ٹکٹ خریدے تھے پھر کارنر میں بنی سیڑھیاں چڑھ کر لابی میں آ گئے۔

سیڑھیوں کے ساتھ والی دیوار پر سندھی لوک سنگر کی تصاویر سجا کر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔

فوزیہ سومرو، سرمد سندھی اور دیگر گلوکاروں کی تصاویر بھی تھیں سامنے والی دیوار پر اوپری حصے میں شوکیس بنایا گیا تھا۔ جس میں مختلف لوک فنکاروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجائے گئے تھے۔ "مغلن فقیر" کے دونوں ہاتھوں میں میوزک اسٹریو تھما کر اجرک کی پگڑی پہنا کر تمام مجسموں کے درمیان میں بٹھایا گیا تھا۔ ذرا دیر رک کر انہوں نے کیس کے اندر رکھے مجسموں کا جائزہ لیا تھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر آ گئے۔

"واؤ! یہ لگتا روایتی ہے۔" زی کے لب مسکرا اٹھے۔

فرسٹ فلور پر پہنچتے ہی سب سے پہلی نظر سامنے سجے سندھی ثقافت کے تمام رنگوں کو نمایاں کرتے لکڑی سے بنائے گئے ہنڈولے پر گئی تھی، اس نے فوراً اپنے ہینڈ بیگ میں سے سیل فون نکالا تھا اور پھر ہنڈولے کی فوٹو بنا کر وہیں کھڑے کھڑے اپنی فرینڈز کو واٹس اپ کر ڈالی تھیں۔

دہاج اور زریاب اس کی ایکسائٹمنٹ پر فقط مسکراتے رہے تھے۔ میوزیم میں بنے کمروں کے آگے کانچ کی دیواریں اٹھا دی گئی تھیں کمرے کے سائز جتنے ان بڑے بڑے شوکیسوں کے اندر سندھ میں رہنے والے لوگوں کی مختلف ذات پات اور کلچر کو پیش کیا گیا تھا۔ سومرو، کاسٹ سے لے کر دیوان اور ڈیپلائی میمن تک کے مجسمے بنا کر ان کے قدیم دور میں رہن سہن کے انداز کو فوکس کر کے دکھایا گیا تھا۔

کچھ آگے جا کر سندھیوں کی شادیوں میں ادا کی جانے والی چاولوں والی رسم کو پیش کیا گیا تھا۔

جس میں سندھی دولہا چہرے کے آگے موڑ (سہرا) باندھے مٹھیوں میں کچے چاول بھر بھر کے دلہن کی نازک ہتھیلیوں میں ڈالے جا رہا تھا۔ اردگرد دولہا دلہن کے رشتے داروں کے مجسمے بھی کھڑے تھے۔

لیکن زی کی نگاہوں کا مرکز دولہا دلہن کی پشت پر کچھ ہی فاصلے پر بنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا وہ چھوٹا سا بچہ تھا جو آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں سندھی ٹوپی سر پر ٹکائے آنکھوں میں شوق کا ایک جہان لیے کچھ نیچے کی طرف جھانکتے ہوئے دولہا دلہن کو دیکھنے کی سعی میں مگن تھا۔

اس بچے کی آنکھ کی پتلیوں میں ہلکورے کھاتی چمک کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ جیسے ابھی کھڑکی سے کود کر نیچے آ جائے گا۔ مجسموں کو بنایا ہی اتنی مہارت سے گیا تھا کہ ان پر جیتے جاگتے انسانوں کا گمان ہوتا تھا۔

اس بچے کو اپنے سیل میں قید کرنے کے بعد وہ تینوں سحر زدہ سے وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

بے نظیر بھٹو لائبریری کی سیر کرنے کے بعد وہ ساتھ چلتے ہوئے سب سے آخر میں میروں کا دربار دیکھنے آئے تھے۔ جہاں بڑے ہال میں ایک طرف تو بھالے تلواریں اور میروں کے دور کے قدیم ہتھیار شوکیسوں کی اندر سجے نظر آتے تھے اور دوسری طرف دربار سجا تھا۔

مختلف درباریوں کے مجسمے ہاتھ جوڑے ایک دوسرے سے فاصلوں پر کھڑے تھے۔

اور سامنے تخت پر میر صاحب براجمان تھے، گھنی مونچھوں تلے بھرے بھرے گلابی لب مستعد کھڑے درباریوں کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے ہی پروقار انداز میں مسکرا رہے تھے۔

اور اس مسکراہٹ کا جائزہ لیتے ہوئے زی کی زبان میں بے موقع کھجلی ہوئی تھی۔

"یہ سچ ہے کہ واقعی میروں کا دربار سجایا جاتا ہو

گا..... اور یہ لوگ تخت پر براجمان بھی ہوتے ہوں گے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میر علی نواز خان ٹالپر کے دل کے تخت پر حکمرانی صرف اور صرف "بالی" کی ہی تھی۔" اپنی دھن میں وہ کہہ تو گئی تھی مگر پھر بری طرح پچھتائی کہ کچھ فاصلے پر کھڑے زریاب کا قہقہہ بڑا ہی جان دار تھا۔

"ہا.....ہا.....ڈونٹ جیلس زی فاروق۔" آنکھوں پر سے گلاسز ہٹاتے ہوئے اس نے نرگسی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا ہوا، اگر میر صاحب کے دل پر "بالی" کی حکمرانی تھی۔ اس میر کے دل کی سلطنت پر تو حکمرانی آپ ہی کی ہے۔" یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے یوں کھل کر مخاطب ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ دو دن بعد اس کی لندن روانگی تھی وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے لندن جارہا تھا۔

اور اس سے قبل زویا پر اپنے دل کا حال وا کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہاج نے اگلے ہی پل رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔

"ہا..... ہاؤ ویری فنی..... یہ میر صاحب کا مجسمہ تو بڑی کرامت والا ہوا ناں پھر..... محض ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی تم ڈائیلاگز جھاڑنے لگے۔ یار زبان کو حرکت ذرا سنبھل کر دینا کہ یہ نہ ہو واپسی پر زی تمہیں اٹھا کر سندھو کی لہروں میں ڈبو دے کہ بہر حال جو بھی ہے ٹالپر ہاؤس میں دیوانوں کی گنجائش نہیں۔" آخری بات کہتے وہاج نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔ تب زی کے ساتھ ساتھ اس کی بات سن کر زریاب بھی ہنس پڑا تھا۔

وہ دوست تھے اور آپس میں بے تکلف بھی تھے۔ مگر آج اسی بے تکلف دوست کے ہاتھوں تکلیف اٹھا کر میر زریاب ٹالپر تڑپ ہی تو اٹھا تھا۔

"تو وہاج ابراہیم! یہ چور تمہارے دل میں اسی روز سے چھپا بیٹھا تھا جب ہی تو مجھے زی سے مخاطب ہوتے دیکھ کر تم اچانک درمیان میں کود پڑے تھے۔ تم تو آستین کے سانپ نکلے وہاج۔" اس دن کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے زریاب نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لی تھیں۔ کہ بہر حال برسوں پرانی دوستی تو آج دشمنی میں بدل ہی چکی تھی۔ مگر اس آستین کے سانپ سے سامنا ابھی باقی تھا۔

بازو پر لگی چوٹ سے اٹھتی درد کی ٹیسوں کو دباتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگائی تھی پھر کمرے کی بتیاں بجھائیں اور کمرے میں سگریٹ کا کڑوا دھواں بھرنے لگا۔

کہاں سے لائیں اب آنکھیں کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی انداز مخلصانہ وہ
ہر ایک میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
بے وفا تھا، مگر دوست تھا پرانا وہ

☆☆☆

"سر! آپ سے کوئی مسٹر زریاب ٹالپر ملنے آئے ہیں۔" وہ ایک نہایت اہم میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد ابھی آکر اپنے آفس میں بیٹھا ہی تھا جب اس کی پرسنل سیکریٹری نے انٹرکام پر اس شخص کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

وہاج نے نفرت سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ وہ اس شخص کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ کجا کہ اس کو اپنے آفس میں بٹھاتا۔

"نو۔"

"مس رباب! آپ ان سے کہہ دیجیے، میں ان سے نہیں ملنا چاہتا..... اوکے۔" قطعی لہجے میں سیکریٹری کو آرڈر دینے کے بعد وہ ریسیور کو کریڈل پر پٹخ چکا تھا۔

مگر ابھی وہ آرڈر دے کر سیدھا ہی ہوا تھا۔

جب آفس کا دروازہ کھول کر کوئی بڑے ہی جارحانہ انداز میں اندر گھس آیا تھا۔

آف وائٹ ٹو پیس اور میرون کلر کی شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر سیاہ گاگلز چڑھائے خوشبوؤں میں بسے میر زریاب رضا پر نگاہ پڑتے ہی وہاج ابراہیم کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"سوہن پور کے جاہل وڈیرے۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ بلا اجازت کسی کے پرسنل آفس میں نہیں گھستے؟" اس نے دانت پیسے۔

"کراچی یونیورسٹی کے تہذیب یافتہ اسٹوڈنٹ۔ تمہیں بھی تو شاید کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ مہمانوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آیا کرتے؟" جواب فوراً حاضر ہوا۔

"ہونہہ۔ مہمان مائے فٹ۔" دہاج نے حقارت سے پاؤں زمین پر دے مارا تھا۔ اس کے اس درجہ حقارت بھرے انداز پر لمحہ بھر کے لیے زریاب سلگ کر رہ گیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ سو بڑے ہی پرسکون انداز میں گلاسز خواب ناک آنکھوں سے ہٹائے۔ اس کو دیکھ کر مسکرایا، آگے بڑھ کر کرسی کھینچی اور بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ پر رکھ کر ہلانے لگا۔

جبکہ کچھ فاصلے پر بیٹھا دہاج ابراہیم اس دوران عجیب سی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

جیسے دل ہی دل میں زریاب کی یہاں آمد کا مقصد تلاش رہا ہو۔ یقیناً کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے چونکا تھا۔

ایک استہزائیہ مسکراہٹ نے یکا یک اس کے چہرے کا احاطہ کرلیا تھا۔

"اوہ...... کہیں تم مجھ سے اپنی بہن کی خوشیوں کی بھیک تو مانگنے نہیں آئے یہاں؟" زریاب سے یہ استفسار کرتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ میر دہاج کی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔

"اگر ایسا ہے زریاب ٹالپر! تو میں بتا دوں تم کو، میں تمہاری بہن سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتا۔"

"اور میں تھو کتا ہوں دہاج ٹالپر تمہاری سوچ پر......" زریاب نے فوراً حساب چکتا کیا۔

"اچھا۔" دہاج ہنسا۔ "ویل، اپنی سوچ پر کب تھوکو گے؟"

"جب میں تمہارے جتنا گھٹیا ہو جاؤں گا۔" وہ طنزیہ مسکرایا۔

"واقعی؟" دہاج کے بھنوئیں اچکائیں۔

"تو کیا اب مجھ سے کم ہو۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہرگز نہیں زریاب رضا! بڑی کمینی چیز ہو تم۔ سنا ہے پچھلے دنوں بڑے بابا (رضا ٹالپر) نے تم کو اپنی یہ ضد چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر تم نے وہ ڈراما کر کے دکھا دیا کہ اللہ سائیں کی امان۔ اس روز دادا سائیں کی روح ضرور تڑپ اٹھی ہوگی۔ تمہاری یہ ایکٹنگ دیکھ کر...... کہ کہاں وہ اللہ لوک قسم کے بندے اور کہاں یہ ان کا مکار، اداکار پوتا۔"

جلے دل سے تبصرہ کرتا وہ زریاب کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر گیا تھا۔

"اچھا چھڈ سوٹ......" (اچھا چھوڑ کزن)

"میری تعریف بعد میں کر لینا۔ پہلے یہ تو دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے بالکل اس طرح کہا تھا، جیسے کسی بچے کو بہلانے کے لیے کہتے ہیں۔

"دیکھو بیٹا، میں تمہارے لیے چاکلیٹ لایا ہوں۔"

"یہ لو سوہنے دعوت نامہ۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا سرخ رنگ کا بے حد خوب صورت کارڈ جس پر سنہری رنگ کا ربن بندھا تھا۔ دہاج کی جانب بڑھاتے ہوئے آنکھ دبائی۔

"اس اتوار کو میرا نکاح ہے فاروق چاچا سائیں کی بیٹی زویا ٹالپر کے ساتھ۔" رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم ضرور شرکت کرنا، مجھے خوشی ہوگی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اور گویا دہاج کے دل پر چھری چلا دی تھی۔

"یو لائر......" حسب توقع وہ بھڑک اٹھا تھا۔ سرخ رنگ کا کارڈ تھامنے کے بجائے اس نے اچانک اٹھ کر زریاب رضا کا گریبان تھام لیا تھا۔

"ذلیل، کمینے انسان...... میں تیرا خون کر دوں گا۔ اگر دوبارہ تو نے میرے سامنے زی کا نام بھی لیا تو......" غصے سے بے قابو ہوتے وہ غرایا تھا۔

"اوہ! رئیلی۔" زریاب پر ہنسی کا دورہ پڑ چکا

تھا۔

جانے کتنی دیر وہ ہنستا رہا تھا۔ چونکا تب جب ہنستے ہنستے خواب ناک آنکھوں کی سطح نم ہوئی تھی۔

ہاتھ بڑھایا اور ٹیبل پر سجے ٹشو بکس میں سے ایک ٹشو اٹھا کر آنکھیں تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں بتاؤں وہاج ٹالپر! تمہیں کہ تمہاری یہ حالت دیکھتے ہوئے...... تم پر ایک ایسے پرندے کا گمان ہوتا ہے کہ جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں لیکن پھر بھی وہ آسمان میں اڑان بھرنے کی خواہش میں بار بار زمین پر آ کے گرتا ہو۔ چچ چچ...... ویری سیڈ۔''

اپنا گریبان ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی گرفت سے آزاد کراتا مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہاج نے ضبط سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اپنے تاثرات چھپانے کی غرض سے اپنی کرسی اس کی جانب سے پھیر لی تھی۔

''اوکے۔ گڈ بائے مسٹر وہاج۔'' اس کا شانہ تھپکتے ہوئے ایک محظوظ سی مسکراہٹ لیے اس کی جانب دیکھا اور پھر زریاب نے قدم گلاس ڈور کی طرف بڑھا دیے تھے۔

''ایک منٹ رکو زریاب رضا۔'' وہاج کی آواز بے حد اچانک زریاب کے پاؤں کی زنجیر بنی تھی۔

میر زریاب کو ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

وہاج نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے روبرو آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر اپنے لبوں پر بڑی افسردہ سی مسکان سجاتے ہوئے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

''بے حد معذرت کے ساتھ ڈیئر کزن! میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ میری طرح تمہیں دیکھ کر بھی کسی پر کٹے پرندے ہی کا خیال آتا ہے جسے یہ تک نظر نہیں آتا کہ صدیوں سے جس افق پر وہ اپنے پھر تیلے پروں سے اڑان بھرے جا رہا تھا۔ جس آکاش کے فراخ سینے پر وہ عرصہ دراز سے محو سفر ہے۔ وہ تو دراصل اس کا ہے ہی نہیں۔'' وہ دھاکا کر کے ہنسا تھا۔

''ہاہاہا...... چچ چچ...... کیسے غریب الوطن پنچھی ہو تم زریاب ٹالپر...... جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے مٹھی بھر آسمان تک نہیں لکھا۔''

مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سلگایا تھا اس نے۔ میر زریاب رضا کو اپنے وجود کے پرخچے اڑتے محسوس ہوئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہاج ابراہیم نے یہ الفاظ نہ کہے ہوں بلکہ اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

ہاں زریاب ٹالپر کو اس لمحے معلوم ہوا تھا کہ ذلت کسے کہتے ہیں؟ سینے کے کسی کونے میں چھپے بیٹھے شک پر اس وقت وہاج نے یقین کی مہر ثبت کر دی تھی۔

اب وہ ایسا کم فہم و کم عقل مرد بھی نہیں تھا جو یہ بھی اخذ نہ کر پاتا کہ وہاج ابراہیم پرایا آسمان کسے کہہ رہا تھا۔ وہ پرایا آسمان زی ٹالپر کو کہہ رہا تھا۔

تو کیا واقعی وہ اس کے لیے پرایا آسمان تھی؟ وہ لڑکی جو اس کی اولین چاہت تھی اس کے بچپن کی منگ تھی۔ درد کا دریا اچھل کر اس کی آنکھوں تک آیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ آنکھوں سے نہ چھلکتی۔

''ہاہا......'' اس کی شاک بھری کیفیت پر وہاج کا قہقہہ بے اختیار تھا۔

''ابھی سے اداس ہونے لگے۔ میر زریاب ٹالپر! ابھی سے؟'' وہ لطف لیتے مسکرایا۔

ابھی تو میں نے تمہیں یہ بتایا ہی نہیں کہ اس اتوار کو جس لڑکی سے تم نکاح کرنے جا رہے ہو۔ اس لڑکی کا من ایک ایسا نگر ہے میر زریاب رضا! جس میں ہر چیز بس سکتی ہے۔ ایک سوائے تمہارے۔'' اپنی مسکراتی ہوئی نگاہیں اس کے خوبرو چہرے پر گاڑے وہ زریاب کی روح کو بھڑکتے شعلوں پر گھسیٹ گیا تھا۔

وہ اپنی مٹھیاں بھینچ گیا۔

وہاج ٹالپر اس دفعہ کچھ اور بھی زور سے ہنس دیا تھا۔

''کام ڈاؤن...... ارے یار میرے ریلیکس۔ ایسے مشتعل نہ ہو۔'' وہ چہکا۔ پھر اپنا مسکراتا ہوا چہرہ زریاب کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کے نزدیک

لاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی تھی۔
''ابھی تو ایک بہت بڑا راز تم نے جانا ہی نہیں۔ میں بتادوں؟ وہ رک کر ہنسا۔
''سنو، وہ جو فاروق چاچا سائیں کی بیٹی ہے ناں زویا ٹالپر۔ اس کا دل...... اس کا دل تو وہاج ٹالپر کے سینے میں دھڑکتا رہا۔''
''بکواس بند کرو گھٹیا انسان!'' وہاج اپنی بات مکمل کرتا زریاب نے گریبان سے پکڑ کر ایک زوردار مکا اس کے منہ پر دے مارا۔
''کیا سوچ کر اتنی بکواس کی ہے تم نے ذلیل انسان؟'' وہ پوری قوت کے ساتھ دھاڑا۔
''کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ دادا سائیں کا پوتا ہونے کی وجہ سے میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ واجب القتل ہو تم وہاج ابراہیم۔ اگر کسی کو دیے گئے عہد کی وجہ سے میں مجبور نہ ہوتا تو شیشوں سے سجے تمہارے اس آفس میں قبر بناتا میں تمہاری۔'' بپھرے لہجے میں زریاب چیخا۔
وہاج جی بھر کے محظوظ ہوا۔ ایسا زبردست قہقہہ لگایا کہ آفس کی دیواریں گنگنا اٹھی تھیں۔
''ہاہاہا...... تمہارا یہ سلگتا، بھڑکتا روپ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ غیور وڈیرے کہ میری بات کا ہاتھ سیدھا تمہارے دل پر پڑا ہے۔ کیا سچ میں بہت تکلیف ہو رہی ہے ادھر؟'' وہاج نے سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر زریاب کے دل کی جگہ پر سینے پر ٹھونکی تھی۔
''آئی ول کل یو نان سینس۔'' اس نے اپنے سینے پر رکھا وہاج کا ہاتھ پرے جھٹکا اور ہنوز اس کا گریبان تھامے آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔
''رضا ٹالپر سے کیے گئے وعدے کے عوض تمہاری جان بخش رہا ہوں میر وہاج ابراہیم۔ کیا یاد کرو گے، میں نے تمہاری زندگی خیرات میں بخش دی تمہیں۔''
لہو رنگ آنکھیں اس کے چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے وہاج کو پیچھے دھکیلا۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا آفس سے نکلتا چلا گیا۔
زریاب کے وہاں سے جانے کے بعد وہاج ٹالپر نے اپنا ہاتھ بھیگتی پلکوں پر رکھ دیا تھا۔
پھر پلٹ کر گلاس ونڈو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
اس کی نگاہیں نیچے سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک پر جمی تھیں جبکہ دھیان اس دشمن جاں کی طرف تھا۔
جو محض چند دنوں کے بعد ہی زریاب ٹالپر کی جاگیر بننے والی تھی۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو نہ بدل پائے
خوش نصیبوں سے بہت ہاتھ ملائے ہم نے

☆☆☆

اپنے کمرے کی برطانوی طرز کی قدآدم شیشے کی کھڑکی کے سامنے کھڑی وریشے ٹالپر ڈھلتے آفتاب پر نگاہیں جھکائے کھڑی اس شخص کی بے وفائی پر افسردہ کم حیران زیادہ تھی۔
کیسا کٹھور دل تھا وہ، ایک جانب تو زریاب رضا کے من میں چھپی مورت کو چرا رہا تھا۔ دوسری جانب وریشا رضا کے دل کا کعبہ بھی ڈھا دیا تھا اس نے۔
نازک ہاتھ بڑھا کر سلک کی ڈور کو کھینچا تو بھاری پردہ قدم آدم کھڑکی کے اوپر آ گرا یوں وریشے کی بھیگتی آنکھوں کے آگے سے پگھلتا آفتاب یکا یک اوجھل ہوا تھا۔
من محل کی تمام بتیاں تو کب کی بجھ چکی تھیں، بالآخر اندھیرا اس کی خواب گاہ میں بھی آن بسا تھا۔

ہے کوئی جھانکنے والا اداس آنکھوں میں
یہ آنکھیں جن کے لبوں پر کوئی سوال نہیں
ہر اک کمال کو آخر زوال دیکھنا ہے
ہے ایک عشق کا سورج جسے زوال نہیں

☆☆☆

مور تھور ٹلے رانا
مور تھور ٹلے......
سوہن پور کی حویلی کے بڑے سے صحن میں

ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ خاندان بھر کی لڑکیاں کبھی شادی کے شوخ گیت گاتے ہوئے تو کبھی جھومر (ڈانس) کرتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ دولہا کی اکلوتی بہن کو بھی گھسیٹ لیتیں۔ وریشے ٹالپر میں کمال کا ضبط تھا۔ وہ اپنے دل کو بھائی بھائی کی خوشیوں میں پیش پیش تھی۔

کل شام تک زریاب رضا کی دلہن کو مایوں بیٹھ جانا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی عباد اوا کے سیل پر ابراہیم چاچا سائیں کی کال آئی تھی۔ وہ لوگ کچھ ہی دیر میں گاؤں پہنچنے والے تھے۔ فاروق چاچا سائیں کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔

وریشے کی ہدایت پر ملازمہ لڑکیوں نے ہاتھوں میں پھولوں کی پتیوں سے بھری پلیٹیں سنبھال رکھی تھیں۔

انہیں سمجھایا گیا تھا کہ جیسے ہی دلہن والے حویلی کے زنان خانے میں قدم رکھیں۔ ان کے اوپر گلابوں کی تازہ مہکتی پتیاں نچھاور کر دی جائیں۔

چند لڑکیاں کاموں میں الجھی وریشہ کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے آئی تھیں۔

بعد میں سب کے بے حد اصرار پر وہ سندھی سہرے (سندھی گیت) پر۔

رانو چھونہ مرکھری ملی کنوار

(رانا کیوں نہ مسکرائے نازک اندام سی دلہن جو ملی ہے اس کو)

پرڈانس کرنے لگی۔

پنک اینڈ گرین کلر کے دیدہ زیب پشواز میں ملبوس بالوں کی سیدھی سی مانگ نکالے۔ اس کامنی سی سندر شہزادی پر چاندنی رات میں رقص کرتی کھل کی کسی مورنی کا گمان ہوتا تھا۔

ہلی باھن لوڈی

(وہ غرور سے کیوں نہ چلے)

رانا چھونہ مرکی

(رانا کیوں نہ مسکرائے)

وریشے ٹالپر کا کھل سا روپ اس وقت وہاں موجود ہر آنکھ کو خیرہ کیے دے رہا تھا۔

سویرا ٹالپر عباد رضا کی بیوی نے اٹھ کر ہزاروں کے کئی نوٹ اپنی نند پر وارنے کے بعد ملازم لڑکیوں میں بانٹ دیے تھے۔

”وریشے جان! نظر لگ جائے گی۔“ سویرا بھابھی نے مسکرا کر چھیڑا تھا۔

وہ معصومیت سے مسکرادی۔ یہ الگ بات تھی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے تھے کہ نظر تو اس کو لگ چکی تھی۔

ادھر اوطاق میں میر رضا ٹالپر اپنے دونوں بیٹوں عباد رضا اور زریاب رضا کے سنگ دونوں بھائیوں کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔

☆☆☆

وروح کی دل جہاں وکوڑ یو تھی

(روح کو امر بیل کی طرح جکڑا ہے)

چھانہ جی، ساجی جوڑیو تھی

(کیا تم نے دل سے دل جوڑا ہے)

ابراہیم ٹالپر کے تعاقب میں دوڑتی میر فاروق کی بی ایم ڈبلیو کے اندرونی ماحول میں عابدہ پروین کی آواز کا جادو بکھرا تھا۔

وہ جو کار کی پچھلی سیٹ پر نڈھال سے انداز میں بیٹھی، دائیں کلائی میں سجی اپنی سیاہ چوڑیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں مگن تھی۔

عابدہ پروین کی تان پر اپنی خوب صورت آنکھوں کو چھلکنے سے نہ روک پائی تھی۔

چوڑیوں چند جیاں ٹٹیوں ھن

(چوڑیاں چاند کی طرح ٹوٹی ہیں)

ایئر ویاھن کی مروڑیو تھی

(اس طرح کلائی کو مروڑا ہے)

زی نے دودھیا کلائی میں سجی کانچ کی سیاہ چوڑیوں کو اتنی شدت سے بھینچا تھا کہ وہ دوسرے ہی لمحے کئی حصوں میں بٹ کر اس کی گود میں آ گری تھیں۔

سرخ لہو کی لکیر سفید کلائی پر ابھر آئی تھی۔

"یہ کیا..... کیا آپی.....؟" ساتھ بیٹھی کمانڈو نے تڑپ کر سرگوشی کی تھی اور پھر اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

زویا تالپر کی نرگسی آنکھیں آنسوؤں سے بھ گئیں۔

کچھ بھی کہنے کے بجائے ایک زخمی سی نگاہ بہن کے چہرے پر ڈالی تھی۔

(ہائے مہینوال تیری بانسری)
(اتنی صدائیں دیں کہ آج ڈبو دیا)

آنسو زی کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کی گود میں گرنے لگے۔

"آپی! بس بھی کریں اور کتنا روئیں گی۔ زریاب ادا آپ کو اتنا پیار کریں گے کہ دہاج ادا کی یاد بھول جائے گی۔" کچھ اور نہیں سوجھا تو ردا نے اپنے سیل میں یہ لکھ کر زی کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

بابا مما کی موجودگی میں وہ اسی طریقے سے اس کو تسلی دے سکتی تھی۔ زویا نے بے رخی سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا اور رخ موڑ کر آنکھیں موند لیں۔

ٹھیک اس وقت دونوں بھائیوں کی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے سوہن پور کی حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"السلام علیکم چاچا سائیں! موسٹ ویلکم۔" زریاب فاروق چاچا سائیں کے پاؤں چھوتے مسکرایا تھا۔

زی جو گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ اجرک کی اوٹ سے ذرا سا چہرہ نکال کر ایک قہر بھری نگاہ اس شخص پر ڈالی۔

اخروٹی رنگ کے کلف دار کاٹن کے سوٹ پر ہم رنگ ویسٹ کوٹ پہنے۔ گولڈن ڈائمنڈز کے کف لنکس لگائے قیمتی سنہری گھڑی الٹے ہاتھ پر باندھے، سلیقے سے بالوں کو ایک طرف جمائے، ایک شان کے ساتھ کھڑا بہت فریش نظر آ رہا تھا۔

"او تو یہ بات ہے مسٹر زریاب تالپر۔ فتح کا نشہ آپ کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے؟" زی تالپر نے بے ساختہ اپنے لب کاٹ لیے۔

"خیر تسلی رکھیے جناب، اس نشے کی جگہ اپنی نفرت کا زہر آپ کی رگ رگ میں نہ اتار دیا تو میرا نام بھی زویا فاروق نہیں۔" اس نے ایک سلگتی نظر اس پر ڈال کر خود سے عہد کیا۔

شاید یہ ان دو جلتے انگاروں کی حدت ہی تھی جو ابراہیم چاچا سائیں سے گلے ملتے نگاہ اٹھا کر زریاب نے بھی اچانک اس طرف دیکھا تھا اور اس پری وش کو اپنی جانب متوجہ پا کر اس کے اداس چہرے پر رونق سی بکھر گئی تھی۔

"تو ثابت ہوا میر دہاج ابراہیم! تم نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ نگاہ تو ہم پر مرتی ہے۔" بے حد دلنشین انداز میں میر زریاب کے ہونٹ مسکائے تھے۔

زویا تالپر نے دفعتاً نگاہ جھکا لی تھی اور سرعت سے اپنے قدم زنان خانے کی جانب بڑھا دیے۔

اس بات سے قطعی بے خبر کہ اس کی فقط ایک نظر نے ہی کسی کے دل میں کیسے خوش رنگ پھول کھلا دیے ہیں۔

نگاہ ناز کو مصروف کار رہنے دے
دل بے خبر کو یوں ہی بے قرار رہنے دے
وفور شوق سے آ گیا، آنکھوں میں میرا دم
یہ التفات نظر بار بار رہنے دے

☆☆☆

"سنیے، وریشے آپی! یہ لینز مجھ سے نہیں پہنے جا رہے۔ آپ یہ میری آنکھوں میں لگا دیجیے پلیز۔" شادی والے دن منہ بسورتی کمانڈو ردا دلہن کے کمرے میں کھڑی وریشا کے پاس آ کر بولی تھی۔

کسی بے جان پتھر کے مجسمے کی طرح میک اپ کرانے کے لیے بیوٹیشن کے سامنے آ بیٹھی زویا نے قدرے استہزائیہ انداز میں نظر اٹھا کر وریشے کی سمت دیکھا تھا۔

"اف یہ کمانڈو بھی۔ کس کی پاس آ گئی یہ کام لے کر..... اب وہ گاؤں کی ان پڑھ جٹی کیا جانے

لینسز ہوتے کیا ہیں؟" حقارت سے سوچتی وہ دوسرے ہی پل حیران رہ گئی تھی۔

جب وریشہ نے نہ صرف پانچ منٹ کے اندر دونوں لینسز کمانڈو کی آنکھوں میں سجا دیے تھے بلکہ پلٹ کر وہ زیور نکالنے لگی تھی۔

"ہونہہ، اتنا سا کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔" اس نے فوراً نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

"ماشاءاللہ بھابھی! بے حد خوب صورت لگ رہی ہیں آپ۔"

بھاری کام سے سجا گولڈن اینڈ پنک کمبینیشن کا دوپٹا جوں ہی بیوٹیشن نے زی کے سر پر ڈالا تھا، کچھ فاصلے پر کھڑی وریشے اچانک آگے بڑھ آئی تھی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر نازک لبوں سے لگا لیا تھا۔

اس کی اس غیر متوقع حرکت پر زی کے وجود میں ناگواری کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ فوراً سے پیشتر اس نے وریشے کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

دلہن کی اس درجہ بے زاری کو شہر سے آئی بیوٹیشن نے استعجاب سے دیکھا تھا۔ جبکہ اس قدر زکی پر وریشے تالپر کے چہرے کا رنگ یکا یک پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہ عجلت میں تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"وریشے آپی...... وریشے آپی......"

وہ جیسے ہی صحن میں پہنچی، کمانڈو کہیں سے آ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

"کیا ہوا کمانڈو؟" وریشے اسے خود سے الگ کرتے مسکرائی۔

"جناب آپ کے لیے گڈ نیوز ہے۔" کمانڈو نے آنکھیں گھمائیں۔

"وہاج ادا سائیں گاؤں پہنچ چکے ہیں۔" وہ دھماکا کر کے ہنس دی تھی۔

وریشے تالپر کا نازک وجود لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کا چڑیا سا دل اندیشوں کی زد میں آ کر دھڑک دھڑک اٹھا۔ اب جب میر زریاب رضا کا نکاح ہونے میں محض چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے تو وہ شخص اچانک آن پہنچا تھا۔

تو کیا وہاج تالپر سب کچھ تباہ کرنے کی خاطر لوٹ آیا تھا۔

تو بھی دیکھ صحرا میں جھلستے ہوئے درخت
کیسے جلتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

☆☆☆

اللہ وسایو کو ہدایت دیتے اس کے لب حرکت کرنا بھول چکے تھے۔ وہاج تالپر کو پنڈال میں قدم رکھتے دیکھ کر زریاب رضا کا خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

"رک جاؤ وہاج! وہیں۔ ایک قدم مزید آگے نہیں بڑھاؤ گے تم۔" تیز تیز قدم اٹھاتا وہ اس کے قریب آ کر دبے لہجے میں چیخا تھا۔ مقابل کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"تم روکو گے مجھے یو ایڈیٹ؟" مسکراتی سی ایک نگاہ مہمانوں سے بھرے پنڈال پر دوڑاتے وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" زریاب نے دانت کچکچائے۔ "میں ہی روکوں گا تمہیں۔"

"بڑے ہی بہادر ہو گئے ہو خوش پور کے جاہل وڈیرے۔ تمہیں تو مہمانوں کے سامنے اپنی ناک کے کٹ جانے کا خوف تک نہیں رہا۔" وہاج نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

"بکواس بند کرو۔ اور دفع ہو یہاں سے......" زریاب نے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پنڈال کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے پہلے کہ میں اپنے مزارعوں کو آواز دوں اور وہ تم کو اٹھا کر پنڈال سے باہر پھینک آئیں۔ آؤٹ رائٹ ناؤ۔"

"چچ چچ...... کس قدر اکڑ رہے ہو تم زریاب رضا۔" اس کے انداز پر وہ زہر خند سا ہنسا تھا۔ "کچھ پتا ہے تمہیں۔ تمہاری اسی اکڑ کا علاج کرنے تو گاؤں لوٹا ہوں میں۔ ذرا سا صبر کرو شہزادے! ابھی ختم کرتا ہوں تمہاری یہ تند خوئی۔" اپنی لہو رنگ آنکھیں اس کی گم صم

وخواب ناک آنکھوں میں گاڑے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ بڑے پرسکون انداز میں آگے بڑھا تھا۔

اور پھر سامنے سے آتے رضا تالپر کے ساتھ لپٹ گیا۔

"بڑے بابا... آئی مس یو۔" بھرائے لہجے میں کہتا وہ زریاب کو اپنے لب کچلنے پر مجبور کر گیا تھا۔

وہ محض وہاج کی پشت کو گھورتا رہ گیا۔ جبکہ اس کو پنڈال میں دیکھ کر رضا تالپر کے پیچھے اس طرف آتے ابراہیم تالپر اور میر فاروق کے چہرے مسرت سے دمک اٹھے تھے۔

"بڑے بابا! مجھے معاف کر دیجیے۔" بھرپور اداکاری کرتے وہ روہانسا ہوا تھا۔ رضا تالپر نے نثار ہوتے ہوئے وہاج کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیے تھے۔

"مجھے پتا تھا وہاج! تم لوٹ آؤ گے۔" خوشی سے لرزتی آواز میں کہتے ابراہیم تالپر نے اس کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"میں بے حد شرمندہ ہوں بابا! مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔" اس نے سکون سے دھماکا کیا تھا۔

"میں اپنی منگ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اور بڑے بابا اجازت دیں تو.... میں ابھی اور اسی وقت میر زریاب رضا کی بہن کے ساتھ نکاح کرنے کو تیار ہوں۔"

"زریاب رضا کی بہن" کو کھینچ کر ادا کرتا، کچھ فاصلے پر کھڑے زریاب کی آنکھوں میں جھانکتے میر وہاج ابراہیم بڑے ہی فاتحانہ انداز سے مسکرایا تھا۔

زریاب جانتا تھا، اس کے حصہ کی سزا اس کی بہن کو دینے کے لیے وہاج یہ نکاح کرنے جا رہا تھا۔

وہ بس اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ مجبوری نہیں تھی، یہ اداکاری نہیں ہے
مگر دونوں طرف پہلی سی سرشاری نہیں ہے
میں تیری سرد مہری سے دل نہیں ہوں
میرے دشمن تیرا یہ وار بھی کاری نہیں ہے

آج تالپروں کی حویلی میں دو بے حد عجیب دلہنیں سجائی گئی تھیں۔ ایک دلہن وہ جس کو شاید تمام رات ہی اپنے دولہا کے انتظار میں سیج پر بیٹھے رہ جانا تھا۔

اور ایک دلہن وہ جس کو جوں ہی سکھیاں حجلہ عروسی میں چھوڑ گئی تھیں۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی ایک ایک چیز کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔

زریاب رضا کی خواب گاہ کی سجاوٹ دیکھ کر زویا تالپر پر گویا کوئی جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ مسہری کے گرد سجی سفید موتیوں کی لڑیاں توڑ کر اس نے ایک ایک کر کے فرش پر پھینک دی تھیں۔ بیڈ سے چادر کھینچ اور موتیوں کی ٹوٹی لڑیوں کے اوپر گرا دی۔ گلاب کی پتیاں ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔

عروسی دوپٹا پنوں کی قید سے آزاد کیا اور اتار کر فرش پر پھینک دیا۔ کلائیوں میں سجی سونے کی تمام چوڑیاں ایک ایک کر کے اتار کر پھینکیں اور ماتھے پر سجا ٹیکا کھینچ کر دور اچھال دیا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پرفیومز اور کاسمیٹکس کی تمام چیزیں اٹھا اٹھا کر دیواروں پر دے ماریں۔ اس کو پہنائی گئی تمام جیولری میں سے بس ایک نتھ ہی تھی جو اس سے اتاری نہ گئی تو زی نے اس کو چھوڑ دیا اور خود زمین پر بیٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رونے لگی۔

☆☆☆

دل میں دھڑکتے نرم گرم جذبات کی ترنگ لیے ابھی اس نے حجلہ عروسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے جب جیب میں رکھا سیل گنگنا اٹھا تھا۔

زریاب کے تمام دوستوں نے اس کے نکاح میں شرکت کی تھی اور سب ہی نے وہیں مبارک باد دے دی تھی تو پھر اس وقت کس کی کال آ گئی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے قمیص کی پاکٹ سے سیل فون نکالا۔ پر دوسرے ہی پل اسکرین پر وہاج تالپر کا نمبر دیکھ کر اس کو حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔

"وہاج کو تو اس وقت وریشے کے پاس ہونا چاہیے تو پھر یہ مجھے کیوں کال کر رہا ہے اس وقت؟"
اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے سیل کان سے لگالیا۔
"کیسے مزاج ہیں سالے صاحب؟" کال ریسیو کرتے ہی وہاج کی سلگتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔
"ابھی تمہارے ساتھ پنڈال میں نکاح پڑھوا کر لوٹا ہوں۔ میرے حالات تم نے دیکھے تھے...... کتنے بہتر ہیں۔" سنجیدہ لہجے میں جواباً وہ چیخا تھا۔
"تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ لوگ کس طرح بہنوئیوں کی عزت کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں؟"
"ویل ایجوکیٹڈ بزنس مین۔ بہت سے لوگوں نے مجھے یہ بات بتائی ہے مگر...... میں عزت دل سے کرتا ہوں، مجبور ہو کر نہیں...... اور بہنوئی بن کر کون سا تم میرے گاؤں کے سادات کے عہدے پر فائز ہو گئے ہو جو میں تمہاری عزت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"
"مجبور تو تم ہو جاؤ گے...... اور وہ بھی موت کی دعائیں مانگنے پر۔ کیونکہ میں تمہاری بہن کی زندگی کو ایسی دوزخ بنا دوں گا میر زریاب رضا! کہ تمہاری روح تک کانپ جائے گی۔"
سوچنے کی بات تھی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس شخص کے لہجے میں چھپی دھمکی کو محسوس کرتے ذرا دیر کے لیے ہی سہی زریاب رضا اپنے رویے میں ذرا سی لچک ضرور پیدا کر لیتا۔ کیونکہ جو بھی تھا وہاج اب فقط اس کا کزن ہی نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ سہاگ تھا اس کی بہن کا، وریشہ رضا کی تمام خوشیاں اب وہاج ٹالپر کے ساتھ جڑی تھیں۔
تو کیا اس کی نظروں میں اپنی اکلوتی بہن کی خوشیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی یا پھر اپنی خوشیوں کے آگے اس کو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی کم سن معصوم سی بہن کی من موہنی صورت بھی نہیں۔
وہ جواباً ہنس کر گویا ہوا۔
"وہ تو جب تم بتاؤ گے وہاج ابراہیم! تب دیکھا جائے گا...... لیکن ابھی تو خود تم کو دیکھ کر گیلی لکڑیوں کا خیال آتا ہے جو نہ جلتی ہیں نہ بجھتی ہیں بس دھواں دیتی ہیں۔"
ہمیشہ کی طرح بات کے اختتام پر ہنستے ہوئے وہ وہاج کھلسا گیا تھا۔
"نونان سینس......" آنچ دیتے دھوئیں کی لپٹیں اس کے لہجے سے اٹھی تھیں۔
"بات کرنے کی تمیز تو تم میں کل تھی نہ آج آئی...... اور کون سا میں نے تمہاری یہ بکواس سننے کے لیے فون کیا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا تھا پھر قہقہہ لگاتے گویا ہوا۔
"میں نے تو فقط یہ بتانے کے لیے کال کی تھی جاہل وڈیرے! اپنی تمناؤں کی سیج پر بیٹھی وہ تمہاری اجڈ گنوار بہن کس طرح انتظار کے کانٹے چن چن کر...... پل پل اپنی نازک سی انگلیاں فگار کیے جا رہی ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میر زریاب ٹالپر! اس کا یہ انتظار لاحاصل رہنے والا ہے کہ میں جا کر تھوکوں گا بھی نہیں اس پر۔" تند و تیز لہجے میں کہتا وہ اس کو لب کاٹنے پر مجبور کر گیا تھا۔
بات ہی ایسی کی تھی اس نے کہ زریاب کی تمام حاضر جوابی دھری کی دھری رہ گئی۔
اس نے اس نہج پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔
تو کیا وہاج ابراہیم سچ مچ اس کی بہن کی زندگی برباد کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے مزید کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔
"مائی گاڈ"
حجلہ عروسی کے اندر قدم رکھتے ہی وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں ابھی کچھ دیر قبل زلزلہ آیا ہو۔ جس نے کمرے کی ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دی تھی۔
یہ میر زریاب رضا کی خواب گاہ تھی۔ جہاں کی ہر چیز سے نفاست ٹپکتی تھی مگر اس وقت تو جیسے ہر چیز اجڑی بکھری دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے حیرت سے فرش پر بکھری سفید موتیوں کی لڑیوں کو دیکھا تھا۔ جنہیں آج شام کو مسہری کے گرد بڑی محبت سے سجایا گیا تھا۔

لیکن جو اس وقت بیڈ کی چادر کے قریب فرش پر پڑی اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ کمرے میں پھیلی مختلف پرفیومز کلون و کاسمیٹکس کی ملی جلی خوشبوؤں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا۔

جب گولڈن و پنک کنٹراسٹ کے دلہن کے بھاری و کام دار دوپٹے کو صوفہ کے قریب فلور پر پڑا دیکھ کر کوئی کانچ سی آرزو زریاب ٹالپر کے من کے کونے میں ٹوٹ کر بکھری تھی۔

اس نے لب بھینچتے ہوئے ایک قدم مزید آگے بڑھایا تھا۔

کوئی چیز اس کے پاؤں سے آ ٹکرائی تھی۔ جسے ذرا سا جھک کر اس نے اٹھالیا تھا۔

وہ ایک بے حد خوب صورت ست لڑا جس کو سندھی میں (ڈری) کہتے ہیں۔ اور یقیناً اس ڈری سیٹ کو شام میں دلہن کو تیار کرنے کے دوران بیوٹیشن نے اس کے گلے میں سجایا ہوگا۔

پر اس وقت اسے کمرے میں آ کر دولہا نے زمین پر سے اٹھایا تھا۔ ڈری میں جڑے قیمتی موتیوں پر نگاہ جمائے کئی خواب زریاب رضا کی آنکھوں میں جل بجھے۔

عشق کا تیر کمان سے باہر ہے
فگار دل کی حالت بیان سے باہر ہے
درمان درد کا تو امکان نہیں ملتا
ہاں یہ آہ جو فغاں سے باہر ہے

یہ کیسا دھواں تھا جو اٹھا تو اس کے دل سے تھا مگر دھند کی دیوار آنکھوں کے آگے تن گئی تھی۔

وہ اب ایسا بے وقوف تو ہرگز نہیں تھا جو یہ نہ سمجھتا کہ یہاں کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہاں پر تو سوگ منایا گیا تھا۔

زریاب ٹالپر کی خواب گاہ میں بیٹھ کر وہاج ابراہیم کی جدائی کا سوگ۔ اس کے مہکتے ارمانوں کی سیج بیٹھ کر اس کی نئی نویلی دلہن نے اس کے دشمن کے فراق میں اپنا دل لہولہو کیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔

ہاتھ میں تھامی ڈری کو اس نے اتنے زور سے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر دے مارا تھا کہ شیشے کی نفیس سطح چٹخ گئی۔ کسی بھاری چیز کے شیشے سے ٹکرانے کی آواز پر اپنے بال بکھرائے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیے زمین پر بیٹھی کسی بیوہ کی طرح سوگوار اس کی دلہن نے اچانک چونک کر سر اٹھایا تھا۔

اور جوں ہی زریاب ٹالپر پر نظر پڑی۔ زویا فاروق کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔

"یو......" طیش کی زیادتی سے مٹھیاں بھینچتا وہ اس کی جانب بھوکے شیر کی مانند لپکا تھا۔

اور وہ جو فروٹ باسکٹ سے اٹھائی گئی چھری کب سے اپنے پہلو میں چھپائے بیٹھی تھی۔

"رک جائیے مسٹر زریاب ٹالپر!" وہ ایک دم سے سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی، زریاب کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔

"وہیں رک جائیے زریاب رضا! اگر آپ نے ایک قدم بھی مزید میری جانب بڑھایا تو...... میں ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنے آپ کو یہیں پر ختم کر دوں گی۔" وہ چیخی۔

وہ جو آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر ایک عدد تھپڑ رسید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لڑکی کا جنون دیکھ کر بت ہی تو بن گیا تھا وہ...... اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس موم کی گڑیا کو دیکھا۔

جو اپنی راج ہنس سی نازک سی گردن پر تیز دھار چھری تانے کھڑی تھی۔ اتنی ناپسندیدگی، ایسی نفرت؟

ایسا لگتا تھا وہ اس کی طرف ایک قدم بڑھائے گا اور وہ اپنی گردن تن سے جدا کر دے گی۔ زریاب ٹالپر کی قربت کا خوف زی ٹالپر کو موت کے قریب لے جائے گا۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ لڑکی جو اس کا پاکیزہ عشق بھی تھا۔

وہ اسے یوں بے وقعت کردے گی، کب سوچا تھا اس نے۔

اس کو لگا جیسے سینے کے اندر ٹھاٹھیں مارتا پیار کا دریا اپنے لہو میں آپ نہا گیا ہو۔ جیسے دل کی رگ رگ میں کسی نے تیزاب کی بوندیں ٹپکادی ہوں۔

اس کی آنکھوں کے آگے تو اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔

''زی ٹالپر...... اسٹاپ اٹ۔'' سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں خود کو سنبھالتا، وہ بدقت گویا ہوا۔ ''دیکھو، میں قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ پھینک دو یہ چھری......'' اضطراری انداز میں ہاتھ ملتے وہ کراہا۔

زویا استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔

''ارے واہ۔ کمال ہے، اپنی ضد پوری نہیں کریں گے آپ؟ ویسے تو ہر بات میں ضد کرنا آپ کی فطرت ہے۔ آج بھی بسم اللہ کیجیے۔ دیکھیے گا پھر میں بھی اس وجود کو کیسے آپ کی نگاہوں کے سامنے ہی بے جان کیے دیتی ہوں۔'' انگوٹھے سے اپنی جانب اشارہ کرتے اس نے کہا تھا۔

زریاب کڑکڑاتی سفید قمیص کے پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر سیل فون پر اپنی گرفت مضبوط کرتے دکھ سے مسکرایا۔

''نہیں زویا فاروق......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''آج میں ضد نہیں کرنے لگا۔ آج تم جیتیں، میں ہارا......'' یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے جیب سے موبائل فون کھینچ کر زویا کی جانب اچھالا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا، وہ شخص بلا کا نشانے باز تھا۔ چوک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''آؤچ......''

وہ جو اپنی جیت کی خوشی میں مگن و سرشار کھڑی تھی، دفعتاً زریاب کا سیل جب زور سے اڑتا ہوا ہاتھ کی پشت سے ٹکرایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ذرا سی گرفت ڈھیلی پڑنے کی دیر تھی، چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔

یہ ہی وہ موقع تھا جس کا فائدہ میر زریاب نے اٹھایا۔ فوراً آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

''اسے میری جانب سے منہ دکھائی کا گفٹ سمجھو۔ کیونکہ زویا ٹالپر ایسے ہی تحفے کی حق دار ہو تم۔''

جب کہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے منہ دکھائی میں ایسی ذلت اٹھانے کے باوجود اس کی دلہن ہنس پڑی تھی۔

''دکھادی، اپنی اصلیت میر زریاب رضا! آپ نے...... آخر دکھا ہی دی ناں؟''

''ہاں میری اصلیت......'' اس کی بات کے جواب میں وہ اتنی قوت سے چلایا تھا کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔

''میری اصلیت دیکھنا چاہتی ہو ناں تم؟'' دونوں شانوں سے تھام کر دیوار کے ساتھ اسے کھڑا کرتے وہ اس کی خوف سے پھٹی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غرایا تھا۔

''تو سنو...... یو نان سینس...... میری اصلیت یہ ہے کہ نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں تم پر آج ترس کھا رہا ہوں...... اگر جوزی فاروق یہ ترس نہ کھاتا میں تم پر تو ابھی بلا کر لے آتا فاروق چاچا سائیں کو اس کمرے میں اور...... اور دکھاتا ان کو اپنی بیٹی کا یہ بیواؤں جیسا اجڑا اجڑا روپ...... پھر پوچھتا ان سے کہ میری زندگی میں شامل کرنے سے پہلے کیا انہوں نے اپنی بیٹی سے اس کی مرضی دریافت نہیں کی تھی...... اگر واقعی ایسا ہے تو کیوں جھونکا انہوں نے میرے جیون کو اس جہنم میں......''

رنج و ملال بھری کیفیت میں یہ سب کہتا وہ اس کی آنکھوں سے دھند کا پردہ ہٹا رہا تھا۔

زویا کی آنکھیں بھر آئیں اور لب کپکپا اٹھے۔ اپنے جان سے پیارے بابا کے سامنے شرمندہ ہونے کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ گئی تھی۔

اس پہلو، اس رخ پر تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ یہ شخص یوں بھی تو اس کا تماشا لگا سکتا تھا۔

پھر کیا عزت رہ جاتی اس کی حویلی کے ہر فرد کی

نگاہ میں؟ لب کچلتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور سامنے کھڑے شخص کی سمت دیکھا۔ جو مضطرب لہجے میں اس سے شکوہ کناں تھا جس کے لبوں پر بڑی ہی مجروح سی مسکان ناچتی تھی۔ اور نگاہوں سے عجیب سا خالی پن جھلکتا تھا۔

روتی کرلاتی رات کے سناٹے میں زریاب کی بھاری گمبھیر آواز گونجی۔

"لیکن خیر، جانے دو، تم کیا جانو محبت کیا چیز ہے، دیکھو ہم دنیا ہی چھوڑ جاتے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے وہ چمکتی چھری اپنے ہاتھ کی کلائی پر پھیر چکا تھا۔

"زر...... یا...... ب......" اس کا نام ٹوٹ کر زی کے لبوں سے ادا ہوا۔

"آئی لو یو...... آئی رئیلی لو یو زی......" کسی جنون کے زیر اثر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا کہنے لگا۔

شاید وہ تاریخ کا پہلا دولہا تھا جو خود کو زخم دے کر اپنی بیوی سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ اس کی دلہن جو اس اجاڑ روپ میں بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ زیور کے نام پر فقط ناک میں بجی اکلوتی نتھ ہی اس کے حسن کو نکھار بخشنے کے لیے کافی تھی۔

وہ ساکت کھڑی زریاب کی کلائی سے بہتے خون کی سرخ دھار کو تکتے ہوئے حیرت زدہ سی دکھائی دیتی تھی۔

شاید نہیں یقیناً زویا کو اس سے اس قدر جنون کی توقع نہیں تھی۔ جب ہی تو اس نے اک جھرجھری سی لے کر اپنی نظریں جھکالی تھیں۔

جبکہ اس کی اس نظریں جھکا لینے والی حرکت پر وہ ایسا مضطرب ہوا کہ یکایک درمیان کا فاصلہ پاٹ کر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ بھر لیا، احتجاج کی کوشش میں زی کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

گریز کی اس انتہا کو محسوس کرتے زریاب اذیت بھری ہنسی ہنس دیا۔ پھر دھیرے سے اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے سے آزاد کرتا پلٹ کے بیڈ کی طرف جانے لگا۔

جب سرعت سے آگے بڑھ کر زی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ رات کی ڈوبتی نبض نے اچانک رفتار پکڑ لی۔

وہ ایک دم ہی جی اٹھا تھا۔ جب وہ بھرائے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"دکھائیں مجھے ہاتھ...... زریاب پلیز...... خو...... خون بہت تیزی کے ساتھ بہہ رہا ہے......" بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ قریب آئی تھی۔

اس نے پلٹ کر اس جیتی جاگتی قیامت کو دیکھا۔ پھر دھیرے سے لبوں کو حرکت دی۔

"کیا کرو گی اسے زندگی! دیکھ کر؟ ایک نیا زخم دو گی...... کہ مرہم لگاؤ گی؟" گمبھیر لہجے میں اس نے طنز کیا۔

زویا نے اپنے لب دانتوں تلے کچل ڈالے۔

اس کی اس ادا کا نوٹس لیتے وہ نگاہ جھکا کر مسکرا دیا۔

رہنے دو کیونکہ زریاب رضا خیرات میں ملی توجہ پر تھوکتا ہے۔" برہم لہجے میں بات ختم کرتا وہ ایک دم سے اپنا ہاتھ چھڑاتا بیڈ پر جالیٹا تھا۔

زویا فارق کی جان پر بن آئی

یہ سچ تھا کہ اس کے پاس اس شخص کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر یہ بھی تو کبھی اس نے نہیں چاہا تھا کہ زریاب اس کی وجہ سے یوں خود کو ختم کر ڈالے۔ سفید بیڈ کے کور پر کلائی سے بہتے خون کی وجہ سے سرخ رنگ کے دھبے بنتے جا رہے تھے۔

اور وہ تھا کہ خود اذیتی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ ہاتھ سے رستے خون کی پروا کیے بنا زی کے دل پر چرکے لگائے جا رہا تھا۔

میں چاہتا تھا بتادوں دیوتا نہیں میں
مگر وہ حسن مرے نور سے ڈرا ہوا تھا
ہم ایک ساتھ تھے اور اپنی اپنی نیند میں تھے
وہ سو رہی تھی، علی اور میں مرا ہوا تھا

''میں مرا ہوا تھا'' کو کھینچ کر ادا کرتا وہ زی کی روح کو فنا کر گیا تھا۔ وہ جو سوچے بیٹھی تھی کہ آج رات زریاب تالپر کو اتنا تڑپائے گی کہ وہ اپنی ضد پر پچھتانے بیٹھ جائے گا تو بات الٹی ہو چکی تھی۔
اس نے خود تڑپنے کے بجائے زویا کو رلا دیا تھا۔

☆☆☆

تمام رات بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد رات کو چار بجے کے قریب جب وہ پھولوں سے مہکتی حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو اس کو ایک زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔
چار جنوری کی یہ سرد رات جس کی قامت پر قیامت کا گماں ہوتا تھا۔ اس قیامت کی رات میں وہ جو پل پل سوچتا رہا تھا کہ......
گلابوں سے سجی سیج پر بیٹھی میر زریاب تالپر کی بہن اپنی قسمت پر ماتم مناتے اشکوں کے دریا بہا رہی ہوگی۔
اپنی سوچ کے برعکس کمرے کے بیچوں بیچ میرون رنگ کی مخملی جائے نماز بچھائے وریشہ تالپر کو تہجد ادا کرتا دیکھ کر وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔
میرون مخملی جائے نماز میں دھنستے اس کے خوب صورت دودھیا پاؤں دعوت نظارہ دے رہے تھے۔
بیضوی چہرے پر پھیلے سرمدی نور کا ظہور وہاج ابراہیم کے اندر آگ بھڑکا گیا۔
سفید رنگ کے لباس میں ملبوس وریشہ رضا پر کسی حور کا گماں ہوتا تھا۔
وہ حور سراپا حسن تھی۔ سراپا اطاعت تھی۔ قدرت کا دل نشین شاہکار تھی، اس کے چہرے سے پھوٹتی روشن کرنوں سے معلوم ہوتا تھا، کوئی بری سوچ اس کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ اس لڑکی کے خیالات بے حد خوب صورت ہیں، اس کی سوچ بہت سندر ہے۔
اس نے ہمیشہ اپنے لیے چھوٹی سے چھوٹی چیز اللہ سائیں سے مانگی تھی۔
اسے لوگوں سے مانگنے یا آس لگانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ تو فقط اسی سلطان سے مانگتی تھی بس وہ وریشہ تالپر سے بہت پیار تھا۔
اور وریشے تو اپنے رب کی بے حد شکر گزار بندی تھی۔
وہ اللہ سائیں سے ایسے مانگا کرتی جیسے ایک بھکارن کو کسی بادشاہ سے مانگنا چاہیے۔ وہ اس سے بھیک مانگتے ہوئے رو پڑتی تھی لیکن وہ کبھی بھی اتنا نہ روئی تھی کہ جتنا اسے وہاج تالپر کو اللہ سائیں سے مانگتے ہوئے رونا پڑا تھا۔
اس نے میر وہاج کے لیے اللہ سے ضد نہیں کی تھی۔ بس اپنے لیے رحم کی درخواست کی تھی۔
''اللہ سائیں! اگر وہ شخص میرے حق میں بہتر ہے تو اس کو میرا کر دے۔ اگر بہتر نہیں تو...... تو میرے دل سے اس کی چاہت کے نقش مٹا دے۔
تو کیا میر وہاج ابراہیم کو آج وریشہ رضا کے لیے بہتر سمجھ لیا گیا تھا؟ اگر واقعی ایسا تھا تو وہ اس حور کے عطا کیے جانے پر خوش کیوں نہ ہوا؟
دونوں ہاتھ دوپٹے کے اندر چھپائے قیام کی حالت میں کھڑی اس حور عین کو دیکھ کر وہ چونکا تھا نہ ٹھٹکا بلکہ وریشہ رضا کے چہرے پر ٹھہرے سکون نے اس کے اندر غصے کی آگ بھڑکا دی تھی۔
اب وہ سلام پھیر کر دعا مانگنے میں مصروف تھی۔
''ہونہہ! ساری ایکٹنگ ہے نیک پروین بننے کی۔'' جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹتے وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔
''ابھی آ کر میرے پیروں میں بیٹھ جائے گی گنوار کہیں کی...... اور منتیں کرتے گویا ہوگی......
''وہاج! مجھے معاف کر دیجیے...... پلیز زریاب ادا سائیں کی ضد کی سزا مجھے مت دیں۔'' تب میں بتاؤں گا اس کو اس کی اوقات......
''وریشہ تالپر! تمہاری اوقات یہ ہے کہ تم زندگی بھر میری ایک نگاہ غلط کے لیے ترسو گی۔'' آنکھیں موندے بیڈ پر چت لیٹا وہ حقارت سے سوچے چلا جا رہا تھا۔
ثابت ہوا لاشعوری طور پر ہی سہی۔ وہ اس لڑکی

کی آمد کا منتظر تھا۔ لیکن اصل حیرت کا جھٹکا تو اسے تب لگا تھا جب وہ جائے نماز تہہ کرتی اس کی جانب پلٹی تھی۔

اور پھر فقط ایک ساعت نظر اٹھا کر وہاج کی طرف دیکھنے کے بعد وریشے تالپر نے فوراً سے پیشتر اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ پھر رخ موڑ کر بڑے ہی وقار کے ساتھ چلتی وہ جا کر گلاس ونڈو کے آگے کھڑی ہوگئی تھی۔

مہندی سے سجے ہاتھ بڑھا کر اس نے کھڑکیوں پر گرے دبیز پردے ہٹائے تھے۔

آسمان کے فراخ سینے پر جگمگاتے تاروں کی روشنی گھنٹے بھر کے بعد صبح کے اجالوں میں کھونے والی تھی۔

"مجھے یقین ہے میرا رب میری زندگی میں پھیلی اس سیاہ شب کی دہلیز پر بھی صبح کا سورج ضرور جگمگائے گا۔ میں پرامید کیوں نہ ہوں کہ اس نے کبھی بھی میرا بھرم نہیں توڑا۔"

گھنیری پلکوں پر آنسوؤں کے چراغ جل اٹھے۔ یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ کے جگنو چمکے۔

وہ کھڑکی میں کھڑی سراپا دعا بن چکی تھی۔

اس بات سے بے خبر کہ جہازی سائز بیڈ پر لیٹا اس کا مجازی خدا اس کی اس درجہ بے نیازی کی وجہ سوچتے ہوئے کڑھ رہا تھا۔

"اوہ...... لگتا ہے، یہ میری زمی سے محبت والے انکشاف سے بے خبر ہے۔ یا پھر اسے لاعلم رکھا گیا ہے تب ہی تو اطمینان کا یہ عالم ہے۔

اور یہ تو شاید سمجھ رہی ہے کہ میں ابھی اٹھ کر اس کے نخرے اٹھاؤں گا۔ رات بھر کمرے میں نہیں آیا، اس بات پر اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گا۔ ہونہہ مائی فٹ......" آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہوئے بیڈ سے اٹھا تھا اور اس کے پاس آ کر دھیرے سے ہنس دیا۔

"چچ چچ...... مجھے بے حد ترس آ رہا ہے تم پر۔ تمہاری یہ ادائیں دیکھ کر...... شاید تمہیں بتایا گیا ہے کہ میں تمہاری محبت میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اگر واقعی تم ایسا بھی ہو تو میں تمہاری یہ خوش فہمی دور کردوں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی وہاج صاحب!" ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ کھڑکی کا پردہ چھوڑ کر اس کی طرف گھوم گئی۔

اور وہ جو اس کے منہ سے "وہاج جی...... وہاج مجھے معاف کردیں......" جیسے بے ربط جملے سننے کی توقع رکھتا تھا۔ وریشے کے لہجے کے ٹھہراؤ پر لحہ بھر کو ٹھٹک سا گیا۔

"تو پھر کیا سمجھتی ہو تم وریشہ صاحبہ؟" اگلے ہی پل وہ گہرے طنز سے مسکرایا۔

اور مسکائی تو وہ بھی تھی لیکن بے حد تحمل و تمکنت کے ساتھ۔

"میں جانتی ہوں مسٹر وہاج تالپر! کہ مجھے آپ کی زندگی میں زبردستی شامل کیا گیا ہے۔" اس نے آہستہ سے یاقوتی لبوں کو حرکت دی۔ "اور یہ بھی کہ اس شادی کے لیے آپ آمادہ نہیں تھے۔ فقط رواجوں کے فیصلوں نے آپ کو مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ بندھنے پر مجبور کردیا ہے اور مزید یہ کہ مجھے اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔"

"گڈ...... ویری گڈ۔" وہاج شاید اس سے اس درجہ دانش مندی کی امید نہیں رکھتا تھا۔

سو اس کی بات پر جیسے متاثر ہوتے گویا ہوا۔

"نائس...... اپنی باتوں سے کافی سمجھ دار لگتی ہو تم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ پڑھی لکھی بھی ہو۔ شاید سوکھن پور کے ہی اسکول سے فائیو کلاس تک پڑھ رکھا ہوگا تم نے۔ وہیں جس ٹیچر نے بھی تمہیں پڑھایا، اچھا پڑھایا۔"

وہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی، پھر آہستہ سے نظر جھکائے بولی۔

وہ کتابوں میں درج تھا ہی نہیں
جو سبق پڑھایا زندگی نے

میر وہاج ابراہیم اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

مگر دوسرے ہی پل اس کے لب ستائش کے

زیر اثر ملے تھے۔

"آہا۔ یہ بات اچھی کہی تم نے۔" اس نے تالی بجا کر وریشہ کی بات کو سراہا۔ "واقعی چاہے کوئی کتنا ہی پڑھا لکھا یا جاہل ہی کیوں نہ ہو، زندگی سب ہی کو ایک جیسا سبق پڑھاتی ہے اور یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اس کا پڑھایا ہوا سبق بہت سخت ہوتا ہے۔ آئی ایم اگری ود یو وریشہ رضا۔" لفظ "جاہل" کو کھینچ کر ادا کرتا وہ اس کی جانب دیکھ کر استہزائیہ مسکرایا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی پوری بات کو چھوڑ کر وہ بھی ایک اسی لفظ پر مسکرائی تھی۔ وہاج ابراہیم نہیں جانتا تھا، سامنے کھڑی لڑکی علم رکھتی۔ کہ لفظ "جاہل" کو کس کے لیے ادا کیا گیا تھا۔ وہ اس کی جھکی گھنیری پلکوں پر نگاہ ٹکائے حقارت کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"چچ چچ...... موہن پور کی جتی جس میں نظر اٹھا کر بات کرنے تک کا اعتماد نہیں ہے۔"

یہ وریشہ رضا کی ذات کا بھرم تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر وہ گریز کی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

اور اس کا مجازی خدا سوچتا تھا کہ اس میں نگاہ اٹھا کر بات کرنے کا اعتماد نہیں ہے۔

یاقوتی لب دانتوں تلے کچلتے اس نے گھنیری پلکیں اٹھا کر ایک بے حد زخمی نگاہ اس شخص پر ڈالی تھی۔ وہ جو اس کے شرمانے پر چوٹ کر کے ہنس دیا تھا۔ سیاہ بھنورا آنکھوں سے پھوٹتی روشنیوں نے اچانک اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ کو غائب کر دیا تھا۔ قدرے بے خودی میں درمیان کا فاصلہ پاٹتے ہوئے وہاج نے یکا یک اس کو دونوں شانوں سے تھام لیا۔

اس کی اس بے اختیارانہ حرکت پر وریشے تالپر کا دل سینے کے اندر ایسی شدت سے دھڑکا تھا کہ اسے لگا جیسے دل شہ رگ کے قریب آ کر اچھلا ہو۔ بے ساختہ اپنے خشک پڑتے لبوں پر زباں پھیرتی وہ ایک بار پھر سے نگاہیں جھکا گئی تھی۔

اور اس مرتبہ پیازی گالوں پر جھکی ان گھنیری پلکوں کا رقص وہاج تالپر کے لیے کسی دلچسپ تماشے کی صورت اختیار کر گیا۔

کسی ٹرانس میں گھرا وہ یہ تماشا ملاحظہ کرنے میں مصروف تھا جب اچانک اس کی جھکی پلکوں کی جگہ کسی کی سرمئی آنکھوں نے لے لی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس ٹرانس کی کیفیت سے نکلتے وہاج نے اپنا چہرہ دائیں طرف موڑا تھا۔ اور زمین پر تھوک دیا۔

وریشہ رضا ...... نفرت ہے مجھے تم سے اور تمہارے اس گھمنڈی بھائی سے......" انگارہ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے وہاج نے اسے اتنی زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا تھا کہ وہ شیشے کی قد آدم کھڑکی سے ٹکراتے ہوئے کراہ کر رہ گئی تھی۔

"وریشہ تالپر! یہ ہے تمہاری اوقات...... کہ اس دامن میں ایک نظر کی بھیک بھی نہیں ڈال سکتا میں۔" یہ بات کہتے وہ اتنی زور سے چلایا کہ وریشہ کو گمان ہوا جیسے یہ بات اس کو بتانے سے زیادہ خود کو باور کروا رہا ہو۔

وہ شخص بپھرے ہوئے سمندر کی طرح اس کے سامنے چیخ رہا تھا اور وہ تھی کہ کس درجہ سکون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کا رابطہ جو تھا اس بے نیاز ہستی سے کہ جو کرم کر کے یاد نہیں رکھتا تھا۔ وہ تسلی دیتا تھا اسے۔

اس وقت بھی تو وریشے وہاج کی "نظر کی بھیک نہ دینے" والی بات سن کر ہنس پڑی تھی۔ وہ شخص کون ہوتا تھا یہ عہد کرنے والا۔ اس کا فیصلہ تو آسمانوں پر ہوتا تھا۔

اس کو ہنستا دیکھ کر وہ ایسا بھڑکا کہ آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے نازک گال پر دے مارا۔

"تم کو جو یہ یقین ہے ناں ...... یو ایڈیٹ کہ میں ایک دن ان زلفوں کا اسیر ہو جاؤں گا۔ مرمٹوں گا تمہارے حسن پر...... تو تمہاری یہ خوش گمانی ابھی دور کیے دیتا ہوں۔" یہ کہنے کے ساتھ اس نے اپنے والٹ سے ایک تصویر نکال لی تھی۔

"دیکھو غور سے...... دیکھو لو...... اس تصویر کو وریشے تالپر...... کیونکہ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد ہی

تمہیں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ وہ تصویر ہے جو وہاج ابراہیم کے دل میں بستی ہے۔ میری بدقسمتی یہ ہے وریشہ رضا کہ اگر وہ تمہارا کمینہ بھائی درمیان میں نہ آیا ہوتا تو آج اس کمرے میں تمہاری جگہ زی بیٹھی ہوتی......" لہجے میں حسرتوں کا جہاں آباد کیے وہ بولا تھا۔

وریشہ کا دل چاہا وہ اتنی زور سے چیخے کہ سامنے کھڑے مرد کی سماعتیں سن پڑ جائیں لیکن "وا حسرت" کیسی بے بسی تھی کہ وہ فقط اک سسکی بھر کر رہ گئی تھی پر اس کا دل بے حد زور سے چیخا تھا۔

"صبر..... اے اللہ سائیں! صبر....." اس کا دل کیسا ساتھی تھا اس کا۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ فوراً اللہ کے سامنے بھکاری بن جاتا تھا۔

وریشہ کو اپنے دل پر پیار آ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے شریک حیات کے ہاتھ میں موجود زویا فاروق کی مسکراتی تصویر کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

دفعتاً کمرے کی خاموش فضاؤں میں وہاج کا بھرپور قہقہہ ابھرا۔

"تمہاری ان بجھتی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں موجود یہ تصویر تمہارے دل میں اتر گئی ہے۔"

"کیوں؟ آئی سے رائٹ؟" اس کی چہرے پر نگاہ جمائے وہ اس بار اور بھی محظوظ انداز میں ہنسا۔

"او گاڈ! کچھ تو سکون ملا اس دل کو اور زریاب رضا انا پرست وڈیرے..... آج مجھے معلوم ہوا، تمہاری بہن کی آنکھوں میں آنسو کتنے خوب صورت دکھتے ہیں۔" اپنے گھنے بالوں میں ایک ادا کے ساتھ ہاتھ پھیرتا وہ دلکشی سے مسکرایا تو...... وہ بس اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا واش روم کے دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

جلے ہیں دونوں کسی آگ میں تو روشن ہیں
اسے چراغ نہ سمجھو، مجھے دیا نہ کہو
بہت شدید ہے یہ دکھ، میں سہہ نہیں سکتا
وہ دوسرا ہے مگر اسے دوسرا نہ کہو

اس کے وہاں سے جانے کے بعد وریشے ٹالپر کی سسکیوں سے حجلہ عروسی کی دیواریں گونج اٹھی تھیں۔

☆☆☆

ایک ہی رات میں وہ اتنا روئی تھی کہ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

اچانک ذہن میں در آنے والے کسی خیال کے تحت اس نے ایک بھرپور نگاہ پورے کمرے پر دوڑائی۔ دراصل اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جسے فوری طور پر زریاب کے ہاتھ پر باندھا جا سکے کہ تیزی سے بہتا خون رک جائے۔

"مائی گڈنیس۔" اس کی دماغ میں روشنی سی لپکی، فوراً آگے بڑھ کر کاؤچ کے قریب رکھا اپنا اٹیچی کیس کھول لیا اور اپنے ایک بہت قیمتی سوٹ کا دوپٹا نکال کر دانتوں سے کٹ لگاتے ہوئے درمیان سے پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ پھر دوپٹے کا ایک حصہ اٹھائے وہ اس کے پاس آ گئی تھی۔

"سنیے۔" اس نے قریب آ کر پکارا۔ "اسے اپنی کلائی پر باندھ لیجیے۔ خون بہنا رک جائے گا۔" لجاجت بھرے الفاظ میں وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

مجبوراً کچھ سوچتی خود ہی آگے بڑھی اور اس کی کلائی تھام کر اس پر کپڑا باندھنے لگی۔ جب نفرت سے اس نے اٹھ کر اس کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔

"اپنی حد میں رہو زویا ٹالپر! دوبارہ میرے قریب آنے کی کوشش بھی مت کرنا۔" نہایت حقارت برساتے لہجے میں کہتا وہ اس کی روح تک کو سلگا گیا۔

وہ کون سا اس کے قریب جانے کے لیے مر رہی تھی، اس کو تو خود اس شخص کی قربت سے وحشت تھی مگر اس وقت تو وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی کے آگے بے بس تھی کہ اسے یوں مرتا ہوا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

☆☆

ہاجرہ ریحان

شوق دیکھ انتظار دیکھ

مجھے اس کے آنے کی اطلاع تو کوئی آدھا گھنٹے پہلے ہی مل چکی تھی مگر مجھے اس سے ملنے کی کوئی جلدی نہیں تھی، حالانکہ اس سے مل کر ہمیشہ اچھا ہی لگتا تھا۔ وہ جس تعظیم وانکساری سے ملتا تھا۔ آج کل کے نوجوان تو اس تہذیب وروایت سے واقف ہی نہیں..... میرے مرحوم بھیا جی جاتے جاتے اپنے بچوں کو کوئی دنیاوی دولت تو نہ دے سکے مگر ہاں اچھے اخلاق اور رکھ رکھاؤ سے ضرور متعارف کرا گئے۔

بھائی کی بیوی کا انڈیا کے ایک لکھنوی نواب خاندان سے تعلق تھا۔ بھیا جی کے تمام بچوں کی طبیعت میں بھی کہیں کہیں اپنے ننھیالی جاہ وجلال کی جھلک ضرور نظر آتی تھی مگر ہمارا خاندان بھی تو کچھ کم نہیں۔

میں نے جلدی سے توجہ اپنے خاندانی وقار وانگاز پر مرکوز کرلی۔

ایک کے بعد ایک خاندان کے تمام بڑے معتبر ناموں کو گن چکنے کے بعد پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھا میرا انتظار کررہا ہے، ہمیشہ کی طرح اس نے صرف پانی مانگا ہوگا اور آدھا گلاس پی کر واپس کردیا ہوگا۔ ایک تو کچھ کھاتا بھی نہیں۔ ہونہہ جیسے میرے گھر کے باورچی خانے میں ایسا کچھ اس کے شایان شان بنتا نہیں کہ اس کی بھوک کھل سکے، جیسے اس کے اپنے گھر میں تو بس من وسلویٰ ہی ملتا ہو۔

کتنی ہی بار اس کو ٹوکا بھی کہ سگی پھوپھی ہوں جب ہر ماہ باقاعدگی سے ملنے آہی جاتے ہو تو کچھ کھا پی بھی لیا کرو، حالانکہ پہلے جب وہ اپنے دونوں چھوٹے بھائی اور بہن کو ساتھ لاتا تھا تو اس قدر تکلف سے پیش نہ آتا تھا، بلکہ میرے شوہر صاحب تو تینوں بچوں کے آنے پر باورچی خانے میں جاکر خود بہت اہتمام کا کھانا بنانے کے احکامات صادر کرتے تھے۔

اب پچھلے کئی مہینوں سے وہ اکیلا ہی آنے لگا تھا اور پھر آنے کا وقت ہمیشہ ایسا ہی ہوتا کہ جس میں چائے ہی پیش کی جاسکتی ہو مگر وہ تو چائے، کافی یا عصرانہ کے ناشتے کو بھی صاف انکار کردیتا۔ اگر کبھی زبردستی میں نے منگوایا بھی تو اس نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔

بس ایسا ہی اکھڑ اور ضدی تھا۔

بچپن سے ہی ایسا تھا بقول میرے شوہر صاحب "بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔"

شوہر صاحب کہنے کو کہہ دیتے مگر میرے دل پر لگ جاتی..... جانتے بھی ہیں کہ ان کے منہ سے اپنی بھابی کی تعریف سن کر، میرا کلیجہ جل جاتا ہے مگر مجال ہے جو تعریف سے کبھی چوکے ہوں۔

اکثر میں خود پر غور کرتی بھلا اپنے لاڈلے بھیا جی کی بیوی سے مجھے کبھی بھی کیا پرخاش ہوسکتی تھی۔ وہ اچھی شکل وصورت کی تھیں۔ مرحوم بھیا کے لیے میرے والدین نے بہت دل سے ان کو بیاہ کر بھیا جی کی زندگی میں شامل کیا تھا اور شادی کے فوراً بعد ہی انہوں نے ہم سب کو دل وجان سے اپنا بھی لیا تھا۔

میرے مرحوم والدین کی بہت خدمت کی تھی۔ میری شادی پر انہوں نے بھیا جی کی محدود آمدنی کے باوجود، ہر طرح سے اپنا فرض نبھایا تھا میرے والدین آخری وقت تک اپنی بہو کی تعریف کرتے دنیا سے

سدھارے ..... رشتے داروں میں بھی ان کی بڑی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی دھوم تھی۔ بھیاجی دنیادار آدمی نہیں تھے لہٰذا ساری عمر کسمپرسی سے ہی گزارا ہوا پھر بھی بھابی نے کبھی شکایت نہیں کی۔ اپنی خاندانی دولت کے ڈھول نہیں پیٹے۔ بلکہ محدود وسائل میں بھی دونوں بڑے لڑکوں اور چھوٹی لڑکی کو اچھی دنیاوی اور بہترین دینی تعلیم دلائی تھی۔

بھیاجی کا انتقال ہوئے کئی سال گزر چکے تھے وہ اکیلے ہی حالات کا مقابلہ کرتی رہیں۔ کبھی ہم میں سے کسی نے مدد کرنے کا اشارہ بھی کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ان کی انتھک محنت ومشقت سے پورا خاندان واقف تھا، لہٰذا بیٹی کی پچھلے سال شادی کی تو ایک بار پھر ان کی تعریف کے ہر جگہ چرچے ہونے لگے۔ بیٹی اپنے شوہر کے ہمراہ چھ ماہ بعد ہی امریکہ چلی گئی تھی اس کے بعد سننے میں آیا تھا کہ بھابی اب بیمار رہنے لگی ہیں۔

میں تو شادی میں ہی بڑی مشکلوں سے دنیا دکھاوے کے لیے شریک ہوئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ شوہر صاحب ایک میٹنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ خود ہی کوئی بہانہ بنا کر چلے گئے تھے تا کہ میں اطمینان سے اپنی یتیم بھتیجی کی شادی میں جا سکوں۔ ٹھیک بات ہے، وہ ہوتے تو ان کے ساتھ کسی بھی ایسی محفل میں شرکت کرنا جہاں بھابی بھی موجود ہوں، میں نے کئی سالوں سے ترک کر رکھا تھا۔

کہنے کو شوہر صاحب نے کئی بار مجھے یقین دلایا تھا کہ میں جو اپنی بھابی اور شوہر صاحب کے بارے میں گمان رکھتی ہوں، وہ بالکل غلط ہے اور جو بات تھی بھی تو وہ صرف اتنی سی تھی کہ بھابی اور شوہر صاحب ایک ہی یونی ورسٹی کے ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتے تھے تعلیم کے بعد شوہر صاحب کی طرف سے بھابی کے ہاں رشتہ بھیجا گیا تھا مگر بات نہیں بنی...... بس۔

پھر بھابی کی شادی بھیا جی سے ہو گئی اور اس کے چند سالوں بعد شوہر صاحب کے گھر والوں کو میں پسند آ گئی...... مگر اتنی سی بات ہوتی تو یوں مجھے شوہر صاحب کی پرانی کتب میں سے بھابی کی جوانی کی تصاویر نہ ملتیں۔ ایسی صورت حال میں، میں کیا سوچوں...... عورت ہوں ناں...... شک ایسا ہی روگ ہے ایک بار لگ جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتا......

شادی کے چند شروع کے سال، شوہر صاحب کا مجھ سے الگ تھلگ رہنا اور بھابی کا ہمارے گھر آنے یا ہمیں اپنے گھر بلانے سے کترانا۔

جیسے ہی مجھے دونوں کے ماضی کا معلوم ہوا تمام ہی مہرے ایک کے بعد ایک، اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے...... دوسری طرف شاید بھابی نے بھیا جی کو اعتماد میں لے کر تمام احوال بتا دیے تھے تب ہی بھیا جی ہر سال، ہر تہوار پر میرے گھر آتے مگر بھابی ساتھ نہ ہوتیں...... مگر میں اپنے اندر یہ تحمل و برداشت پیدا نہ کر سکی۔ بچے بڑے ہوتے گئے تو بھیا جی کے ساتھ آنے لگے...... پھر بھیا جی کا انتقال ہو گیا اور مجھے ایک طرح کے انجانے خوف نے گھیر لیا، حالانکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ نہ تو شوہر صاحب ہی اس قدر جذباتی ہیں اور بھابی کے لیے تو ایسا کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا مگر پھر بھی...... عورت ہوں ناں...... بس دل پر شک کا بال پڑ گیا تھا جو نکالے نہیں نکل رہا تھا۔

بھیا جی کے انتقال کے بعد سے یہ معمول تھا کہ بھیا جی کے بچے مجھ سے میرے گھر پر ملنے آ جاتے تھے...... مجھے یہ بات بھی نہ بھاتی کہ شوہر صاحب، بھیا جی کے تینوں بچوں سے بہت شفقت و محبت سے ملیں مگر برداشت کرتی...... اکثر رات کو دیر تک جاگتی اور سوچتی جاتی......

”کیا بات ہے شوہر صاحب کو بھیا جی کے سب سے بڑے لڑکے سے زیادہ انسیت لگتی ہے؟“

”اس کی شکل و صورت، چلنے بولنے اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز بالکل بھابی جیسا جو ہے۔“

کوئی تیز آواز میرے کانوں میں زہر بن کر اترتی جاتی...... اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا...... مگر میں اس وقت پرانی باتوں کو دہرانے کیوں بیٹھ گئی ہوں، مجھے جلد از جلد نیچے جا کر اسے بتا دینا چاہیے۔ مگر پتا نہیں کیا بات ہے آج میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس سے ملوں، کیوں لگ رہا ہے جیسے آج میں اس سے ملوں گی تو پھر میں، میں نہیں رہ سکوں گی کچھ اور ہو جاؤں گی۔ میری اکلوتی بیٹی امبرین کی منگنی کے سلسلے میں سجے سنورے ہمارے بڑے سے ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا وہ کیا کیا نہ سوچ رہا ہوگا۔ اس کے دل پر یقیناً شکست کی اداسی طاری ہوگی اور اطوار میں مجھ سے ملنے کی بے چینی صاف محسوس ہو رہی ہوگی۔

اور میں اس کو اسی طرح اکیلے بیٹھے رہنے دینا چاہتی تھی جتنی دیر سے میں اس سے ملوں گی۔ اتنا ہی اسے یقین ہوتا جائے گا کہ میرا فیصلہ، اس کے حق میں بدل نہیں سکتا...... یہ بھی عجیب تماشا رونما ہوا تھا کہ اچانک ہی مجھے اس احساس ہوا کہ جب بھی بھیا جی

کے تینوں بچے، ہم سے ملنے آتے تو امبرین اپنی تمام ترمصروفیت کو چھوڑ کر ان سب کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتی...... اور پھر کچھ اس انداز میں وہ سب آپس میں باتیں کرتے کہ دیکھنے والے کو لگے جیسے کوئی بہت ہی اہم اور گمبھیر موضوع پر غور وفکر کر رہے ہیں مگر پھر اچانک چاروں زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ اس وقت وہ سب بالکل ایک جیسے ہی لگتے۔ ایک دوسرے میں جڑے ہوئے، ایک دوسرے کی ہو بہو شکل لیے اور میں چاہ کر بھی ان کے باہمی اتفاق میں دراڑ نہیں ڈال سکی تھی۔

آخر وہ تینوں امبرین کے سگے ماموں زاد تھے اسے ان سب سے انسیت ہونی بھی چاہیے تھی۔

جبکہ امبرین گھر میں اکلوتی ہونے کے باعث بھائی بہن کے رشتے کو بھی ترستی تھی۔

مگر شاید اس سب میں اصل کردار شوہر صاحب کا تھا کہ وہ خاص طور پر امبرین کو ان تینوں کے آنے پر اطلاع بھجواتے تھے، جانے کیوں شوہر صاحب کے دل میں کیا تھا اور جب انہوں نے امبرین کے لیے بھیا جی کے بڑے بیٹے کی بات مجھ سے چھیڑی تو شاید صدیوں سے، میرے دل میں بنتا کڑھتا ابلتا لاوا اچانک پھٹ پڑا۔

مجھے مکمل طور پر یقین ہو گیا کہ اتنے سالوں تک شوہر صاحب نے مجھے صرف دنیا کو دکھانے کے لیے بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے، دراصل محبت وہ کسی اور سے ہی کرتے رہے ہیں۔ اب اپنی اکلوتی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ کر وہ اپنی محبت، وفاداری اور خلوص کا ثبوت ہی تو دینا چاہتے ہیں، ورنہ کون باپ ہو گا جو اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی، بھیا جی کے غریب خاندان میں کرنا چاہے گا۔

میں نے شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں جو اب تک شوہر صاحب کے سامنے اونچی آواز میں بات تک نہ کرتی تھی اس دن، ان کو بے نقط سناتی چلی گئی۔ ان کو دھوکا باز، مکار اور بے وفا، ہر قسم کے القاب سے نوازا اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے

نظریں نیچی کیے اپنی جگہ پر جمے کھڑے رہے اور بولے بھی تو صرف اتنا کہ "بھابھی کے لڑکوں کو ان کی ماں نے عورتوں کی عزت کرنا سکھایا ہے اور کسی بھی رشتے کی مضبوطی، صرف عزت کے بل بوتے پر رکھی جاتی ہے۔"

مگر میں نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور پھر اس واقعے کے بعد سے میں نے زور وشور سے امبرین کے لیے رشتے ڈھونڈنا شروع کر دیے، گو کئی بار میں نے دوسروں کو اور خود کو دھوکا دینے کے لیے بھیا جی کی غربت کا امبرین کا سسرال نہ بنانے کی وجہ ٹھہرائی، مگر جب میں اکیلے بیٹھ کر اس پر سوچتی تو ایک الگ طرح کے احساس جرم کا شکار ہو جاتی۔

غلطی میری ہی تھی مجھے شروع سے ہی امبرین کو ان تینوں میں گھلنے ملنے سے روک دینا چاہیے تھا مگر زیادہ دکھ مجھے اس بات پر تھا کہ امبرین نے اپنی خواہش مجھے بتانے کے بجائے باپ سے بانٹی تھی۔

میری نظر سوچتے سوچتے ایک بار پھر گھڑی پر چلی گئی۔ اسے بیٹھے میرا انتظار کرتے اب شاید دو گھنٹے ہونے کو آئے ہیں۔ میں جھنجلا گئی آخر واپس لوٹ کیوں نہیں جاتا یہ..... کیوں میرے منہ سے انکار سننے کے لیے چلا آیا ہے..... یہ تو میرے سگے لاڈلے مرحوم بھیا جی کا بیٹا۔ کیسے کر سکوں گی میں اس کے سامنے اعتراف کہ امبرین کی خواہش جان کر بھی میں ان دونوں کی امید کو پورا نہیں کرنا چاہتی۔

اس نے اپنے مرحوم باپ کا واسطہ دے دیا، دھڑلے سے امبرین سے اپنی محبت وانسیت کا واسطہ دے دیا یا پھر امبرین کی باقاعدہ پسندیدگی کے اظہار کا واسطہ دے دیا تو۔ میں تو مجبور ہو جاؤں گی، اس قدر کھلم کھلا میں دونوں کی جوان اور سر پھری محبت سے صرف نظر کر بھی کہاں سکتی ہوں، میں اس قدر مضبوط نہیں ہوں۔

مگر پھر فوراً مجھے احساس ہوا کہ بھابی، بھیا جی نے بچوں کو دنیا دار نہیں بنایا۔ ہمارے دور میں تو بے نیازی ایک اچھا خاصا فیشن تھا۔ ہمارے بڑے ایسے

نوجوانوں سے بہت متاثر ہوتے تھے جو دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھتے تھے، مگر آج کل کے دور میں اس طرح دنیا سے بے نیاز نوجوانوں کی زندگی ویسے ہی بہت مشکل ہوتی ہے۔

آج کل بے نیاز انسانوں کو بزدل، ناکارہ اور ناکام تصور کیا جاتا ہے، پھر انسان کے اندر بغاوت کا جذبہ بھی ضرور ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی پسند، اپنی چاہ کو حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت تو جدوجہد دکھائے تھوڑا تو لڑ سکے؟

یہ کیا کہ محبت کر لی بس... باقی جو لوگوں کی مرضی .... نہیں بھئی محبت کی ہے تو ہمت بھی پیدا کرو... اظہار کی ہمت اور پھر زمانے کے انکار کے آگے ڈٹ جانے کا عزم بھی برملا کرو.... تب ہی تو لوگوں کو تمہارے سچے دل ہونے کا معلوم چلے گا ورنہ زندگی بھر جلتے کڑھتے گزر جاتی ہے، صبر کرنا بھی تو آسان نہیں.... تف ہے شوہر صاحب پر.... ارے بھابی کے گھر والے نہیں مانتے تھے تو اور کوشش کرتے یہاں تک کہ ان کو ماننا ہی پڑتا.... ایک ہی انکار پر گھر بیٹھ گئے؟ واہ بھئی اچھی محبت کی تھی ان دونوں نے۔

توبہ ہے.... جانے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ یہ میرا بڑا بھتیجا، بھابی کی تربیت نہ لیتا تو اچھا تھا... تھوڑی بدتمیزی کر لیتا میرے سامنے تھوڑا اکڑ کر بہت مان اور دھڑلے سے کہہ دیتا کہ اسے امبرین سے محبت ہے اور میں امبرین کو کسی اور کا نہیں کر سکتی۔

پھر میں دکھاوے کا غصہ کرتی اسے برا بھلا کہتی مگر دل میں مجھے کس قدر فخر ہوتا۔ اپنی بچی کی قسمت پر رشک کرنے لگتی کہ میری بچی کو حاصل کرنے کے لیے کوئی زمانے بھر سے ٹکرانے کے لیے تیار ہے، بزدلی سے منہ چھپائے نہیں بلکہ میرے سامنے سینہ سپر ہو کر اس نے مجھ سے امبرین کا ہاتھ مانگا ہے۔

مگر افسوس یہ بھیا جی کا بیٹا لاکھ اچھا ہوا مگر جگر والا نہ ہوا۔ اب بے کار میں آیا بیٹھا ہے میرے ہاں کس طرح اس مصیبت سے جان چھڑاؤں؟ بس بیٹھے رہنے دو اسے اکیلے سجے سنورے ڈرائنگ روم میں۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، ڈرائنگ روم میں منگنی پر بلائے گئے مہمان پہنچنے لگیں گے تو خود ہی شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا۔ دنیا سے بے نیاز جو ہوا۔

ایک خیال ذہن سے گزرا اور میں بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی دیر سے میرا انتظار کر کے بھی ڈرائنگ روم میں چپکا بیٹھا ہے۔ ایسا کبھی پہلے تو نہیں ہوا جبکہ وہ آج کی ہونے والی تقریب سے بھی بخوبی واقف تھا۔ آخر کیا بات ہے جو وہ اس طرح اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا کہیں اس میں بھی شوہر صاحب کی کوئی چال تو نہیں؟ میں سوچتے سوچتے کمرے کے باہر داخلی دروازے کے عین سامنے کھلنے والی کھڑکی کی طرف چلی گئی۔

مجھے ابھی ابھی خیال آیا تھا کہ امبرین تو میری ہی طرح بے انتہا ضدی ہے ہلکی پھلکی ڈانٹ پر دوپہر سے بیوٹی پارلر آج کی تقریب کے لیے تیار ہونے گئی ہے اور اب شاید اس کی آمد کا ہی وقت ہو چلا تھا مگر زیادہ پریشان کن بات یہ تھی جو مجھے ابھی ہی یاد آئی تھی......

امبرین کے ہونے والے منگیتر جواد نے جو کہ میری دیرینہ دوست کا اکلوتا بیٹا تھا مجھ سے اجازت لے کر امبرین کو بیوٹی پارلر سے گھر تک لانے کا کہا تھا۔ وہ امبرین سے منگنی کرنے سے پہلے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا تھا اور مجھے اس خواہش میں سادگی و معصومیت ہی محسوس ہوئی تھی۔ لہٰذا اب یقیناً وہ دونوں ساتھ ہی آنے والے تھے اور اگر جواد، امبرین کو چھوڑنے گھر کے اندر تک آ گیا تو ظاہر ہے ڈرائنگ روم میں، تینوں کی آپس میں مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ شک کس قدر جان لیوا ہوتا ہے۔ بس یہ اپنے ہم سفر کسی کے ساتھ بھی دیکھ کر معمولی سے قدم اٹھاتے ہوئے، اچانک کھٹکنے، سانس

روک لینے یا پھر نظروں کے چرانے سے ہی دوسرے ساتھی کے دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور ساری عمر جلتے کڑھتے راتوں کو جاگتے گزر جاتی ہے۔

امبرین خدا جانے! اپنے منگیتر کے سامنے اسے دیکھ کر خود کو کیسے سنبھال پائے گی۔ مجھے اپنی بیٹی پر جہاں اعتماد تھا اس سے زیادہ بھابھی کی تربیت پر بھروسا تھا، پھر بھی جوان خون ہے نا چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا اشارہ یا بے ضرر جملہ، جواد کو چونکا سکتا ہے۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی اسے اتنی دیر ڈرائنگ روم میں اپنے انتظار میں بٹھائے رکھنے کے بجائے فوراً ہی روانہ کر دینا چاہیے تھا۔

میں غیر ارادی طور پر کھڑکی کا پردہ ہلکا سا سرکا کر باہر دیکھنے لگی..... دو چار مزدور، شوہر صاحب کی ہدایت پر کام کاج میں جتے ہوئے تھے۔ باغ میں تینوں درختوں کو قمقموں سے سجایا جا رہا تھا، کرسیاں ترتیب سے رکھی گول میزوں کے گرد جمائی جا رہی تھیں..... خوب صورت رنگ برنگے صاف ستھرے میز پوشوں نے ہری گھاس پر بہت ہی پروقار مگر شوخ تقریب کا سا سماں باندھ رکھا تھا، جو دل کو خوشی سے لبریز کرنے کو کافی تھا مگر میرے دل میں تو ایک خیال آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ ابھی معاملات کو سنبھالنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ داخلی دروازے سے ایک اجنبی گاڑی اندر آتی دکھائی دی۔

"اوہو امبرین آخر کار پہنچ ہی گئی اب کیا ہوگا..... اللہ تعالیٰ میرے بچے اپنے اس امتحان میں کامیاب رہیں..... ان کو زندگی بھر کی برداشت، کمر توڑ جلن حسد سے بچالے میرے مالک....."

میں بے اختیار کھڑکی سے لگ کر دعائیں کرنے لگی..... اور یہ جانے بغیر کہ میں انجانے میں کیا مانگ رہی ہوں بس مانگے ہی چلی گئی۔

گاڑی کے رکنے پر شوہر صاحب تیزی سے باغ سے گزر کر، پھولوں کی کیاریوں کو پھلانگتے آگے بڑھے اور دوسری طرف سے جواد بھی تیزی سے باہر نکلا۔ شوہر صاحب کو دیکھ کر وہ آگے بڑھ کر سلام دعا کرنے اور دوسری طرف سے امبرین بھی اپنا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

تینوں نے ایک گھیرا سا بنالیا اور بہت ہی گمبھیر انداز میں، ایک دوسرے سے بات کرنے لگے ان سب کے چہروں پر سنجیدگی دور سے ہی نظر آ رہی تھی چند ہی منٹوں بعد جواد گاڑی میں بیٹھنے کے لیے واپس مڑا مگر مڑتے ہوئے اس نے ایک اداس، گہری مسکراہٹ کے ساتھ امبرین کو کچھ کہا اور پھر تیزی سے گاڑی نکال لے گیا۔ جواد کے جاتے ہی شوہر صاحب نے بہت پیار سے امبرین کو سینے سے لگالیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک الگ طرح کی بے چینی الگ طرح کی دوڑ بھاگ نوکروں میں شروع ہو چکی تھی۔ انتظامات کے ردوبدل کے لیے شوہر صاحب بہت زور و شور سے ہدایت دیتے سنائی دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بلاوے پر بلاوے بھیجے جا رہے تھے۔ جیسے وہ میرے سامنے کوئی اعلان کرنے کے لیے مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھے مگر میں، بہت اطمینان و سکون سے کمرے میں دبکی بیٹھی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ مجھے کیا بتانا چاہ رہے ہیں۔

ابھی بس کچھ ہی پل تو ہیں جب مجھے اپنی خوشی منانے کا موقع مل گیا تھا۔ اصل میں تو میں بھی دل سے امبرین کے لیے ایسا ہی کچھ چاہتی تھی مگر جب میں شوہر صاحب کے سامنے جاؤں گی تو ہمیشہ کی طرح مجھے ان کے فیصلے پر بے حد غصہ، بے حد نفرت کا اظہار کرنا تھا..... کو میرا دیرینہ شوق پورا ہو گیا تھا۔ میرا صدیوں کا انتظار آخر ختم ہو چکا تھا۔

☆☆

تعیمہ ناز

زندگی اور کہانی

چہرے پہ تازہ تازہ شیو کی نیلاہٹ میں اس کا گورا رنگ چمک رہا تھا۔ رودین نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اچانک ہی سماعتوں میں ایک آواز گونجی، نزویا ابراہیم کی آواز۔

"رودین! اگر تم سانولے یا کالے ہوتے تو بڑا اچھا ہوتا۔"

"ہیں... وہ کیوں؟" رودین سمیت بقیہ حاضرین نے بھی اسے حیرت سے دیکھا تھا، جوابی کھنکتی ہوئی آواز میں بقول رودین کے اکثر چبھتی ہوئی بات کر جاتی تھی۔

"لڑکوں کا گورا رنگ اچھا نہیں لگتا نا! لڑکی لڑکی سے لگتے ہیں۔"

"اف ف.....!" رودین کی تیوریاں چڑھ گئیں اور ساتھیوں کا قہقہہ لڑکیوں کی کھی کھی کے درمیان بڑا بلند تھا۔

"تمہیں اسکالرشپ کے لیے افریقہ کی کسی یونیورسٹی میں اپلائی کرنا چاہیے۔ وہاں سانولے اور کالے سے لے کر جٹ بلیک تک اس کلر کا ہر شیڈ ملے گا۔" رودین نے بڑے چبا چبا کر ایک ایک لفظ کہا

تھا۔

"اوہ، تمہیں شاید برا لگ گیا، اچھا، سوسوری، آئی ایم رئیلی سوری۔"

"نہ جانے وہ معصوم زیادہ تھی یا ذہین۔"

رودین کبھی الجھ جاتا تھا مگر بس ایک پل کو الجھتا اور اگلے ہی پل فراموش کر دیتا۔ اس سے زیادہ نہ وہ زویا ابراہیم کو اہمیت دیتا تھا، نہ ہی اس کے بارے میں سوال و جواب کے تردد میں پڑتا تھا۔ کلاس میٹ تھی کوئی محبوبہ تھوڑی تھی۔

"صاحب! ناشتا تیار ہے۔" شریف نے کمرے میں جھانکا۔

"ہاں ہاں، ٹیبل لگاؤ، میں آ رہا ہوں۔" رودین آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے وہ پھر عجیب سی بے چینی کا شکار ہوا۔

"ممی کہاں ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ تو جی صبح کی فلائیٹ تھی نا ان کی، سویرے ہی نکل گئیں ایئرپورٹ کے لیے۔" شریف نے اطلاع دی۔

"صبح گران کی فلائیٹ تو چھ بجے کی تھی نا!"

"جی، صبح کے چھ بجے، اب تک تو ان کا ہوائی جہاز دبئی پہنچ گیا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔"

"اچھا!" رودین کے چہرے پہ مایوسی چھا گئی۔

کچھ دیر وہ یونہی توس اور انڈے سے شغل کرتا رہا، پھر پلیٹ میں آدھا ناشتا چھوڑ دیا۔

مگ میں چائے نکال کر اس نے گرم ہی لبوں سے لگالی۔ منہ سے لے کر حلق کے نیچے تک کرچھیال جلاتا ہوا اندر چلا گیا۔

بے دلی سے اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر سے نکل آیا راستے میں تھا کہ ممی کی کال آ گئی۔

"رودین! میں دبئی پہنچ گئی ہوں۔ تم یونی کے لیے نکلے؟"

"جی، میں راستے میں ہوں۔"

"گڈ، اپنی اسٹڈیز پہ فوکس رکھنا لاسٹ سمسٹر والا رزلٹ نہ ہو، اپنا جی پی اے امپروو کرو۔" ممی کی نصیحتیں شروع ہو گئیں اور اپنے مزاج و عادت کے مطابق وہ جی بھر کے بے زار ہونے لگا۔

"آپ نے ناشتہ کیا؟" رودین نے سوال کیا۔

"ہاں، فلائیٹ میں کافی لی تھی میں نے۔"

"کافی نہیں ممی! پراپر ناشتا" وہ جھنجلایا۔

"میں ابھی کچھ لے لوں گی رودین! کیوں پریشان ہو رہے ہو میں بچی نہیں ہوں۔"

"میں تو ہوں۔"

"کب تک بچے بنے رہو گے؟ بڑے ہو گئے ہو۔ بی ہیولائک ایڈلٹس۔" ممی نے پھر دو چار نصیحتیں کر کے فون بند کر دیا۔

یونی ورسٹی میں آج کا دن بھی پچھلے دنوں سے مختلف نہ تھا۔ سر ہاشم کے جاتے کے بعد رودین نے ایک انگڑائی لی۔ اپنے ہاتھ پیر سیدھے کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں چل دیے۔" ہمایوں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔

"کینٹین جا رہا ہوں اب کلاس نہیں لوں گا۔"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں گویا ہوا۔

"ابے مرضی کیوں چبا رہا ہے؟"

رودین نے کوئی جواب دیے بغیر بیگ گلے میں لٹکایا اور باہر نکل گیا۔

"شہزادے کیا ہو گیا، کچھ تو بتا۔" ہمایوں اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔

رودین کینٹین پہنچا اور متلاشی نگاہوں سے خالی سیٹ دیکھنے لگا جو ندارد تھی۔ سامنے والی ٹیبل پر کافی ہجوم تھا۔ جتنے اسٹوڈنٹس سیٹوں پر بیٹھے تھے، اتنے ہی وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ ہلا گلا، شور شرابا، ہنگامہ، پھر یکا یک اس رش نے بلند آواز میں 'ہیپی برتھ ڈے ٹو یو' گانا شروع کر دیا۔

"افوہ، کوئی اور جگہ نہ ملی۔ سالگرہ مناتے کے لیے۔" وہ بھنا کر واپسی کے لیے پلٹا اور ہمایوں سے ٹکرا گیا۔

"کیا ٹکریں مارتا پھر رہا ہے یار!" ہمایوں نے اپنا ماتھا سہلایا۔

رودین نے ایک خشک سا سوری کہا اور چل پڑا۔

"بات سن، کیوں انیس سو ستر کی ہیروئین کی طرح نخرے دکھا رہا ہے؟ کچھ بتائے گا بھی کہ کیا بات ہے؟" ہمایوں اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔

"ضروری ہے ہر بات تجھے بتانا؟" رودین کا منہ اور پھول گیا۔

"بالکل ضروری ہے۔ ہمارا اگریمنٹ ہوا تھا تو مجھے ہر بات بتانے کا پابند ہے ورنہ میں کورٹ سے رجوع کروں گا۔"

ہمایوں کی الٹی سیدھی ہانکنے پر بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہیں آئی۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔" ہمایوں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"کیوں؟"

"امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے چیک اپ کے لیے بلایا ہے۔"

"اچھا؟" رودین نے سر ہلایا۔

"ہمیں اسٹاپ تک چھوڑ دو گے؟ میری بائیک خراب ہے مکینک کے پاس ہے، صبح تو پاپا نے ڈراپ کر دیا تھا۔"

"ہاں، چھوڑ دوں گا جہاں جانا ہے۔ اتنی وضاحتیں کیوں کر رہا ہے۔" رودین ابھی تک چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"ایک منٹ میں ذرا زویا کو بلا لوں۔" ہمایوں موبائل آن کرنے لگا۔

"میں گاڑی نکال رہا ہوں۔ آجا۔" رودین کوئی توجہ دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

بے دلی کے ساتھ لب بھینچے وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہمایوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اپنے موبائل میں مگن تھا۔ رودین کو مزید مخاطب کرنے سے اس نے گریز کیا۔ اس کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ جب بھی اس پر اس طرح کے چڑچڑے پن کا دورہ اٹھتا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا۔

پیچھے بیٹھی زویا نے سامنے لگے مرر میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"راستے میں کسی بیکری پہ روک دینا، مجھے کیک لینا ہے۔"

"تمہیں بھی کیک لینا ہے! آج کیا ساری دنیا کی سالگرہ ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

"بس یہی سمجھ لو، میرے لیے تو وہ ساری دنیا ہیں۔ جن کی آج سالگرہ ہے۔" زویا مسکرائی۔

رودین نے کوئی جواب دیا نہ تبصرہ کیا۔ کسی سے بھی بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا نہ مسکرانے کو ہاں مگر اس نے یہ مہربانی ضرور کی کہ دونوں کو گھر تک چھوڑنے کے لیے ڈرائیو کرتا رہا۔

راستے میں زویا نے بیکری سے کیک اور کچھ دیگر سامان خریدا ساتھ میں ایک پانی کی بوتل بھی لی۔

"پیاسے ہو۔" اس نے پانی کی بوتل رودین کی طرف بڑھائی۔

"مگر مجھے تو پیاس نہیں ہے، نہ ہی میں نے منگوایا۔" رودین ابھی تک اکڑا ہوا تھا۔

"مجھے معلوم ہے، نہ تمہیں پیاس لگی ہے، نہ ہی تم نے پانی کی فرمائش کی، مگر میں لے آئی ہوں اس لیے پی لو۔"

رودین نے اسے گھور کے دیکھا اور بوتل تھام لی۔ دو چار گھونٹ پی کر اس نے بوتل ڈیش بورڈ پہ رکھ دی۔

"اب تمہارا غصہ کچھ کم ہو جائے گا۔" زویا نے اطمینان سے پیشن گوئی کی۔

"غصہ نہیں ہے یار! بس یونہی اکتاہٹ ہے، بے زاری ہے پتا نہیں کیا ہے؟" رودین نے سر جھٹکا۔

"ہر تھوڑے دنوں بعد تو ہر چیز سے بے زار ہو جاتا ہے۔ جھنجھلانے لگتا ہے چڑچڑا ہو جاتا ہے، آخر مسئلہ کیا ہے تیرے ساتھ؟" ہمایوں نے موبائل سے نظریں ہٹا کر رودین پر جمائیں۔

"سب کچھ میسر ہونا بھی ایک مسئلہ ہے۔ کسی کمی کا نہ ہونا بھی زندگی میں بڑا خلا پیدا کر دیتا ہے۔" زویا

نے فلسفہ بیان کیا۔ اور رودین کی گھوری کا سامنا کیا۔
"تمہیں بڑا معلوم ہے کہ مجھے کیا میسر ہے کیا نہیں؟"
"نہیں کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ سب کچھ ہے۔ اور سب ہونا بھی ایک مشکل بن جاتی ہے انسان کے لیے۔"
"اپنی فلاسفی اپنے پاس ہی رکھو۔"
"اگر ہم سب کچھ اپنے پاس ہی رکھیں تو دوسروں کو کیا دیں گے؟"
"مت دو، کیا ضرورت ہے دوسروں پہ مہربانیاں کرنے کی۔" رودین کے چہرے اور لہجے سے جھنجلاہٹ ذرا کم ہو گئی تھی۔ اب وہ نسبتاً پرسکون انداز میں بول رہا تھا۔
"زویا! تم نے سر ہاشم کا اسائنمنٹ کمپلیٹ کرلیا" ہمایوں کو اچانک ہی یاد آیا۔
"تھوڑا سا رہ گیا ہے، آج رات کو لگاؤں گی، نائٹ شفٹ۔"
زویا لیٹ نائٹ کام کرنے کو ہمیشہ نائٹ شفٹ کا نام دیتی اور اپنے اکثر اسائنمنٹ وہ ایسے ہی مکمل کرتی تھی۔ رودین کے خیالات اور طریقہ مختلف تھا۔ وہ کڑے ڈسپلن میں پلا بچہ تھا۔ رات دس بجے سونا، صبح چھ بجے اٹھنا، اس کی عادت اب بھی یہی تھی۔
"پتا نہیں تم لوگوں کو آدھی آدھی رات تک جاگنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ رات آرام کے لیے ہوتی ہے آرام کرو۔"
"ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔" ہمایوں جھوم کر کہتا "سب جگ سوئے، ہم جاگیں، تاروں سے کریں باتیں۔"
"اب کون کرتا ہے تاروں سے باتیں؟ اور تارے نظر ہی کہاں آتے ہیں آسمان پر؟"
"کرنے والے کرتے ہیں پیارے! تاروں سے باتیں، چاند سے گزارشیں اور......" ہمایوں جھوم جھوم جاتا، جس کے اسباب بڑے خوب صورت اور دل آویز تھے۔ ماسٹرز کمپلیٹ ہوتے ہی وہ

بڑھا اور رغبت کھونٹے سے باندھا جا رہا تھا۔ جو ماموں کے گھر تھا۔ زویا، تایا کی بیٹی تھی دونوں کا گھر سے گھر ملا ہوا تھا۔ یونی میں کلاس فیلو تھے۔
ہمایوں کے گھر وہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس کے گھر کے آگے گاڑی روکی ہمایوں اتر گیا۔ زویا بھی اپنے تھیلے سنبھالتی ہوئی دروازہ کھولنے لگی۔
"رودین! آ جاؤ، کیک کھالو برتھ ڈے کا۔"
زویا نے آفر کی۔ عین اس لمحے رودین کا موبائل بجنے لگا۔
نمبر دیکھ کر اس کے چہرے پہ رونق آ گئی اور بات کر کے وہ اور بھی مطمئن ہو گیا۔
"ہیلو......"
"جی تھینکس، ویسے آپ کو بڑی جلدی خیال آ گیا۔ میں کب سے ویٹ کر رہا تھا۔ ممی تو اس قسم کی فارملٹیز کی قائل نہیں ہیں۔ مگر آپ تو یہ سب یاد رکھتے ہیں۔"
بچوں کی طرح شکوے کرتا ہوا رودین اس وقت میچور یونی اسٹوڈنٹ کے بجائے اسکول بوائے لگ رہا تھا۔
"آ جا یار! کچھ خاطر کرنے کی سعادت عطا فرما ہمیں۔" ہمایوں نے پیش کش کی۔
"تم تو اپنی امی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاؤ گے، میری خاطر کون کرے گا؟"
"ہم کر دیں گے۔ آ جاؤ۔" زویا نے اپنے گھر کی جانب قدم بڑھائے۔
"میں نے ناشتہ نہیں کیا ابھی تک۔" رودین نے دونوں کے ساتھ قدم بڑھائے۔ اس کا موڈ یکا یک ہی خوش گوار ہو گیا تھا۔
"اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب تو کھانا ہی کھالینا۔" زویا نے سفید رنگ کا گیٹ اندر کی جانب دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔
ہمایوں بے تکلفی سے آگے بڑھ گیا۔ رودین وہیں کھڑا رہ گیا۔ زویا تیزی سے اندر غائب ہو گئی تھی۔ یہ ایک بڑا سا آنگن تھا۔ جس کا آدھا حصہ کچا

تھا۔ اسے ازراہ نوازش یا تکلفاً لان کہا جا سکتا تھا۔ مگر اصل میں وہ کچن گارڈن تھا جس میں امرود، لیموں، پپیتے اور جامن کے پیڑ تھے اور سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ کریلے اور سیم کی بیلوں نے پوری دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کچن گارڈن میں ایک سانولی سلونی، مناسب قد و قامت اور جسامت کی خاتون کھرپی ہاتھ میں لیے مٹی الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔

"تھکی بر تھ ڈے چچی جان!" ہمایوں نے ان کے قریب جا کر انہیں وش کیا۔

"تھینک یو بیٹا!" کھرپی نیچے رکھ کر انہوں نے ہاتھ جھاڑے اور رودین کو سوالیہ مگر مسکراتی نظروں سے دیکھا جو انہیں سلام کر رہا تھا۔

"یہ رودین ہے، ہمارا کلاس میٹ، ہمیں چھوڑنے آیا ہے ہم نے فارملی اندر آنے کو کہا تو یہ سچ مچ ہی آ گیا۔" ہمایوں ہنسا۔

"مجھے زویا نے آفر کی تھی کیک کھانے کی۔" رودین نے تصحیح کی۔

"ان لوگوں کے مذاق تو چلتے رہیں گے، آپ اندر چل کے بیٹھو میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" طیبہ امی کھڑی ہو گئیں۔

"اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں جا رہا ہوں چچی! امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔"

"کیسے جاؤ گے، میں لے چلتا ہوں۔" رودین کا موڈ حیرت انگیز طور پر اتنا خوش گوار ہو چلا تھا کہ وہ ایک بار پھر ہمایوں کا ڈرائیور بننے کو تیار تھا۔

"پاپا نے گاڑی بھجوا دی ہو گی۔ صبح کہہ کر گئے تھے۔" ہمایوں بائے بائے کرتا نکل گیا۔

"آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔"

"نہیں آنٹی! میں چلتا ہوں، بس ہمایوں کو چھوڑنے آیا تھا۔"

"کھانے کا وقت ہے، کھانا کھا کر جانا، اتنی زحمت کی تم نے، دونوں کو لے کر یہاں آئے، بہت شکریہ۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں لنچ ٹائم ہو گیا ہے اور تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔" زویا اندر سے نکل کر آئی تھی۔

"اب بیٹھ جاؤ، ہمایوں کو پتا چلا نا کہ تم ایسے ہی بھاگ لیے بغیر کچھ کھائے پیے تو میرے رول، سموسے بند ہو جائیں گے جو اپنے پلے سے کھلاتا ہے۔" زویا نے بید کی بنی کرسی آگے کی۔

"میں خود لے لوں گا تم پلیز رہنے دو۔" رودین کو اس کا کرسی اٹھانا اچھا نہیں لگا۔

"امی! پکایا کیا ہے؟"

"قبولی۔"

"قبولی؟ سالگرہ والے دن قبولی؟ کیا ہو گیا امی؟" زویا تقریباً چلا ہی اٹھی۔

"میری سالگرہ ہے میں نے اپنی پسند کی ڈش بنائی ہے تمہیں کیا؟"

طیبہ امی نے شان بے نیازی سے جواب دیا اور رودین کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ جو سوچ رہا تھا کہ قبولی کیا ہے؟

"ہائی واوے، یہ کون سی ڈش ہے۔" اپنے تجسس کو اس نے سوال کا جامہ پہنایا۔

"چنے کی دال کی کھچڑی، جسے بڑی شان سے پلاؤ بھی کہا جاتا ہے۔"

"سالگرہ کے دن، کھچڑی، حد کر دی امی، آپ نے۔" زویا بے طرح جھنجھلا رہی تھی۔

"میں نے رودین کو لنچ کی آفر کی تھی۔" اس نے منہ لٹکایا۔

"اٹس او کے، میں صبح سے بھوکا ہوں اور کھچڑی تو کیا پتھر بھی چبا سکتا ہوں اتنی شدید بھوک لگ رہی ہے۔"

رودین کو طیبہ امی اتنی بے ضرر اور مہربان لگیں کہ وہ عادت کے برخلاف، فوراً ہی ان سے بے تکلف ہو گیا اور حد تو یہ کہ کھچڑی کھانے پر آمادہ ہو گیا جو وہ بیماری اور مجبوری میں بھی نہ کھاتا۔

(ویسے آج تک کی زندگی میں، مجبوری نام کی کسی شے سے واسطہ نہ پڑا تھا)

"یہاں ان ایزی فیل کرو گے۔ آؤ، اندر آجاؤ۔" طیبہ امی نے رودین کو مخاطب کیا اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ زویا فوراً بول اٹھی۔

"جی نہیں ابھی یہیں بیٹھو میں ڈرائنگ روم میں کچھ کر رہی ہوں جب بلاؤں تب آنا۔"

"اف!" امی نے سر پکڑ لیا۔

"میں بچی ہوں کیا، جو میرے لیے ربن اور غبارے لگا رہی ہو؟" امی اپنی بچی کو اچھی طرح جانتی تھیں جو ہر سال ان کا یوم پیدائش اسی طرح منا رہی تھی جیسے اپنا مناتی تھی۔ یعنی بڑے اہتمام کے ساتھ۔

"دیوانی ہے یہ لڑکی!" وہ بڑبڑائیں۔

"پاگل بھی۔" رودین نے دل ہی دل میں سوچا۔

"آپ کو ڈسٹرب کر دیا، آپ کا کام ادھورا رہ گیا۔" رودین نے معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے کھرپی لی اور اس کے آس پاس پڑی مٹی کو دیکھا۔

"نہیں بھئی تمہاری وجہ سے کچھ بھی ڈسٹرب نہیں ہوا میں تو ویسے بھی اٹھنے ہی والی تھی۔ زویا صبح کہہ کر گئی تھی کہ یونی ورسٹی سے جلدی واپس آئے گی۔" طیبہ امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بیٹا! مجھے کچن میں ذرا کام ہے۔ تم اکیلے یہاں بیٹھو گے تو اندر آجاؤ۔"

"جی بہتر" رودین تابع داری سے ان کے پیچھے پیچھے ہولیا انہوں نے جالی کا ایک دروازہ کھولا جو کہ صحن میں تھا۔

رودین داخل ہوا وہ کچن تھا۔ خاصا کشادہ مگر پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا دروازہ گھر کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ جو کھلا ہوا ہی تھا اس کھلے دروازے سے لاؤنج نما کمرہ نظر آرہا تھا۔ جہاں چار کرسیوں کی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل تھی اور ایک بڑا سا تخت تھا۔

"میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں۔" دیوار کے ساتھ رکھے ایک موڑھے کو گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"جہاں تمہیں اچھا لگے۔" وہ مڑ کر فریج سے کچھ نکالنے لگیں۔

"ویسے تم نے آج ناشتہ کیوں نہیں کیا؟ کھانے کے چور ہو؟"

"اس کی وجہ بتانا بڑا عجیب سا لگ رہا ہے مگر آپ ---- کو بتا دیتا ہوں۔" رودین پیر پھیلا کر اطمینان سے بولا۔

"آج میرا بھی برتھ ڈے ہے اور مجھے ہر سال بچوں کی طرح اس دن کا انتظار ہوتا ہے۔ اسکول لائف تک ممی پاپا بہت اہتمام سے مجھے وش کرتے اور گفٹ دیتے تھے۔ کالج میں آیا تو ممی نے کہا کہ اب بڑے ہو گئے ہو برتھ ڈیز سے باہر نکلو اور لائف کے ساتھ سیریس ہو جاؤ۔ پھر بھی وہ مجھے وش تو کر ہی دیتی تھیں۔ آج صبح جب میں اٹھا تو پتا چلا، ممی ایک سیمینار کے لیے دبئی گئی ہیں میرے لیے میسج بھی نہیں چھوڑ کے گئیں، پاپا تو ہمیشہ میری برتھ ڈے یاد رکھتے ہیں۔ وش کرتے ہیں گفٹ دیتے ہیں انہیں بھی اتنی دیر میں کال کرنے کا خیال آیا۔ آج صبح سے مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔"

"یہ غصہ نہیں رنج تھا جو اپنوں سے توقعات پوری نہ ہونے پر ہوتا ہے۔" طیبہ امی نے گرم گھی میں کباب ڈالے، ذرا دیر میں، تلے ہوئے کباب کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ امی اب ایک پیالے میں بیسن گھول رہی تھیں۔ رودین کبھی باورچی خانے کا جائزہ لیتا، جہاں صفائی ستھرائی تو تھی مگر ساز و سامان اور تعمیراتی بناوٹ میں قدامت پرستی نمایاں تھی۔

کبھی وہ طیبہ امی کو دیکھتا، جو مختلف ڈبے نکال رہی تھیں۔ کچھ گھول رہی تھیں، پھینٹ رہی تھیں یا پیس رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

"تمہارا نام کافی الگ ہے رودین!" طیبہ امی نے آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔ کباب کے ساتھ

ساتھ فضا میں پکوڑوں کی مہک بھی پھیل رہی تھی۔

"جی.... شاید۔" رودین نے اپنی عینک، ناک پر بیلنس کی۔ "یہ رشین نیم ہے۔" امی نے اسے بغور دیکھا۔

"رشین؟"

"ایک رشین ناول کا کردار ہے رودین جو۔"

طیبہ امی کی بات ادھوری رہ گئی۔ زویا گھر کے اندر والے دروازے سے کچن میں داخل ہوئی تھی۔

"چلیں امی، اب آپ بالکل ریڈی ہو جائیں آپ پھر چولہے کے آگے کھڑی ہو گئیں تیار بھی نہیں ہوئیں ابھی تک۔" زویا بچوں کی طرح شور مچانے لگی۔

"پانچ منٹ ٹھہرو زویا بس یہ ذرا ہو جائے پھر میں چینج کر لیتی ہوں۔" امی نے بیٹی کی جلد بازی کے جواب میں تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"رودین، تم بور تو نہیں ہو رہے؟"

"ہرگز نہیں، اپنے دوستوں سے زیادہ اچھی کمپنی مل رہی ہے مجھے۔"

"گھر آئے مہمان ہو اس لیے عزت دینی پڑ رہی ہے کل ملو گے نا یونی میں پھر بتاؤں گی۔"

"زویا! یہ کیسے بات کر رہی ہو؟" امی اس کے انداز پہ حیران ہوئیں۔

"یہ محترمہ ایسے ہی بات کرتی ہیں آنٹی! کسی کے بھی منہ پہ اسے کچھ بھی بول دیتی ہے، بغیر کسی لحاظ کے۔" رودین نے انکشاف کیا۔

"واقعی؟" طیبہ کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"امی ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ یہ صاحب کسی کو بھی بھڑکانے اور مشتعل کرنے میں ماہر ہیں۔ آپ جا کر ریڈی ہو جائیں کچن کا کام میں دیکھ لوں گی۔" زویا نے تقریباً زبردستی ہی انہیں کچن سے باہر نکالا۔

رودین اب ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ یہ بھی اس پرانی وضع کے گھر کا ایسا ہی کمرہ تھا جو قدامت پرستی کا تاثر اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ اس کے دروازوں اور ان کے اوپر لگے رنگ برنگے شیشے لکڑی کے بڑے اور بھاری صوفے ویسی ہی میز اونچی چھت اور پرانی طرز کا چپس کا فرش۔

زویا نے اس کمرے میں غبارے، ربن اور کچھ آرائشی سامان لگایا ہوا تھا۔ میز پہ پھولوں کی پتیاں تھیں۔ جن پر برتھ ڈے کیک رکھا ہوا تھا۔

طیبہ امی نے تیاری میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ گلابی اور سفید رنگوں کے امتزاج کا جوڑا پہنے بالوں کی سادہ سی چوٹی اور میک اپ کے نام پر پنک لپ اسٹک، ان کی شخصیت میں سادگی نمایاں تھی۔

امی ایک چھری اور لے آئی تھیں۔ جو انہوں نے رودین کی طرف بڑھائی۔

"یہ لو بھئی کیک کاٹو، آج تمہاری بھی سالگرہ ہے۔"

"ہیں؟ سچ تم نے بتایا کیوں نہیں۔" زویا کا ردعمل بے ساختہ تھا۔

"ارے، وہ، وہ تو میں نے یونہی بتایا تھا۔ پلیز آپ..... آپ کیک کاٹیں آپ کے لیے آیا ہے۔" رودین ہکلا گیا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں دونوں مل کر کاٹ لیتے ہیں۔ اس طرف سے میں کاٹتی ہوں۔ اس طرف سے تم۔" رودین کا تذبذب دیکھ کر طیبہ امی نے درمیان کی راہ نکالی۔ اور کیک بخیر وخوبی کٹ گیا۔

"آپ کا گفٹ۔" زویا نے امی کو گفٹ پیش کیا۔ "یہ کتاب بھی۔" "آپ کے فیورٹ کی ہے۔" زویا نے اشارہ دیا۔

"عرفان جاوید۔" امی نے ریپر کھولنے سے پہلے ہی بوجھ لیا جس میں عرفان جاوید کی "سرخاب" تھی۔

"کیک کٹ گیا؟ ختم تو نہیں کیا۔ میرے آنے کا انتظار ہی کر لیتے۔" ہمایوں شور مچاتا ہوا اچانک ہی وارد ہوا تھا۔

"یہ لو، تمہارا اسپیشل پیس تو پہلے ہی الگ رکھ دیا تھا۔" زویا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی، "یہ بڑی

امی کے لیے لے جانا۔"

"چچی جان! ایک غریب طالب علم کی طرف سے چھوٹا سا تحفہ۔" ہمایوں نے گلاب کا پھول ان کی خدمت میں پیش کیا۔

"اور یوں لگ رہا ہے جیسے میں بہت پہلے سے اس گھر میں آتا رہا ہوں۔ سب سے پرانی شناسائی ہے۔" قیولی کھچڑی کو کباب اور چٹنی کے ہمراہ کھاتے ہوئے رودین نے سوچا۔

"مجھے تو وہی بڑے دو۔ کتنے دنوں بعد چچی کے ہاتھ کے وہی بڑے کھاؤں گا۔" ہمایوں نے زویا کو مخاطب کیا۔

"بڑے ہی مزیدار اور ہلکو ہو تم، ہفتہ دس دن پہلے ہی تو امی نے بنائے تھے اور تمہیں ٹھنسائے تھے۔"

"کیا بات کر رہی ہو؟ دس دن پہلے یعنی کہ پورے دس دن دس راتیں سیکڑوں گھنٹے ہزاروں سیکنڈز فراق میں ایک ایک لمحہ صدی بن جاتا ہے بے وقوف لڑکی!"

"کھانے کے فراق میں؟"

"بالکل، الفت تو الفت ہے۔ چاہے انسان سے ہو یا پکوان سے۔ کیوں رودین؟"

"تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ کم بولنا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے؟" رودین نے اس کی حمایت کے بجائے ٹانگ کھینچی۔

"کس کی، میری یا دوسروں کی؟"

"اس کا منہ کوئی نہیں بند کر سکتا سوائے کسی پکوان کے۔" زویا نے ڈش اس کے سامنے رکھی۔

رودین اس دن گھر واپس آیا تو صبح والی جھنجھلاہٹ، بے زاری اور بڑی حد تک اداسی، غائب ہو چکی تھیں۔ جیسے سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی اوس کے قطرے غائب ہو جاتے ہیں۔

"میں صبح کچھ اور تھا اور اب شام میں کچھ اور، سچ ہے کہ انسان کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔" رودین مسکرا اٹھا۔

"اور خود پہ ہنسنا اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا۔"

شام کی چائے پاپا کے ساتھ پیتے ہوئے اس نے خود پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں۔ واقعی اس طرح ری ایکٹ کر رہا تھا جیسے انیس سو ستر کی ہیروئین۔" رودین نے باپ کے سامنے اعتراف کیا۔

"تو اب گفٹ ملنے کے بعد ہیروئن کا ری ایکشن کیا ہے؟"

"ہائے اللہ، اتنا قیمتی تحفہ؟ کسی نے دیکھ لیا تو!" رودین کی اداکاری بہت بھرپور اور مکمل تھی۔ دونوں باپ بیٹا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

☆☆☆

ممی چار روز بعد واپس آ گئی تھیں۔ پھر وہی روٹین شروع ہو گئی۔ کشن اپنی جگہ آ گئے۔ رودین کی ہاف پینٹ اور بنیان کی جگہ پراپر ڈریس نے لے لی۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، حتیٰ کہ بات چیت کرنے کے بھی اوقات مقرر ہو گئے۔ مگر ایک شوہر کو تو اپنی بیوی سے بات کرنے کے لیے خاص وقت اور جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی لیے رات گیارہ بجے، شاہ زیب احمد اپنی شریک حیات کے ساتھ بحث میں مصروف تھے۔ وہی پرانی باتیں جو بڑھتے بڑھتے پہلے بحث پھر جھگڑا بن جاتی تھیں۔

"اگر تم رودین کی برتھ ڈے وش کر دیتیں تو تمہاری شان میں کیا کمی آ جاتی یا اس سے بھی گھر اور رودین کا ڈسپلن خراب ہو جاتا؟"

"فار گاڈ سیک شاہ زیب! میں بھول گئی تھی۔ بالکل نکل گیا دماغ سے کہ رودین کی برتھ ڈے ہے۔ کانفرنس کا اتنا پریشر تھا اس میں الجھی ہوئی تھی۔"

صوفیہ جھلا گئیں۔ بیٹے کا موڈ الگ آف تھا۔ ادھر شوہر کی کڑوی کسیلی جو سننے کی عادی نہیں تھیں۔

"تم ماں ہو اس کی تم سے بڑی توقع رہتی ہے ہمیشہ اسے۔"

"ٹھیک ہے، میں ماں ہوں مگر اب اسے بڑا ہو جانا چاہیے کچھ ایکسپیکٹیشنز ہماری بھی ہیں۔ کبھی کوشش

کرتا ہے ان پر پورا اترنے کی؟"

"جی پی دیکھو اس کمسٹر کا کیا آیا ہے؟ اپنے دوستوں کے پیچھے پیچھے کے یو (کراچی یونی ورسٹی) میں ایڈمیشن لے لیا، میرے منع کرنے کے باوجود بھی نہیں مانا۔"

"جو کچھ سیونگز تھی، عمر کی پڑھائی پہ لگا دی روبین نے اسی لیے انکار کر دیا تھا کہ بینک سے لون لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بچوں کو پڑھانا آسان ہے کیا؟" شاہ زیب نے بیٹے کی صفائی پیش کی۔

"وہ میرا مسئلہ تھا۔ میں کرتی بندوبست کہیں سے بھی ــــ" صوفیہ نے دراز سے مسکن ادویات نکالیں گولی منہ میں رکھی اور پانی پیا۔

"تم دونوں باپ بیٹے ہمیشہ ہی مل کر مجھے مایوس کرتے ہو۔" انہوں نے مزید گوہر افشانی کی۔

"تم ہمیں پریشان اور دکھی کرتی ہو۔" شاہ زیب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تمہیں تو شوق ہے افسردہ رہنے کا۔" صوفیہ نے چادر کی تہہ کھولی اور تکیہ ٹھیک کیا۔

"زندگی، خواب، خیال کے سہارے نہیں گزرتی، پریکٹیکل ہونا پڑتا ہے۔ جو تم ہونا نہیں چاہتے اور تمہارا بیٹا بھی تم پر ہی گیا ہے۔" صوفیہ نے خود پہ چادر تانی۔

"عمر تو تم پر گیا ہے۔ تمہاری طرح انٹیلی جنٹ انٹیلی جنٹ اور پریکٹیکل۔"

"شاہ زیب، میں رات بھر بیٹھ کر تمہارے ساتھ بحث نہیں کر سکتی۔ تمہیں نہیں سونا، مت سوؤ، مجھے سونے دو۔" صوفیہ نے تلخی اور بے زاری سے بولتے ہوئے کروٹ لی۔ جوان دونوں کے رشتے میں بھی آ گئی تھی۔

"کبھی میں بے تاب تھا اس عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے اور آج؟"

"آج تمہیں پچھتاوا ہے۔" ان کے اندر سے آواز آئی۔

"سچ ہے، انسان بدل جاتا ہے۔" شاہ زیب کو روبین کا قہقہہ یاد آیا۔ انہوں نے بھی خود پر ہنسنے کی کوشش کی مگر دل کرلانے لگا۔

"خود پہ ہنسنا آسان نہیں ہوتا جناب۔"

☆☆☆

عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگتے مانگتے ذہن بھٹک رہا تھا معمول کی یکسوئی آج مفقود تھی۔ آمین کہہ کر انہوں نے ہاتھ منہ پہ پھیرے اور اٹھ کر جائے نماز تہہ کرنے لگیں۔

زویا بیڈ پر امی کا لکھا ہوا تازہ مسودہ پڑھنے میں مگن تھی۔

"زویا! اب سو جاؤ، صبح اٹھنے میں تنگ کرتی ہو پھر۔"

"بس ابھی ختم ہونے والی ہے کہانی۔" وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ آخری صفحات تھے۔ زویا نے کہانی مکمل کر کے مسودہ سائیڈ پر رکھا اور ماں کو دیکھا جو سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔

"امی......!"

"ہوں۔"

"یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کبھی نہ کبھی کسی سے محبت ضرور کرتا ہے۔ کیا واقعی؟"

"ہاں شاید ہر انسان اس تجربے سے گزرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی کے لیے خاص ہو اور کوئی اس کے لیے خاص ہو۔"

"ماں..... کیا آپ بھی اس تجربے سے گزریں؟"

"زویا! میں تمہاری ماں ہوں۔"

"لیکن آپ میری سہیلی بھی تو ہیں۔"

"جی نہیں بیٹی کو بالکل بھی سہیلی نہیں بنانا چاہیے۔ ورنہ وہ پھیل جاتی ہیں۔ ماؤں کو اسٹرکٹ (سخت) ہونا چاہیے۔"

"پتا نہیں ماں! مگر کبھی ایسا لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ ہمارے والدین بھی عمر کے اس دور سے گزرے ہیں جسے جوانی کہتے ہیں۔ ان کی بھی فیلنگز

رہی ہوں گی۔"

"زیادہ...... فضول مت سوچا کرو، اپنی پڑھائی پہ توجہ دو۔ اب آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔"

"میں ایک کون فیس (اعتراف) کرنا چاہتی ہوں۔" زویا کی آواز معمول سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

امی چونک پڑیں۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ...... ایک دن میں نے اسٹور میں جو لوہے کی الماری ہے اس کی صفائی کی تھی۔"

"کب؟ کیوں؟" طیبہ امی کی سانسیں رک سی گئیں۔

"مجھے ایک پیکٹ ملا تھا۔" زویا اپنی دھن میں بولتی رہی۔ "وہ کیا تھا ماں؟ یادیں سنبھال کر رکھنا کس بات کی علامت ہے؟ سچی محبت کی۔"

"نہیں، نو عمری کی محبت کی، نادانی کی، محبت وہ واحد غلطی ہے جسے انسان بڑے اہتمام سے سنبھال کر رکھتا ہے۔" طیبہ امی کے ہونٹ بے آواز ہلے زویا تک صرف اس کی خاموشی پہنچی۔

"ماں؟"

"سو جاؤ زویا!" طیبہ کی آواز میں جانے کیا تھا کہ زویا ساکت ہو گئی۔

"زندگی کے اگر کئی رنگ ہیں تو انسان کے رنگ ان گنت ہیں۔ زندگی کے اگر کئی روپ ہیں تو انسان کے روپ ان گنت ہیں۔"

زویا کے اندر بہت سے سوالات تھے جو کلبلا رہے تھے اور طیبہ امی کے اندر بہت سی یادوں کے بھنور تھے جو چکرا رہے تھے۔

☆☆☆

سولہ برس کی عمر میٹھی بھی ہوتی ہے اور تیکھی بھی۔ الھڑ بھی ہوتی ہے اور آگہی کی بھی۔

کسی کی پرشوق نگاہیں، وارفتگی، دیوانگی اور بے قراری، ایک نوخیز دل کو بے طرح دھڑکا رہی تھیں۔

وہ پڑوس میں آیا تھا۔ امتحانات کے بعد اپنی چھٹیاں گزارنے احسن ماموں کے گھر، جو طیبہ کے پڑوسی تھے۔ پڑوس بھی ایسا جہاں ہر وقت کا آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا تھا کوئی سوغات ایک دوسرے کو کھلائے بغیر، کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

طیبہ پکوڑوں سے بھری پلیٹ فرحی کے لیے لے گئی تھی اور اندر پہنچنے سے پہلے ہی وہ پلیٹ اچک لی گئی۔

ایک پکوڑا اٹھا کر اس نے منہ میں رکھا منہ چلایا پھر آنکھیں گھمائیں۔

"آپ کے ہاں کی چیزوں میں نمک بہت ہوتا ہے۔"

"نمک نہیں تو، پکوڑوں میں تو نمک تیز نہیں ہے اور چٹنی میں بھی مناسب ہے۔" طیبہ گھبرا سی گئی۔

"اونہوں بہت نمکین ہے سب کچھ۔" شرارتی آنکھوں اور سلکی بالوں والا وہ لڑکا اپنی بات پر قائم تھا۔

"اب احسن چچا کیسے کھائیں گے، وہ تو ہلکا نمک کھاتے ہیں۔" طیبہ کے چہرے پہ پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔

"ادھر لاؤ، ہم چیک کریں۔" فرحی نے ایک پکوڑا منہ میں رکھا۔

"لو اتنے اچھے تو بنے ہیں۔ نمک بھی ٹھیک ہے اور مرچ بھی، لاؤ ہم ابا کو چکھاتے ہیں۔" فرحی پلیٹ لے کر اندر جانے لگی۔

طیبہ اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ جب اس کے آس پاس سرگوشی ہکی۔

"آئینہ بتائے گا آپ کو، سب کچھ کتنا نمکین ہے۔"

"اف!" طیبہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کے سانولے سلونے حسن کی تعریف اس طرح کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔

رات میں چپکے چپکے آئینے کے سامنے وہ اپنا جائزہ لیتی رہی اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی رہیں۔

وہ بلا کا ۔۔ جملے باز تھا آتے جاتے فقرے اچھال دیتا اور طیبہ کا دل اتھل پتھل ہوتا رہتا۔

"فرحی، تمہارے محلے میں جادوگر بھی رہتے

ہیں کیا؟" بڑے بھولپن سے سوال ہوتا اور فری انہیں گھورتی۔

"یہ انسانوں کا محلّہ ہے بھائی جان!"

"اچھا! مگر میں نے تو یہاں ساحر آنکھیں دیکھی ہیں۔ ایسا جادو کرتی ہیں کہ انسان پاگل، دیوانہ ہو جائے۔"

"پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں آپ۔" فری خود جتنی فربہ تھی اس کی عقل اس سے بھی زیادہ موٹی تھی۔ جو باتیں اس کے سر پر سے ہی گزر جاتی تھیں۔ وہ طیبہ کے دل میں گھس کر بیٹھ جاتی تھیں۔ باتیں تھیں کہ مدھر دھن جن کی تال پہ دل دھڑک دھڑک جاتا۔

وہ کپڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی۔ اسے نہ جانے کیسے خبر ہوگئی جو اوپر ہی چلا آیا۔

"ارے آپ؟" طیبہ کو دیکھ کر اس نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

"اف ف۔" طیبہ کی سنہری رنگت میں گلابیاں کی کھلنے لگیں۔ رخ موڑ کر وہ کپڑے پھیلانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دل کی طرح ہاتھ بھی بے قابو ہو رہے تھے۔ جیسے تیسے اس نے اماں بی کا دوپٹہ پھیلایا تب ہی اس کی گمبھیر آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

"بات سنیں۔"

طیبہ ساکت ہوگئی۔

"ادھر تو دیکھیں پلیز۔" ایک التجا نے اس کا دامن تھاما۔

بہت مشکل سے اس نے آدھا رخ موڑا۔

"جی؟"

"ہم آپ کو دیکھنے اور بات کرنے کے شوق میں مرے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ......"

طیبہ کی آنکھیں، جادوگر آنکھیں، اس کی سمت اٹھیں۔

"کسی کو تڑپانے میں بہت مزا آتا ہے آپ کو؟" اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ دونوں چھتوں کے درمیان چھوٹی سی دیوار پہ ہاتھ رکھے وہ کھڑا تھا۔

آنکھوں میں شوق اور انداز میں والہانہ پن تھا۔ طیبہ جیسے ڈھے سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ وہ نیچے تپتے فرش کو گھورنے لگی۔

"آپ کو بھروسا نہیں ہے نا؟ کیا مر کر یقین دلائیں؟"

"اللہ نہ کرے۔" طیبہ کا بے ساختہ اور گھبرایا ہوا انداز۔

ان شرارتی آنکھوں کی نیندیں چرانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا اور مسکرا دیا۔

"آپ نے تو جیسے زندہ کر دیا ہمیں۔"

"آپ جائیں یہاں سے کوئی آ گیا تو؟" دیکھ لیے جانے کے خوف نے طیبہ کو بولنے کی جرات بخشی۔

"ایک شرط پہ آج آپ آئیں گی اور ہم سے بات بھی کریں گی۔"

"مم...... میں کیسے؟ سب ہوتے ہیں وہاں۔" طیبہ کی گھبراہٹ دوچند ہوئی۔

"موقع نکالنا میرا کام ہے۔ آپ بس مجھے دیکھ کر دوڑ نہیں لگائیں گی ورنہ......"

"ورنہ؟"

"ورنہ، جینا مشکل ہے مرنا نہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور چلا گیا۔ مگر جاتے جاتے طیبہ کا دل اور جان دونوں ساتھ لے گیا۔

☆☆☆

احسن ماموں کے ایک کمرے میں کتابیں ہی کتابیں تھیں، یہ کمرہ ایک طرح سے ان کا پرائیویٹ اسٹڈی روم تھا۔ طیبہ یہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھتی یا ساتھ لے جاتی، احسن ماموں اس معاملے میں بڑے فراخ دل تھے۔ طیبہ کے شوق کی حوصلہ افزائی اور نشوونما انہوں نے ہی کی تھی۔ اس وقت وہ بک شیلف کے پاس کھڑی "ایوان ترگنیف" کی "رودین" نکال رہی تھی۔

"آپ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟"

طیبہ کے ہاتھ سے کتاب گرتے گرتے بچی۔

"آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔" محض چند بار کی ملاقاتوں اور باتوں نے طیبہ کا اعتماد اور اعتبار بحال کر دیا تھا۔

"آپ کا تو ہر روپ ہی دلکش لگتا ہے۔ ذرا سہا، گھبرایا ہوا بھی اور مسکراتا شرماتا ہوا بھی۔" چمک دار، براؤن آنکھوں میں وارفتگی تھی چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ، دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے، وہ طیبہ کو دیکھ رہا تھا اس سے مخاطب بھی تھا۔

ساحر آنکھوں کی سیاہ، گھنی پلکیں، اٹھ رہی تھیں، جھک رہی تھیں۔ ان اٹھتی، جھکتی پلکوں کے ساتھ ساتھ دل کی دنیا بھی الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔

"اور کیا شوق ہیں آپ کے؟ کتابوں کے علاوہ اور...."

"اور؟"

"کسی کو اپنے بس میں کرنے کے علاوہ؟"

"آپ آسان باتیں نہیں کر سکتے؟"

"محبت جیسی مشکل کا سامنا ہے، آسان باتیں کیسے کروں؟"

طیبہ کا سارا خون سمٹ کر چہرے پہ آ گیا۔ اس نے آگے قدم بڑھائے "میں جا رہی ہوں۔"

"کیا تم آسان باتیں نہیں کر سکتیں؟" وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کوئی آ جائے گا۔" طیبہ گھبرا گئی۔

"اتنا مت ڈرو اور بھی حسین لگتی ہو۔" وہ ذرا پیچھے ہو گیا۔ "آپ کہاں رہتے ہیں؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد طیبہ نے سوال کیا۔

"تمہارے دل میں۔" وہ دلکشی سے مسکرایا اور اس کے گال میں ایک بھنور پڑ گیا۔

"اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟"

"ہواؤں میں۔"

"آپ کی فیملی کہاں رہتی ہے؟"

"فیملی؟" ایک لمحے کو اس کا چہرہ ماند پڑ گیا۔ طیبہ نے پہلی بار اس کے چہرے پہ افسردگی دیکھی۔

"والدین بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اور تایا جان کے ساتھ رہتا تھا۔"

"اوہ۔" طیبہ کا دل بھی دکھی ہو گیا اسے اداس دیکھ کر۔

"چلو تم اپنے بارے میں بتاؤ، تمہاری فیملی میں کون کون ہے؟"

"ہمارے گھر میں؟ ابا جی، اماں، بڑے بھیا، آپا اور میں اور سب بہت اچھے ہیں۔"

"ہاں، تمہیں دیکھ کر لگتا ہے تم سے وابستہ جو بھی لوگ ہوں گے وہ اچھے ہی ہوں گے۔" سلکی بالوں والا سر ہلا۔

"اور کیا تمہیں کبھی کسی نے بتایا کہ یہ فیروزی رنگ تم پہ کتنا کھلتا ہے اور کتنا جچتا ہے؟" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"اونہوں۔" طیبہ نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ روشن براؤن آنکھوں نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا۔

"اب میں بتا رہا ہوں، میں جھوٹا تو نہیں لگتا؟"

"نہیں۔" طیبہ نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اعتبار ہے مجھ پر؟"

"ہوں۔" طیبہ نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلایا۔

"جانتی ہوں، اعتبار، محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔"

وہ رات گئے تک جاگتی رہی۔ آنکھیں سپنوں کا جال بنتی رہیں۔ نیند کو آنے کی اجازت ہی نہ ملی۔

تو کیا یہ محبت ہے؟ کہ دن میں اپنی سدھ بدھ اور رات میں نیند کھو بیٹھی۔ ابا میاں نے چائے مانگی تو پانی کا گلاس تھما دیا۔

آپا کے سویٹر کا اون اور سلائیاں، الماری میں رکھنے کے بجائے کچن میں رکھ آئی۔ اور تو اور بھیا کے لیے چائے بنائی تو چینی کی جگہ نمک جھونک دیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" آپا نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں آپا! بس یونہی۔" طیبہ نے لیٹے لیٹے تکیے میں منہ چھپالیا۔ اب انہیں کیا بتاتی کہ اسے کیا ہوا ہے؟ عجیب معاملہ تھا خود سے چھپا بھی رہی تھی اور خود کو بتا بھی رہی تھی۔ وہ ساری باتیں دل ہی دل میں دہراتی رہتی جو نٹ کھٹ اطوار والے لڑکے سے سنی تھی۔

کتابیں پڑھنے کے لیے لاتی اور پڑھنے کے بجائے ورق گردانی کرتی رہتی، الفاظ پڑھتی مگر وہ اپنا مفہوم عیاں نہیں کرتے تھے۔ نگاہیں صفحات پر، دل و دماغ کہیں اور اس کا کتب بینی کا شوق جو جنون کی حد تک تھا۔ محبت کے رنگ نے اس شوق کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

گملوں میں پانی ڈالتے ہوئے اس کا اپنا چہرہ بھی پھول کی طرح ہی کھلا ہوا تھا۔ اس نے نیلے شفاف آسمان کی پہنائیوں پہ ایک نگاہ ڈالی، رات میں یہ آسمان کچھ اور ہو جاتا تھا۔ اس کے دل کی طرح روشن جگمگاتا ہوا۔ طیبہ سیڑھیوں پر گملوں کے پاس بیٹھ گئی۔ ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے وہ اس کے تصور میں گم تھی۔

"بارش اچھی لگتی ہے تمہیں؟"

"بہت، بہت زیادہ۔" طیبہ نے آنکھیں بند کر کے کہا اور مسکرائی۔

"مجھے تو بہت بری لگتی ہے۔ سب کچھ گیلا گیلا ہر جگہ کیچڑ ہی کیچڑ۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بارش کو کوئی کیسے ناپسند کر سکتا ہے؟" طیبہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ اسے تو ہر رنگ، ہر روپ میں برسات پسند تھی۔

ہلکی ہلکی پھوار ہو کن من، کن من بوندا باندی ہو۔ زور کا جھالا ہو یا موسلا دھار بارش کی چادر زمین و آسمان کے درمیان تنی ہو۔

محبت بھی ایسے ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ جو اس کے تن من کو پورے وجود کو بھگوتی ہوئی، اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

زندگی کے سب سے خوب صورت احساس کو، سب سے انوکھے جذبے کو اس نے پور پور اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

"میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟" دنیا کا سب سے مشکل سوال اس نے طیبہ سے کیا تھا اور اب اسے شرماتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ۔

"بتاؤ نا۔" سنہری رنگت کچھ کچھ گلابی ہو رہی تھی۔ مگر اصرار کرتا رہا۔

"آپ ہیں ہی اچھے۔" بمشکل طیبہ کا جواب موصول ہوا۔

"یہ تو بڑا سمجھ داری والا جواب ہے مگر اچھا ہونے اور اچھا لگنے میں فرق ہے۔ میں تو تمہارے دل کا حال جاننا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟ اچھا یا برا؟"

"برے تو خیر نہیں لگتے آپ؟" طیبہ نے پھر سوچ کر جواب دیا۔

"دل کے راز، دل میں ہی چھپا کر رکھو گی تو محبت کیسے کرو گی؟"

اس کی بے باکی پر طیبہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"میں جا رہی ہوں۔" طیبہ کے پاس یہی ایک حل تھا جب زیادہ پزل ہو جاتی تو۔

"میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔" براؤن آنکھیں شرارت سے چمکیں۔

"اللہ بھی، کیا ہے آپ کو؟" طیبہ بری طرح گھبرا گئی۔

"اللہ بھی محبت ہے مجھے۔" طیبہ کے ہی انداز میں بے ساختہ جواب دے کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔

"کمال لڑکی ہو تم، میں تم سے تمہارے دل کا حال جاننا چاہتا ہوں اور تم ہر بار مجھ سے ہی اقرار کروا لیتی ہو۔"

"آپ سوال بہت کرتے ہیں۔" سلونی محبوبہ کی شکایت پہ وہ مسکرا اٹھا۔

"کیا کروں، سوالی ہوں تو سوال ہی کروں

کا۔"

"آپ نے یہ ناول پڑھا؟" طیبہ نے اسے دوسرے موضوع پر لانا چاہا۔

"اتنا موٹا ناول؟ مجھے تو بس ایک ہی کتاب اچھی لگتی ہے جی چاہتا ہے ورق ورق سطر سطر اسے پڑھ لوں۔"

"منو بھائی! کہاں ہیں آپ؟" فرحی اسے آوازیں دیتی ہوئی اندر چلی آئی۔

"اُفوہ ایک تو یہ ظالم سماج اوپر سے یہ نام، بچپن گزر گیا اس لقب نے پیچھا نہیں چھوڑا۔" وہ بھنا ہی گیا۔

"یہ تم منو منو کیا کرتی رہتی ہو۔ میں کیا طوطا نظر آتا ہوں تمہیں؟"

فرحی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ، فرحی پر برس پڑا۔

"نانی نے رکھا تھا آپ کا یہ نام، آپ ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟"

فرحی بے چاری حیران ہوگئی۔

"سارے بچے بچپن میں باتونی ہوتے ہیں۔ کیا سب کی نانیاں انہیں منو کہنے لگ جاتی ہیں؟" بھوری آنکھوں میں خفگی در آئی۔

"محبت سے رکھے گئے ناموں پہ ناراض نہیں ہوتے۔" طیبہ نے مداخلت کی۔

"دیکھا، یہ ہوئی نا بات۔" سہیلی کی دانش مندی پہ فرحی خوش ہوگئی۔

"یانی داوے مجھے آوازیں کیوں لگ رہی تھیں۔"

"وہ ہم چائے بنانے جارہے تھے سوچا آپ سے بھی پوچھ لیں۔"

"سیلی اور پوچھ پوچھ؟ جاؤ فٹافٹ بنا کر لاؤ۔"

"ٹھیک ہے، آؤ طیبہ! تم بھی کچن میں آجاؤ، یہاں اکیلی کیوں بور ہو رہی ہو۔" فرحی سادگی سے بولتی ہوئی سرپٹ چل پڑی۔

"جائیے کچن میں، آپ کی سہیلی صاحبہ دعوت دے کر گئی ہیں۔" بے چارے منو کا دل بے ایمان ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

نیلے آسمان کا رنگ اور جھاگ سا سفید رنگ، دونوں رنگوں کے اون کے گولے، ایک دو نہیں، کئی گولے ختم ہو کر سویٹر کی شکل میں ڈھل رہے تھے۔

آپا کے ہاتھ بہت تیزی اور مہارت سے چل رہے تھے۔ آگے پیچھے کے حصے تیار کرنے کے بعد اب وہ آستین بنا رہی تھیں۔

"آپا، مجھے بھی بننا سکھا دیں۔" طیبہ نے فرمائش کی۔

"تمہیں بھی شوق ہو گیا؟" پھندے گنتے ہوئے آپا مسکرائیں، ان کی مسکراہٹ بھی، ان ہی کی طرح اجلی اور خوب صورت تھی۔

"سلائیاں ہینڈل کر کے پھندے ڈالنے تو آتے ہیں مگر ڈیزائن بنانا نہیں آتا وہ سکھا دیں۔"

"شروع کرو میں ڈیزائن بتا دوں گی۔ ویسے بناؤ گی کیا؟"

"پہلے تو ایک مفلر بناؤں گی۔" طیبہ نے سوچ کر جواب دیا۔

"سلائیاں بھی رکھی ہیں اور اون بھی، شروع ہو جاؤ پھر ویسے کس کے لیے بناؤ گی؟ بھیا کے لیے؟ یا ابا کے لیے؟"

"پہلے بن تو جائے۔" طیبہ نے مبہم سا جواب دیا۔

بڑے شوق اور دل جمعی کے ساتھ اس نے مفلر بنانا شروع کیا تھا۔

☆☆☆

زویا نے مسودہ بیڈ کی سائیڈ پہ رکھا۔

"آگے کب لکھیں گی؟"

"بہت جلد۔"

"کیا یہ سب سچ ہے؟" زویا نے ماں کو دیکھا۔

"کچھ مبالغہ آرائی بھی ہے جو ناول کے لیے ضروری ہے۔"

"ماں..... زندگی ایسی کیوں ہوتی ہے؟"
"اس سوال کا جواب تو ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں دیا ہے، فلسفی، شاعر، ادیب، عالم، دانشور، مورخ، محقق، سب نے اپنی اپنی تاویلات پیش کی ہیں مگر پھر بھی ایک تشنگی سی ہے، نہ سوال کرنے والے پوری طرح مطمئن ہیں نہ جواب دینے والے۔"
"میں بھی اکثر اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔" زویا کی کھوئی کھوئی سی نگاہیں سامنے فضا میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔
طیبہ نے بیٹی کی کھوئی کھوئی نگاہیں اور چہرے پہ لکھے سوال دیکھے اور وہ خوف زدہ ہو گئیں۔
"بیٹا تم کیوں اتنی سنجیدہ اور حساس ہو رہی ہو؟ اتنا مت سوچو، تمہاری عمر میں تو بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہی انسان خوش ہو جاتا ہے۔ سوچ بچار کے سمندر میں مت اترو، بہت زیادہ شعور، بہت زیادہ آگہی زندگی مشکل کر دیتی ہے۔ تم جیسی ہو، ایسی ہی رہو، بے خبر اور معصوم۔"
طیبہ نے محبت سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ "اپنی معصوم مسکراہٹ کو غبار آلود نہ کرو۔"
زویا مسکرائی مگر اگلے ہی پل یہ مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔
"آپ تو ماں ہیں نا، اس لیے آپ کو اپنی بیٹی معصوم لگتی ہے، ہمایوں رودین اور عالیہ کہتے ہیں کہ میں بہت چالاک ہوں۔" زویا نے منہ پھلایا۔
"ہائیں، وہ کیوں؟"
"کیونکہ میں اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی اور کیوں دوں؟ اتنی محنت سے نوٹس بناتی ہوں۔ کوکل سے نہیں چھپاتی، بعض تو اتنے لیزی اور نکمے ہیں کہ کوکل سے بھی نہیں چھاپ سکتے، بنا بنایا حلوہ دے دو، حلق سے نیچے اتارنے کے لیے۔"
"ضرورت مند کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے زویا! مدد ممکن ہو، کر دیا کرو۔"
"ضرورت مند نہیں، ڈفر ہیں ایک دم، اب آپ دیکھیں جس دن پیپر ہے۔ اس روز صبح صبح عدیل کا فون آیا بڑی معصومیت سے کہنے لگا ابا! کوئی امپورٹنٹ بتا دو کیا پڑھوں؟ میں نے کہا کہ اب تو "انا للہ" پڑھ لو اور زیادہ وقت ہے تو "فاتحہ" پڑھ لو۔ اس وقت تو بس یہی پڑھا جا سکتا ہے۔"
بیٹی کی بے ساختگی اور روانی پہ طیبہ ہنس پڑیں۔
"ہمایوں کہتا ہے کہ میں بہت چالاک ہوں اور رودین صاحب کا فرمان ہے کہ میں بہت سیلفش ہوں۔"
"نہیں خیر، میری بیٹی سیلفش تو نہیں ہے۔" طیبہ نے فوراً تردید کی۔
"میں اچھی ہوں نا ماں!" زویا بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔
"بہت اچھی ہو۔ کہو تو سرٹیفکیٹ بنا دوں۔"
"بس آپ کی زبان ہی سرٹیفکیٹ ہے۔" زویا نے ماں کے پھیلے ہوئے بازو پہ سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

مصروفیت ہی مصروفیت تھی۔ لاسٹ سمسٹر تھا۔ زور و شور سے پڑھائی اور تیاریاں جاری تھیں۔ زویا نے دن رات ایک کیے ہوئے تھے، محنت تو ہمایوں بھی بہت کر رہا تھا۔ رودین اتنا غیر ذمے دار اور لاپرواہ تو نہیں تھا، پھر بھی کسی کسی روز وہ چھٹی کر ہی لیتا تھا اور سیدھا طیبہ کے پاس چلا آتا۔ پہلی بار کے بعد سے اب تک گاہے گاہے وہ گھر آ جاتا اور طیبہ سے باتیں کرتا رہتا، کچھ اپنی کہتا کچھ ان کی سنتا، طیبہ کو بھی اب اس کا انتظار رہنے لگا تھا۔
طیبہ کیاری میں موسم کے نئے بیج بو رہی تھیں۔ رودین سامنے کرسی پر چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا تھا۔
"کیا بات ہے، آج بہت خاموش ہو۔"
"یونہی کبھی خاموشی بھی اچھی لگتی ہے۔"
"ہاں بھئی، خاموشی میں کوئی مضائقہ تو نہیں کبھی کچھ نہ بولنا بھی اچھا لگتا ہے مگر تم نوجوانوں کے ساتھ تو یہ چپ اچھی نہیں، ہنسنے بولنے کے دن ہیں۔ ہنس بول کر گزارو۔" طیبہ نے کھرپی کی مدد سے مٹی

اور کھاد برابر کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا مجھے آگے کیا کرنا ہے۔ میری اپنی کوئی فیوچر پلاننگ نہیں ہے۔ ہاں مگر ممی کی ضرور ہے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔ "انہوں نے میرے لیے ایک لائن ڈرا کردی، جس پر میں چل رہا ہوں، مگر کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔ بس ممی کی خواہش پوری کررہا ہوں۔"

"تم اپنی خوشی اور ناخوشی کے بارے میں بھی کلیر نہیں ہو؟" طیبہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"شاید۔۔۔" رودین نے کندھے اچکائے۔

"اگر تمہارے پاس کوئی بہتر فیوچر پلان ہے اپنے بارے میں تو اپنے پیرنٹس کے ساتھ ڈسکس کرلو اور ان کے مشورے پہ عمل کرلو۔"

"اب تک تو یہی کرتا آیا ہوں۔"

"پھر اب کیا پرابلم ہے؟"

"میں اپنی مرضی سے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہ کچھ کیا ہے؟"

"میں اپنے پاپا کے ساتھ ان کا بزنس سنبھالنا چاہتا ہوں مگر ممی اس کے خلاف ہیں۔" رودین نے سوچ کر بولنا شروع کیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ، ہر بزنس میں عموماً اپس اینڈ ڈاؤن آتے ہیں اور پچھلے چند برسوں سے پاپا کو بزنس میں زیادہ تر لوس (نقصان) ہی ہوا ہے ممی کے خیال میں وہ ایک فیلیئر ہیں اور بقول ان کے اگر میں نے پاپا کے ساتھ کام کیا تو گھر میں ایک کے بجائے دو فیلیئرز ہوجائیں گے۔"

"ہوں۔" رودین کی باتیں غور سے سنتی ہوئی طیبہ نے ایک گہری سانس لی اور کیاری میں موجود ننھی پھوٹتی کونپل کو دھیرے سے انگلی سے چھوا۔

"رودین! میں کوئی ماہرانہ رائے تو نہیں دے سکتی۔ مگر یہ ہے کہ ہوسکتا ہے تمہاری ممی کا تجزیہ اور اندازہ تمہارے بارے میں درست ہو کہ کبھی انسان جاب میں بھی بہت کچھ اچیو کرلیتا ہے اور بزنس میں نقصان اٹھاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ تم اپنے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہو اور اپنے فیوچر کے بارے میں فیصلہ کرنے کا تمہیں بھی حق ہے۔ تو تم اپنی ممی سے بات کرکے کچھ وقت لے سکتے ہو۔ اگر اس عرصے میں بزنس میں کامیابی ہوئی تو اچھی بات ہے ورنہ ممی کی گائیڈ لائن پہ چلنا۔"

"آنٹی! میں ایسا کرکے دیکھتا ہوں۔ مگر ایک سوال ہے۔"

"کیا؟"

"کیسی کیا بات ہے آپ میں کہ میں آپ سے وہ سب شیئر کرلیتا ہوں جو اپنے کلوز فرینڈز کے ساتھ بھی نہیں کرتا؟"

"تمہارا اعتبار اور اپنائیت ہے۔" طیبہ امی اٹھ کھڑی ہوگئیں۔

"جب میں پہلی بار آپ سے ملا تھا۔ تب سے ہی آپ سے اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت پہلے سے آپ کو جانتا ہوں۔"

"ہاں، کبھی کبھی کچھ لوگوں کے بارے میں ہماری فیلنگز بھی ہوتی ہیں۔ دل و دماغ کے تار کسی کے ساتھ یکدم ہی جڑ جاتے ہیں اور کبھی کچھ وقت بھی لگ جاتا ہے۔"

"اور ایک بات اور بھی ہے۔" طیبہ امی چلتے چلتے رکیں۔ "کہا گیا ہے کہ روز ازل جو روحیں ایک دوسرے سے مانوس ہوئیں وہ دنیا میں بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوتیں۔" انہوں نے ایک حدیث کا مفہوم بیان کیا۔

"اچھا؟" رودین کی آنکھوں میں حیرت جاگی۔ "یہ تو زندگی ہے ذرا حیرت انگیز نہیں ہے؟"

"ذرا؟ بہت چھوٹا لفظ ہے۔"

"چلو آؤ تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں۔" طیبہ امی کچن کی طرف جانے لگیں۔

"کڑکی بنائیں۔" رودین نے فرمائش کی۔

زویا یونیورسٹی سے آئی تو رودین کچن میں امی کے ساتھ سلاد بنوا رہا تھا۔

"تم آج پھر غائب ہو گئے؟ یہاں بیٹھ کر ایگزام کی تیاری کر رہے ہو؟"
"یہی سمجھ لو۔" رودین نے سلاد کا پتہ سیدھا کر کے پلیٹ میں لگایا۔
"تم سے کون بحث کرے؟" زویا۔ ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔
"کیا پکایا ہے؟" ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر چیک کرنے لگی۔
"ارے دم پر ہیں چاول دو منٹ ٹھہر تو سہی۔"
"ان کے دم سے پہلے میرا ہی دم نکل جائے گا۔ اتنے زور سے بھوک لگ رہی ہے۔"
"چچی جان! کیا پکایا ہے؟" ہمایوں بھی شور مچاتا ہوا آ گیا۔
"ارے ہمارے بل گیٹس یہاں بیٹھے ہیں؟" رودین کو دیکھ کر اس نے فقرہ چست کیا۔
"یہ کیا؟" اپی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔
"بھئی بل گیٹس نے کالج ادھورا چھوڑ کر اپنی کمپنی بنالی تھی۔ ہمارے یہ صاحب یونی ورسٹی ادھوری چھوڑ کر کوئی کارنامہ کریں گے شاید۔" ہمایوں نے فریج کھول کر معائنہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔
"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک آدھ آف سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"فرق تو کسی بات سے نہیں پڑتا۔"
"زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا۔"
زویا نے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔
"تم لوگ چھوٹتے ہی شعر و شاعری پہ کیوں اتر آتے ہو؟" رودین کا اشارہ زویا کے ساتھ ہمایوں کی طرف بھی تھا۔
"ہمارے چچا جان کی صحبت کا اثر ہے۔ وہ بڑے باذوق انسان تھے۔" ہمایوں نے اسے آگاہ کیا۔
"ویسے آنٹی کو جان کر لگتا ہے کہ وہ باذوق ہی ہوں گے۔"
رودین کی ان ڈائریکٹ تعریف پر طیبہ امی مسکرا دیں۔
"اتنی جلدی لوگوں کے بارے میں اپنی رائے قائم کر لیتے ہو؟"
"ہاں، چاول دم آ گئے ہوں گے یا؟" زویا بھوک کے مارے بہت ہی بے صبری ہو رہی تھی۔
"جاؤ میز لگاؤ، یہ برتن لے جاؤ۔" طیبہ امی نے ڈھکن ہٹا کر چاول چیک کیے جو اچھی طرح دم پہ آ گئے تھے۔

☆☆☆

دن آوارہ پتوں کی مانند اڑتے جا رہے تھے۔ طیبہ کا دل بھی خشک، زرد پتا ہو گیا تھا، آنکھوں کی اداسی، چہرے سے ہوتے ہوئے تمام وجود پر پھیل گئی تھی۔ ہر وقت عجیب سی کھوئی کھوئی کیفیت طاری رہتی۔ ایک بے بسی، جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول گئی ہو۔ اپنی سب سے قیمتی متاع کھو گئی ہو اور لاکھ ڈھونڈنے پر بھی کوئی نشان نہ ملے۔ ادھر سے ادھر وہ پریشان پریشان سی پھرتی رہتی، سب سے پہلے آپا نے ہی اس کی جانب توجہ دی۔
"کیا بات ہے چھوٹی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے متفکر ہو کر طیبہ کا چہرہ دیکھا سنہری چہرے کی جوت کم ہوتے ہوتے بالکل مدھم ہو رہی تھی۔
"کچھ نہیں آپا، پتا نہیں کیوں روزانہ سر میں درد ہو جاتا ہے۔"
طیبہ نے بہانا نہیں کیا تھا نہ ہی دروغ گوئی، سچ مچ روزانہ اس کے سر میں درد بھی رہنے لگا تھا۔ شاید مستقل سوچتے رہنے سے یا شاید اکثر جب دل بھر آتا تو تھوڑے سے آنسو بہا لینے سے۔
"ہر وقت کتابیں جو پڑھتی رہتی ہو۔ سر میں تو درد ہو گا ہی مطالعہ کم کرو، اور ریسٹ کرو۔" آپا نے اپنی لانبی انگلیوں سے سویٹر کی آستین مکمل کرتے ہوئے نصیحت کی۔
"اب کہاں پڑھتی ہوں کتابیں، اتنا تو کم کر دیا ہے۔" طیبہ نے دھیمے لہجے میں صفائی پیش کی۔

"اچھا، روزانہ دودھ کا گلاس لیا کرو۔ چہرہ دیکھو کتنا مرجھایا مرجھایا ہو رہا ہے۔"

"جی اچھا!" طیبہ کا دل بھر آیا۔ ایسی رقت طاری تھی کہ بات بات پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی کرتا تھا۔

کسی کا آنا بھی قیامت تھا۔ اور کسی کا جانا بھی قیامت ہو گیا تھا۔ وہ شرارتی آنکھیں جو اسے دیکھتے ہی چمکنے لگتی تھیں۔ وہ دور چلی گئی تھیں اور یہ تو نہیں تھا کہ وہ اچانک ہی بغیر بتائے غائب ہو گیا ہو۔ وہ تو بتا کر گیا تھا کہ اب اسے جانا ہی تھا مگر اس نے واپسی کی یقین دہانی بھی کی تھی۔ بہت جلد آنے کو کہا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا اور میرا انتظار کرنا، بہت جلد آؤں گا۔"

ایک سرمئی شام کو، وہ طیبہ کے ہاتھ میں بہت سارے وعدوں کے پھول تھما کر گیا تھا۔ وہ پھول ایک ایک کر کے مرجھا رہے تھے۔ طیبہ ان اداس پھولوں کو دیکھتی اور اس کی یاسیت میں اضافہ ہوتا جاتا۔

فرحی سے روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ادھر ادھر کی ہزاروں باتیں وہ کر جاتی۔ طیبہ ہوں ہاں کر کے اس کا ساتھ دیتی۔

"کیا بات ہے، تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی ہے؟"

"بول تو رہی ہوں۔" وہ زبردستی مسکراتی۔

"پہلے ایسے بولتی تھیں؟"

"پہلے؟ پہلے تو......" کوئی زندگی میں آ کے گیا نہیں تھا اور وہ گیا کہاں تھا یہیں رہ گیا تھا۔ طیبہ کے دل میں اس کے اندر اس کے آس پاس اس کے چاروں طرف۔

"پھر گم صم ہو گئیں؟ آخر تم کہاں کھو جاتی ہو؟"

"کہیں نہیں، یہیں ہوں تمہارے ساتھ۔"

طیبہ خود کو سنبھال ہی لیتی مگر لاکھ ہمت کرنے پر بھی وہ سوال نہ کر پائی اس خوش ادا کے بارے میں جو اس کی نیند، اس کا سکون، اس کی ہنسی سب ہی کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

فرحی بھی اس کے متعلق کبھی نہیں بتاتی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ ہاں بس کبھی کبھی باتوں کے دوران، کسی بات پہ کہہ اٹھتی منو بھائی یہ کہتے تھے نا؟ یا پھر منو بھائی کو بھی یہ پسند تھا نا؟ طیبہ تو جیسے اس کا نام سن کر ہی زندہ ہو جاتی تھی۔

ہاں بس ایک دن فرحی نے اس کے متعلق بتایا تھا۔ اس دن جب دو روز سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ خوب کھل کر برسنے کے بعد جب بادل ذرا تھمے اور آپا کے بنائے برسات کے پکوان بھی تیار ہو گئے تو انہوں نے طیبہ کو آواز لگائی۔

"یہ فرحی کے گھر تو دے آؤ، چچا تو انتظار کر رہے ہوں گے پکوڑوں کا۔" آپا نے بولتے ہوئے پکوڑوں کے علاوہ میٹھے پوڑے بھی ٹرے میں رکھے اور کروشیے کا بنا سفید ٹرے پوش اس پر ڈال دیا۔

طیبہ وہ ٹرے لے گئی۔ مگر دل انوکھی تال پہ دھڑکنے لگا، وہ بھی ایسا ہی دن تھا جب اس نے کہا تھا۔

"آپ کے ہاں کی چیزوں میں نمک بہت ہوتا ہے۔"

کسی کی یاد نے میٹھی میٹھی چٹکیاں لیں اور طیبہ بے چین ہو گئی۔ پکوان، چچی کے حوالے کر کے وہ فرحی کے پاس آ گئی۔

"یہ دیکھو، اس کا لہنگا کیسا لگے گا؟" ستاروں بھرا ایک چمکیلا نقرئی کپڑا فرحی کے ہاتھ میں تھا۔

"بہت خوب صورت ہے۔" طیبہ نے نرم و ملائم ہلکورے لیتے کپڑے پہ انگلیاں پھیریں۔

"اللہ کرے اگلے ہفتے تک تو بارش تھم ہی جائے ورنہ سب منو بھائی کو چھیڑیں گے کہ کتنی ہنڈیاں چاٹی تھیں؟" فرحی اپنی دھن میں بول رہی تھی۔ طیبہ نے متوحش ہو کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"ان کی بارات ہے نا اگلے ہفتے، بس سب کچھ اچانک اچانک ہی ہو گیا، کل تایا ابو کا فون آیا تھا۔

فون پر ہی دعوت دے دی اپنوں میں کارڈ کا تکلف کون کرتا ہے پھر۔"

فرحی الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے اسے بند کرتے ہوئے لگاتار بولتی رہی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ اس کی پیاری بیٹی، سنہری سے زرد ہو کر ایسا خزاں رسیدہ پتا بن گئی جو کسی بھی وقت ڈال سے گرنے والا ہو۔

☆☆☆

بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے زویا نے لکھے ہوئے لفظوں پہ نگاہ جمائی، اس کا دل یکا یک ہی دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

"ماں، آپ کو بہت غم ہوا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

ہاں ہوا تھا ایک ٹین ایج لڑکی کو اپنی پہلی اور نئی نویلی محبت میں ناکامی کا جتنا دکھ ہو سکتا ہے مجھے بھی ہوا تھا۔ راتوں کو تکیے میں منہ دے کر روتا، دن بھر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنا، کسی معجزے کا انتظار کرنا کسی انہونی کی امید رکھنا اسے بے وفا نہیں مجبور سمجھ کر محبت کا بھرم قائم رکھنا کہ۔ بے وفائی کا سوچ کر یہ دکھ اور بھی دو چند ہو جاتا۔

طیبہ نے یہ سب سوچا مگر بیٹی کے سامنے خاموش رہیں۔

"ماں، بتائیے نا؟" زویا نے اصرار کیا۔

"آگے کہانی لکھوں گی تو پڑھ لینا ہاں بس یہ ہے کہ دکھ ہوا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ زائل ہو گیا۔"

"کیا واقعی؟ محبت یا اس کا غم، وقت کے ساتھ ساتھ زائل ہو جاتا ہے؟" زویا بے یقین ہوئی، ماں کی زبان کچھ اور کہہ رہی تھی اور چہرہ کچھ اور۔

"سو جاؤ زویا، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" طیبہ نے دوسری طرف کروٹ لی۔ نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹی ان کے چہرے سے وہ سب کچھ بھانپ لے جسے وہ الفاظ کی صورت میں صفحات پر بھی نہیں اتارنا چاہتی تھیں۔

لاؤنج میں رکھا نیا صوفہ اور پورے لاؤنج کی تزئین و آرائش پچھلے ماہ ہی تبدیل کی گئی تھی۔ نئی نئی تبدیلی اور نئی نویلی آرائش دیکھنے میں بڑا اچھا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اس صوفے پہ بیٹھی خاتون جو بہت گوری اور ذرا فربہ تھیں اور جن کے بال جدید انداز میں ترشے ہوئے بہت مہنگی ڈائی سے مزین، بہترین تراش خراش کے لباس میں ملبوس، ان کے سامنے والے صوفے پہ شوہر اور بیٹا، بیٹھے ہوئے ان کی ڈانٹ کھا رہے تھے۔

"تم نے تو مجھے عاجز کر دیا ہے روزین! بالکل شاہ زیب کی طرح تنگ کرنے لگے ہو مجھے تم دونوں باپ بیٹے آخر چاہتے کیا ہو؟"

"سکون، جو اس گھر میں ملنے سے قاصر ہے۔"

شاہ زیب کے جواب نے خاتون کے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ وہ بے تحاشا بول رہی تھیں۔ جب روزین نے بیزار ہو کر انہیں ٹوکا۔

"ممی، آپ مجھے ڈانٹ رہی تھیں نا، پاپا کہاں سے بیچ میں آ گئے۔"

"یہی تو درمیان میں آ کر سارا کام خراب کر دیتے ہیں۔ اچھا بھلا عمر بلا رہا تھا تمہیں، باہر سیٹل ہو جاتے۔ لائف بن جاتی تمہاری پتا نہیں کیا پٹی پڑھائی ہے شاہ زیب نے، ڈوبتے جہاز میں اپنے ساتھ سوار کر لیا۔" صوفیہ انتہائی طیش میں بول رہی تھیں۔ انہیں شدید غم و غصہ تھا کہ روزین، بڑے بھائی کے پاس باہر جانے کے بجائے اپنے باپ کے چھوٹے سے اور ناکام بزنس کو سنبھالنے کے جتن کر رہا تھا۔

"پاپا کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ آپ پلیز پاپا کو بلیم مت کریں۔" روزین نے باپ کا دفاع کیا۔

"کیا سوچ کر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تم نے؟ جو کام تمہارے باپ سے نہیں ہوا، وہ تم سے کیا ہو گا؟ بے کار اپنا ٹائم اور لائف برباد کرو گے جیسے انہوں نے کی ہے بزنس کے پیچھے۔"

صوفیہ کے غصے میں طنز کا رنگ بھی شامل ہو گیا

جو انہوں نے اپنے شوہر پہ کیا تھا۔

"سچ ہے کہ میرا وقت اور زندگی دونوں برباد ہوئے ہیں مگر بزنس کے نہیں تمہارے پیچھے۔" شاہ زیب نے طنز کا جواب طنز سے ہی دیا۔

"فار گاڈ سیک پاپا اب آپ شروع ہو گئے۔" رودین جھلا گیا۔

"تمہاری ماں نے جھگڑا شروع کیا تھا، میں نے نہیں۔"

"میں اپنے بیٹے سے بات کر رہی تھی، آپ کو کیا ضرورت ہے بیچ میں بولنے کی۔" صوفیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آپ لوگ اطمینان سے بیٹھ کر جھگڑا کریں، میں جا رہا ہوں۔" رودین تنگ آ کر اٹھ ہی کھڑا ہوا۔

"لگتا ہی نہیں کہ ان دونوں نے لو میرج کی تھی۔" اپنے کمرے میں آتے ہوئے رودین سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن، اب سے پہلے کبھی اتنا قابل قدر اور محترم نہیں لگا تھا۔ جتنا کہ اب جاب کے دوران محسوس ہو رہا تھا۔ دوران طالب علمی تو چھٹی کا دن یوں ہی کرتا تھا دوستوں سے ملاقات کا ناغہ ہو جاتا تھا۔ مگر اب، اب پتا چلا تھا کہ چھٹی کے دن دیر تک سونا کتنی بڑی عیاشی ہے۔ کسل مندی سے کروٹیں لیتی ہوئی زویا نے ایک جماہی لی اور سستی سے اٹھ بیٹھی بال سمیٹ کر اونچی پونی بنائی اور بیڈ سے نیچے اتر آئی۔

ناشتا لے کر وہ لاؤنج میں طیبہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ جہاں وہ مٹر چھیل رہی تھیں۔

"آج کل رودین نظر نہیں آ رہا پہلے تو ہر ہفتے بھاگا بھاگا چلا آتا تھا۔" زویا نے سرسری سا پوچھا۔

"مصروف رہنے لگا ہے۔ بتا رہا تھا کہ اپنے والد صاحب کے ساتھ مل کر بزنس کر رہا ہے۔"

"اچھا!" زویا سلائس کترتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی بہت سارے خاموش لمحے ایک ایک کر کے گزرتے چلے گئے۔ مٹر چھل گئے تھے طیبہ نے چھلکے تھیلی میں ڈالتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔

"کیا ہوا، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی۔"

"جاب میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر، اتنی چپ چپ کیوں ہو؟"

"بس یونہی، کبھی خاموش رہنا بھی اچھا لگتا ہے۔" زویا نے چائے کا سپ لیا۔

"خاموشی اچھی لگنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔" طیبہ بڑبڑائیں۔

زویا اپنی ہی کسی ادھیڑ بن میں تھی، اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ ماں نے کیا کہا ہے۔

عجیب طبیعت ہو رہی تھی اس کی اور ویسا ہی عجیب مزاج چھٹی کا وہ دن جس کی پہلے تو بہت خوشی اور انتظار تھا، اب پہاڑ لگ رہا تھا جو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ماں کے ہاتھ کا بنا ذائقہ دار مٹر پلاؤ اور لذت بھرے شامی کباب بھی اس بے نام اداسی اور بے چینی کو دور نہیں کر سکے۔

"آپ کے ہاتھ کا مٹر پلاؤ اور کباب رودین کتنے شوق سے کھاتا ہے نا۔" زویا کو خیال آیا۔

"ہاں میرا خیال تھا کہ آج شاید وہ آ جائے مگر آیا ہی نہیں۔"

"فون پہ بھی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں ویسے وہ خود ہی کال کر لیتا تھا۔ وہ بھی نہیں کی میں نے ٹرائی کیا تھا، مگر فون بند جا رہا تھا۔" امی نے بتایا۔

"میں نے بھی کال کی تھی اسے مگر نہیں لگی، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔" زویا ہونٹ چبانے لگی۔ چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

"اس کا مسئلہ تو پتا چل جائے گا جب وہ آئے گا۔ تم بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" زویا نے اب ناخن چبانا شروع کر دیے۔

"زویا، ہاتھ منہ سے نکالو۔" ماں نے ڈانٹا۔

"سوری۔"

"چچی جان، بڑے مزے کی خوشبو آ رہی ہے۔" صحن سے ہمایوں شور مچا رہا تھا۔

"لو آ گیا ہدیدہ چٹورا۔"

"بری بات زویا، ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ وہ تو بچپن سے ہی یونہی آ رہا ہے۔"

"اب تو شادی ہونے والی ہے، سدھر جائے یا بیگم ہی آ کر سدھارے۔"

زویا بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی، سامنے ہمایوں کے ہمراہ رودین چلا آ رہا تھا۔ زویا کے چہرے کا رنگ اور تاثرات اتنی تیزی سے بدلے تھے کہ وہ خود حیران رہ گئی۔ یکا یک ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے چاروں طرف رنگ برنگی تتلیاں اڑ رہی ہوں۔

"تمہیں کیا ہوا؟ گم صم کیوں کھڑی ہو؟ بھینس چوری ہوئی ہے یا مرغی؟" ہمایوں نے اپنی دانست میں مذاق کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"شاید سب سے قیمتی شے چوری ہوئی ہے۔"

زویا نے ایک نظر رودین کو دیکھا جو طیبہ کو وضاحتیں دے رہا تھا کہ کئی روز سے کیوں غائب تھا۔

کچن سے مٹر پلاؤ اور تلے ہوئے شامی کبابوں کی خوشبو باہر صحن تک آ رہی تھی جہاں زویا بیٹھی تھی۔ بیزار تھا خاصی۔

"زویا کو کیا ہوا؟" رودین کو حیرت ہو رہی تھی۔

"تمہیں اب تک پتا نہیں چلا، اس لڑکی کے دماغ کا ایک پرزہ ڈھیلا ہے۔" ہمایوں جان بوجھ کر بلند آواز میں بول رہا تھا۔

"ایک؟ نہیں یار، ایک سے زیادہ ہیں۔"

رودین کی آواز بھی بلند اور یقین سے بھری ہوئی تھی۔ یقیناً دونوں جان بوجھ کے زویا کو تنگ کر رہے تھے۔

زویا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہاں سے تن فن کرتی اٹھی اور اندر سیدھی طیبہ کے پاس گئی۔

"ماں اگر ان دونوں نے مجھے مزید تنگ کیا نا تو اچھا نہیں ہوگا۔" بولتے بولتے زویا کی آواز رندھ گئی اور آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر کر چھلکنے کے قریب ہو گئیں۔

"زویا......" طیبہ حیران ہو گئیں۔

"کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" زویا یکا یک ہی رو پڑی۔

☆☆☆

وہ حیران تھی، بہت زیادہ، خود کو بے حد عملی اور حقیقت پسند سمجھتی تھی۔ مگر سمجھنے سے کیا ہوتا ہے اندر کہیں، ویسی ہی لڑکی چھپی بیٹھی تھی، جیسی کہ عموماً لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کسی خواب کے انتظار میں کسی تعبیر کی منتظر اکنامکس جیسا خشک مضمون پڑھ کر بھی ہری بھری وادیوں کا تصور چھپ کر کہیں بیٹھا تھا، جہاں راتوں میں جگنو رقص کرتے تھے اور دن میں تتلیاں اور پرندے منڈلاتے تھے۔

کئی برس نصاب میں تو ہندسوں کا حتمی اور قطعی مضمون پڑھا تھا۔ دو اور دو چار، چار اور چار آٹھ، اعداد و شمار کی بھول بھلیاں کی راہداریوں میں ایک جذبہ منڈلا رہا تھا۔ کسی سبک رو پرندے کی طرح جو کہیں پھنس گیا ہو اور باہر آنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔ پیچیدہ اعداد و شمار اپنی جگہ، زندگی کا گورکھ دھندا اپنی جگہ اور دل کی چالبازیاں اور قلابازیاں اپنی جگہ۔

زویا ششدر تھی، اپنی حالت پہ، اپنی کیفیت پہ اور اس الفت پہ جو نہ جانے کب اور کیسے چپکے سے گھات لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

کیا محبت ایسے بھی شروع ہوتی ہے۔ آنسوؤں سے؟ زویا نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اچھا ہوا کہ وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ ہاں یہاں کوئی نہیں تھا مگر کوئی تھا جو اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا۔ اس کے دھیان کی تتلی، زویا کے آس پاس اڑتی رہتی، کچھ یوں کہ وہ صرف نظر نہ کر سکی۔

زویا کو کمرے میں بیٹھے ہوئے سب کی

آوازیں آ رہی تھیں۔ ہمایوں، رودین اور طیبہ تینوں میں سب سے زیادہ ہمایوں ہی چہک رہا تھا۔ اس کی اگلے ماہ شادی تھی۔ اس کا چہکنا تو بنتا تھا زویا مجسم سماعت بنی رودین کو سن رہی تھی کہ اسے دیکھنا بھی اچھا لگنے لگا تھا اور سننا بھی، اس کا دل چاہا کہ وہ یونہی بیٹھی بیٹھی رودین کی آواز سنتی رہے۔

ذرا دیر میں چمچے اور پلیٹوں کے کھنکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمایوں اور رودین کھانا کھا رہے تھے ساتھ ہی گپ شپ بھی چل رہی تھی۔ ہمایوں کی بولتی بند نہیں ہو رہی تھی درمیان میں وقفے وقفے سے رودین کی مدہم آواز یا دھیمی سی ہنسی چہک اٹھتی اور اس وقت زویا پہ ایک انکشاف اور ہوا تھا۔

وہ رودین کم بولتا تھا یا شاید ہمایوں کی طرح باتونی نہیں تھا۔ وہ سوچے جا رہی تھی اور واقعہ یہ تھا کہ وہ رودین کو ہر وقت بری طرح سوچنے کے خبط میں مبتلا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شادی ہمایوں کی تھی، خود تو وہ پاگل ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی دیوانہ بنایا ہوا تھا۔ کمرے کی کلر اسکیم سے لے کر اپنی شیروانی کے ڈیزائن تک ہر معاملے میں مشاورت کے لیے وہ دوڑا دوڑا طیبہ یا زویا کے پاس چلا آتا۔

"توبہ ہے ہمایوں! تم یہ سب معاملات مہرین سے ڈسکس کیوں نہیں کرتے؟" زویا جھنجلا جاتی۔

"اس نے میری مرضی پہ چھوڑا ہوا ہے۔ جو بات پوچھو آگے سے کہتی ہے کہ جیسے تمہاری مرضی، جو تمہیں پسند ہو اور جب میں اپنی پسند اور مرضی چلاتا ہوں تو اس میں سو سو نقص نکالتی ہے۔"

"[illegible] تم دونوں ہی ذرا سے ہو" تو زویا فیصلہ صادر کرتی اور ان ہی تیاریوں اور مباحثوں میں شادی کا دن بھی آ ہی گیا۔

قرمزی اور نقرئی رنگوں کے امتزاج کا کام دار غرارہ سوٹ پہنے تیار ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لیتی زویا مسکرا دی۔ آئینہ اسے سراہ رہا تھا بارات جانے کے لیے تیار تھی۔ قریبی رشتے دار، محلے دار، اور کچھ دوست احباب، سب موجود تھے، دولہا میاں بھی شیروانی میں ملبوس، کلاہ سر پہ سجائے خوش بھی نظر آ رہے تھے اور نروس بھی۔

زویا کی نگاہیں رودین کو ڈھونڈ رہی تھیں اور بالآخر وہ آ ہی گیا۔ موتیا رنگ کے کرتا شلوار اور اسٹائلش ویسٹ کوٹ میں ملبوس، بالوں کو ہیئر جیل سے سیٹ کیے اپنے دمکتے چہرے اور اسمارٹ سراپے کے ساتھ وہ کافی ڈیشنگ لگ رہا تھا، زویا سے سامنا ہوا تو وہ ٹھٹک گیا۔

"زویا! یہ تم ہو؟" اس کی نگاہوں میں بے یقینی اور حیرانی تھی۔ جو زویا کو بہت اچھی لگی۔

"جی ہاں یہ ہم ہیں۔" اس نے تفاخر سے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے اس کی سماعتوں نے جو سنا وہ بڑا اشاکنگ تھا۔

"توبہ ہے زویا! کس قدر میک اپ کرتی ہو تم لڑکیاں؟ بالکل ہی شکل بدل گئی، لگ ہی نہیں رہا کہ یہ تم ہو۔"

"اب اتنا بھی میک اپ نہیں ہے کہ جیسے تم بیان کر رہے ہو۔" زویا تو پھٹ ہی پڑی۔

"ہمیں دیکھو، بغیر کسی اہتمام کے بھی ہینڈسم اینڈ بوسم۔" رودین کے لہجے میں بڑا فخر تھا۔ زویا اور بھی سلگ اٹھی۔ ایک قدم آگے بڑھی اور رودین کے چہرے پہ نظر جمائی۔

"رودین، تم نا۔۔۔ بالکل زہر لگ رہے ہو۔"

"اچھا جو تمہاری تعریف نہ کرے وہ زہر لگنے لگ جاتا ہے تمہیں؟" رودین اس کے چڑنے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"بہت ہیں میری تعریف کرنے والے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔" زویا ایڑیوں کے بل گھوم گئی۔

"ارے، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہی ہو۔" رودین حیران ہو گیا۔

"اونہہ!" زویا اس کی بات سنے بغیر ہی آگے

بڑھ گئی۔ بارات چلی گئی نکاح بھی ہو گیا۔ فوٹو سیشن ہی ہوتا رہا۔ زویا تمام وقت رودین کو نظر انداز کرتی رہی۔

"زویا۔" بالآخر رودین، اس کے پاس آیا۔ آرائش گل کے پاس کھڑی وہ اپنی سیلفی لے رہی تھی۔

"ہوں۔" زویا نے بے اعتنائی کی نظر ڈالی۔

"آئی ایم سوری میں مذاق کر رہا تھا، تم مائنڈ کر گئیں۔" رودین کا لہجہ سچ مچ معذرت خواہانہ تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" زویا نے گویا اس کی معذرت قبول کر لی تھی۔ مگر وہ مسکرائی ابھی نہیں تھی۔ رودین نے اس کے چہرے پر چھائی خفگی محسوس کی۔ زویا کا ناراض چہرہ اسے بے چین کرنے لگا۔

"تم سچ مچ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بلیو می۔"

"واقعی؟" زویا نے پلکیں اٹھائیں۔

"ہاں بالکل، بہت اچھا میک اپ کیا ہے جس نے بھی کیا ہے؟" رودین نے لاعلمی اور بے ساختگی میں پھر غلطی کر دی۔ جس کا احساس اسے فوراً ہی ہو گیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"میک اپ اچھا ہے۔ اس کا مطلب...... سارا کمال میک اپ کا ہے؟" زویا کی بھنویں تن گئیں۔

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ دراصل مجھے لگا کہ......"

"تمہیں یہ لگا رودین! چونکہ میرا میک اپ بہت اچھا ہوا ہے اس لیے میں پیاری لگ رہی ہوں۔ کیونکہ ویسے تو میں پیاری ہوں ہی نہیں۔ ایک بہت عام سی، آرڈینری سی لڑکی ہوں، ہے نا؟"

"تمہارا جھگڑا کرنے کا موڈ ہو رہا ہے؟" رودین نے بے چارگی سے سوال کیا۔

"یہ موڈ تم نے کری ایٹ کیا ہے۔"

"مگر کوئی نہیں، میں تو پہلے بھی مذاق کرتا تھا، تم نے اس طرح تو کبھی ری ایکٹ نہیں کیا۔" رودین نے صفائی پیش کی۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" زویا جھلا گئی۔

"ہو گیا ہے؟ کیا مطلب؟" رودین نے ٹوک زبان پہ آئے ہوئے لفظوں کو بیچ میں ہی کہیں نگل کر اندر کیا۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟" رودین اتنا تو جانتا تھا کہ وہ بھوک کی کچی ہے۔

"ہاں!" زویا نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"زویا! کیسی ہو؟" باپچی کا تھی ایک فربہ خاتون نے چلتے چلتے ٹھہر کر غور سے زویا کو دیکھا پھر گلے لگ گئیں۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟ اتنی دیر لگا دی آنے میں؟" زویا مسکرا کر ان سے مخاطب ہوئی۔

"یہ دیر سے آتے ہیں نا آفس سے، اس لیے لیٹ ہو گئے۔ تم سناؤ، بڑی حسین لگ رہی ہو، کون سے پارلر سے تیار ہوئی ہو؟"

رودین نے اپنے بے ساختہ ابلتے قہقہے کا گلا گھونٹا اور وہاں سے کھسک لیا۔ زویا کا ردعمل دیکھنے کی تاب نہیں تھی اس میں۔

☆☆☆

اسکائپ کے ذریعے تقریباً روز ہی بات ہوتی تھی۔ طیبہ نے وہ مہربان چہرہ دیکھا اور مسکرا دیں۔

"بس یہی مسکراہٹ یہاں صبح سے رات اور رات سے صبح میرے لیے آسان کر دیتی ہے۔"

"پھر ہو گئے شروع۔" طیبہ کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"کیوں شروع نہ ہوں تو یہ دن کیسے ختم کریں گے میری جان!"

"مجھے اگر علم ہوتا کہ میری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ اس مشکل میں پڑ جائیں گے تو میں۔"

"خواہش نہیں، خوشی، تمہاری خوشی کو پورا کیا ہے اور اس سے، مجھے کتنی خوشی ملی، تم کیا جانو پگلی؟"

"یہ پگلی سب جانتی ہے جناب۔"

"مجھے بھی یہی شک تھا۔" وہ طیبہ کے ساتھ

ہنسے۔

"زویا کیسی ہے؟ دو روز سے بات نہیں ہوئی؟"

"سو گئی ہے جب سے جاب کرنے لگی ہے۔ رات میں جلدی سو جاتی ہے۔" طیبہ نے وضاحت کی۔

"خیال رکھنا اپنا بھی اور زویا کا بھی۔" کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد احمد نے حسب معمول تاکید کی اور فون آف ہو گیا۔

"ایک سال دو ماہ چودہ دن گزر گئے۔ دس ماہ باقی ہیں پھر آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔" موبائل اسکرین پر احمد جمیل کی تصویر دیکھتے ہوئے طیبہ مسکرا دیں۔

صبح زویا کو بتایا تو انڈے سلائس کا لقمہ لیتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا۔

"مجھے اٹھا دیتیں آپ۔" اس کے انداز سے بے چینی چھلک رہی تھی۔

"رات میں کال کر لینا۔ وہ انتظار کریں گے تمہاری کال کا۔" طیبہ نے تھپکی دی۔

"آئی مس ہم ویری مچ۔"

"میں بھی بہت مس کرتی ہوں۔" طیبہ نے دل ہی دل میں کہا۔

"آپ بھی بہت مس کرتی ہیں نا بابا کو؟"

"ہاں، اور اب جلدی کرو، ورنہ کل کی طرح لیٹ ہو جاؤ گی۔"

"جی!" زویا نے جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔

دن بھر ملازمت کی مصروفیت کے دوران بھی رودین کا خیال پل پل اس کے ہمراہ رہا۔

پتا نہیں کیا کر رہا ہوگا اس وقت؟ کسی بھی لمحے وہ اسے سوچتے سوچتے خود سے سوال کرتی۔

شاید بہت مصروف ہو یا کسی سے بات کر رہا ہو یا کسی بات پر مسکرا رہا ہو یا شاید خاموش ہو، کچھ سوچ رہا ہو۔ شاید میرے بارے میں؟ زویا کا دل خوش فہم ہوتا۔ اب تو کئی اتوار گزر چکے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔

"کیا پتا اسے کوئی۔" کوئی انہونی سوچتے ہوئے اس کا دل اک لمحے کو دھڑکنا ہی بھول جاتا۔

پہلے کبھی کال کر کے ہیلو ہائے کر لیتا تھا۔ خیریت پوچھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں۔

کون جانے کیا ہے اس کے دل میں اور زندگی میں؟" زویا حقیقت پسند اور بہادر بننے کی کوشش تو کرتی تھی مگر بنا نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

موسم بہت پیارا ہو رہا تھا۔ نہ سردی، نہ گرمی، ہوا بھی خوش گوار تھی اور مزاج بھی، مگر اداسی کے رنگ زویا کے اندر تک اترے ہوئے تھے۔

طیبہ نے موقع غنیمت جان کر اس کے سر میں خوب سارا تیل ڈال کر کس کے چٹیاں باندھ دیں۔ پہلے کی زویا ہوتی تو خوب شور مچا کر سر ہلا ہلا کر ماں کو زچ کرتی مگر آج خلاف توقع خاموشی سے اپنی درگت بنواتی رہی۔

لاؤنج میں تخت پر آنکھیں موندے لیٹی تھی جب طیبہ کی پرجوش آواز کے ساتھ رودین کی دھیمی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی وہ اندر نہیں آیا باہر صحن میں ہی بیٹھا طیبہ سے باتیں کر رہا تھا۔

زویا دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر آ گئی۔

"کیسی ہو زویا؟" اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

"ٹھیک ہوں۔" زویا نے اپنا آپ اور چادر سنبھالتے ہوئے مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"رودین! کھانا کھاؤ گے یا چائے کافی؟" امی نے آداب میزبانی سنبھالے۔

"صرف کافی اور وہ بھی اسٹرانگ۔"

"کیا اچھی لگتی ہے۔ تم لوگوں کو یہ کڑوی کافی؟" امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بعض کڑوی چیزیں بھی مفید ہوتی ہیں۔" رودین مسکرایا زویا بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور طیبہ کے

پیچھے کچن میں جانے لگی۔
"زویا!" رودین نے اسے پکارا۔
"کیا ہے؟" وہ پلٹی اس کے قریب ہی دیوار پر گل مہر کی گھنی بیل جھکی کھڑی تھی۔ نارنجی پھولوں کے گچھے ہوا میں جھول رہے تھے۔
"مجھے ایک بات کہنی تھی تم سے۔" رودین اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں جھجک تو نہیں مگر سنجیدگی ضرور تھی۔
"کیا؟"
"مجھے لگتا ہے کہ آئی ایم فال ان لو" (مجھے محبت ہوگئی ہے) رودین نے انگریزی کا سہارا لیا۔
زویا کی سانس رک گئی۔ "کس سے؟"
"میں بہت بری طرح تمہیں مس کرنے لگا ہوں، تمہیں نہ دیکھوں بات نہ کروں تو وقت ہی نہیں گزرتا۔
آئی ایم سوری مجھے بہت خوب صورت ڈائیلاگز نہیں بولنے آتے مگر بس یہی سچ ہے کہ تم میرے لیے ایک بہت اہم بہت خاص ہوگئی ہو، زندگی کا ہر موسم تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، اپنا سب کچھ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"
رودین خاموش ہوگیا۔ زویا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ گھنی بیل کے جھرمٹ سے ایک پھول گرا۔ رودین کے کندھے سے ہوتا ہوا نیچے گر پڑا۔
"تم یہ سب یاد کر کے آئے تھے؟"
"یاد تو نہیں کیا تھا۔ ہاں سوچا بہت تھا کہ تم سے کیا کہوں گا؟ کیسے کہوں گا؟ دراصل بات شروع کرنا ہی بہت مشکل لگ رہا تھا۔ مگر جب ایک بار بولنا شروع کیا تو۔
تم مس کرتی ہونا مجھے بہت زیادہ؟" رودین نے بڑے یقین سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"کون میں! ہرگز نہیں۔" زویا صاف مکر گئی۔
"جھوٹ مت بولو، تمہاری فیلنگز بھی وہی ہیں جو میری ہیں۔" وہ اتنے اعتماد کے ساتھ بول رہا تھا کہ ایک لمحے کو زویا چکرا گئی۔

"تم سے کس نے کہا؟"
"تمہارے دل نے۔"
"اور تمہیں خبر ہے میرے دل کی؟"
"تھوڑی تھوڑی؟"
"اب تم ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"
"تم میرا انتظار کرتی تھیں نا؟" رودین کی سوئی ابھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
"میں کیوں کرتی تمہارا انتظار؟" زویا نے پھولوں سے لدی بیل پر ہاتھ رکھا۔
"کیونکہ مجھ سے ملنے کو اور بات کرنے کو تمہارا دل بھی چاہتا تھا۔"
اور تمہیں یہ یقین کس نے دلایا؟
"تمہاری آنکھوں نے تمہارے چہرے نے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھنے لگا ہوں زویا!"
"رودین! تمہاری کافی تیار ہے۔" اندر سے طیبہ نے آواز دی۔
"میں وہیں آ رہا ہوں۔" رودین نے جاتے جاتے زویا پہ ایک نظر ڈالی، اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور زویا کے چہرے پر حیرانی۔

☆☆☆

شام دھیرے دھیرے اپنے پنکھ پھیلا رہی تھی۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی۔ وہ اکثر تصور کرتی تھی کہ رودین اس کے سامنے اعتراف کر رہا ہے۔ حال دل بیان کر رہا ہے اور جب سچ مچ ایسا ہو ہی گیا تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
"کہیں اس نے مذاق نہ کیا ہو؟" زویا کے دل میں شک نے سر اٹھایا۔
"نہیں...... نہیں...... وہ اس طرح کا مذاق نہیں کر سکتا۔ پچھلے کئی برسوں سے جانتی ہوں اسے، وہ ایسا نہیں ہے۔" دماغ نے دل کو جھٹلایا۔
اچانک ہی کسی نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا اور ساتھ ہی کسی گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی تیز آواز

آئی۔ زویا کی چیخ نکل گئی۔ اپنے حواسوں میں آ کر اس نے ارد گرد دیکھا۔

"یہ ایک معروف روڈ ہے ٹریفک سے فل، آپ کے گھر کا لان نہیں ہے جو اتنے مزے سے یہاں چہل قدمی کر رہی ہیں۔"

وہ ایک ادھیڑ عمر صاحب تھے۔ قریباً پچپن کے مگر اچھے خاصے اسمارٹ اور سوبر، انہوں نے زویا کا بازو چھوڑ دیا تھا اور اب اسے مزید ڈانٹ رہے تھے۔

"کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں آپ، ابھی گاڑی کے نیچے آ جاتیں۔"

"سوری انکل!" زویا سچ مچ سراسیمہ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ اپنے خیالوں میں واقعی اتنی گم ہو گئی تھی کہ اسے علم ہی نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ مہربان صورت انکل اس وقت اس کا بازو پکڑ کر نہ ہٹاتے تو وہ گاڑی سے ٹکرا گئی ہوتی۔

"آیئے میں چھوڑ دیتا ہوں، کہاں جائیں گی؟" ان صاحب نے زویا کا چہرہ دیکھا جس پر خوف بھی تھا اور پریشانی بھی۔

"زیادہ دور نہیں ہے پندرہ، بیس منٹ کی واک ہے یہاں سے میں اکثر پیدل ہی چلی جاتی ہوں۔"

"اس وقت تو پیدل چلنا آپ کے لیے خطرے سے خالی نہیں، جب دماغ میں نہ جانے کیا چل رہا ہو۔" انہوں نے بولتے بولتے قریب کھڑی کار کا دروازہ کھولا۔

زویا نے تذبذب سے انہیں اور پھر گاڑی کو دیکھا۔

"بلیو می، میں ایک شریف انسان ہوں۔" انہوں نے زویا کی ہچکچاہٹ محسوس کی۔

"ماں نے منع کیا ہے کبھی کسی اجنبی سے لفٹ نہیں لینا۔"

"ہوں!" انہوں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ "مگر میں اجنبی تو نہیں ہوں، ابھی ابھی پانچ منٹ۔ پہلے میں نے آپ کی جان بچائی ہے۔" وہ اب ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔

زویا نے کچھ سوچا اور پھر اس سے کار کے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی تک ماں کی نصیحتوں پر عمل کرتی ہیں؟" روڈ کی دوسری سائیڈ پر آنے کے لیے وہ بہت لمبا یوٹرن لے رہے تھے۔

"ابھی تک، مطلب؟" زویا نے بھنویں اچکائیں۔

"بڑے ہو کر بچے اپنی من مانی کرتے ہیں، والدین کی نصیحتیں کیسے یاد رہتی ہیں؟"

"مجھے ان کی نصیحتیں یاد رہتی ہیں۔ ان پر عمل کرتی ہوں۔"

"کبھی اپنی من مانی بھی کر لیتی ہوں، یہاں سے لیفٹ۔" اپنے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے زویا نے راستہ بتایا۔

"یہ بڑا جانا پہچانا بلکہ مانوس علاقہ ہے۔"

"بس یہیں روک دیجیے آگے کھدائی ہو رہی ہے۔ گاڑی نہیں جا سکتی۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"اچھا!" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہاں سے ذرا آگے کھدی ہوئی سڑک نظر آ رہی تھی۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" زویا نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ابھی اتری نہیں تھی۔

"زہے نصیب، آج سے تیس پینتیس برس پہلے کسی پیاری ہستی سے یہ فقرہ سنا ہوتا تو خوشی سے دل دھڑکنا ہی بھول جاتا شاید، اب تو عمر کی شام ہے؟" وہ شرارت سے مسکرائے۔

زویا بھی مسکراتی ہوئی اتر آئی۔ دوبارہ شکریہ ادا کیا۔

"دیکھو احتیاط سے جانا، غالباً کافی بڑے بڑے اور گہرے کھڈے ہیں۔" وہ بے حد اپنائیت

اور فکر مندی سے بول رہے تھے۔
زویا تسلی آمیز کلمات کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

جامن کے درخت پر چڑیا شور مچا رہی تھیں۔
امی اپنے دل پسند مشغلے یعنی باغبانی میں لگی ہوئی تھیں۔ بیلوں اور پودوں کی کاٹ چھانٹ سے فارغ ہو کر وہ ایک پودے کی طرف متوجہ تھیں جسے چیونٹیاں لگ گئی تھیں۔ اندر زویا تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑی بی بن کر بیٹھی تھی۔ موبائل سامنے رکھا کانوں میں ہینڈز فری لگے ہوئے تھے دوسری طرف رودین تھا۔

"ویسے ایک سال پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میری لائف میں اتنی اہمیت اختیار کر جاؤ گی۔ یعنی تم زویا جس کی بعض باتیں مجھے بری طرح چڑاتی تھیں۔"

"ویسے تم بھی کبھی کبھی زہر لگتے تھے اور کبھی بہت برے میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم یعنی کہ تم رودین شاہ، میرے لیے یوں اہم بن جاؤ گے۔" زویا نے اسی کی ٹون میں ویسا ہی جواب دیا۔

"دیکھو تمہاری یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی، تم فوراً لڑنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔"

"اور تم تو جیسے آنکھیں بند کیے سستی کاہلی سے پڑے رہتے چپ چاپ خاموش، اللہ میاں کے بیل۔" زویا اس کی ان رومنٹک باتوں پر تپ ہی گئی۔

"بعد میں بھی یونہی آستین چڑھا کر جھگڑا کرو گی؟" رودین کی آواز مدھم ہو گئی۔

"بعد میں کب؟"

"شادی کے بعد، ویسے تمہارے بابا تو مان جائیں گے نا؟ آنٹی کی خیر ہے۔ انہیں تو میں یوں منا لوں گا چٹکی بجاتے ہی۔"

"پہلے ان کی بیٹی کو تو منا لو۔"

"بیٹی تو پہلے ہی مانی ہوئی ہے۔ بس ایویں نخرے دکھانے کی عادت ہے۔"

"میں لڑاکا ہوں، نخرے باز ہوں، چڑانے والی باتیں کرتی ہوں پھر بھی دل مجھ پر آ گیا؟"

"تب ہی دل کو پاگل، دیوانہ کہتے ہیں، عقل سے تھوڑی کام لیتا ہے۔" رودین کی آواز میں شرارت تھی۔

"تمہیں ڈھنگ کی باتیں کرنی نہیں آتیں؟" زویا نے کلس کر سوال کیا۔

"ڈھنگ سے مراد؟"

"تھوڑی تعریف نہیں کر سکتے میری؟"

"وقت آنے دو، سامنے بٹھا کر تعریف کروں گا اور بہت خوب کروں گا۔"

اف، رودین کے یوں اچانک رومنٹک ہونے پر زویا کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

"ہیلو کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئیں؟"

"کچھ نہیں۔" زویا نے خود کو سنبھالا۔

"عجیب لڑکی ہو، رومنٹک ہو جاؤ تو شرماتی ہو، نہ ہو تو لڑنے لگتی ہو؟ کیا کروں میں؟"

"اس وقت تو فون آف کرو، خدا حافظ!"

زویا نے جھٹ سے لائن کاٹ دی، ہینڈز فری کانوں سے نکال کر سامنے ڈال دیے اور مسکرانے لگی۔

"رودین شاہ، میں عجیب نہیں ہوں، بہت ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

☆☆☆

ٹھنڈی ہواؤں نے ڈیرے ڈال دیے تھے شہر میں ایسی ہوا تھی جو چہروں کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی گدگداتی ہوئی گزر رہی تھی۔ زویا نے اپنا مخملیں اسکارف ٹھیک کیا۔ بیگ کندھے پر جمایا اور ہاتھ سویٹر کی جیب میں ڈال سڑک کے کنارے کنارے چل پڑی۔ جہاں ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

"ہیلو پریٹی گرل!" اس کے قریب گاڑی آ کر رکی تھی۔

زویا چونک پڑی۔ پھر کھڑکی سے باہر نکلے چہرے پر نظر پڑی تو مسکرا دی۔

”ہیلو انکل!“

”آج پھر واک ہو رہی ہے؟“

”اچھا لگتا ہے سر!“

”آجاؤ، میں چھوڑ دیتا ہوں۔“ انہوں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

گرے کوٹ پر انہوں نے مفلر گلے میں ڈالا ہوا تھا گرے اور بلو امتزاج کا مفلر، کچھ پرانا اور اولڈ فیشنڈ لگ رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں وہ زویا کو اچھا لگا۔

”آپ کا مفلر اچھا لگ رہا ہے۔“

”تھینک یو!“ انہوں نے نرمی سے اسے چھوا۔ ”کسی نے تحفہ دیا تھا کبھی۔“

”اوہ سم ون اسپیشل؟“ زویا ایکسائیٹڈ ہو کر بولی۔

”ہوں!“ انہوں نے اچانک ہی لب بھینچ لیے اور خاموش ہو گئے۔ گاڑی رک گئی، یہاں زویا کو اترنا تھا۔

”جانتی ہو، تمہیں پہنچانے کے بہانے میں بار بار اس علاقے میں خود آتا ہوں۔ یہاں سے کچھ یادیں جڑی ہیں میری۔“

ان کی آواز بوجھل اور اداس تھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے زویا کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔

”کیسی یادیں؟“ زویا کی نگاہیں ان کے چہرے پر گڑی تھیں۔۔ وہ چہرہ جو ملول بھی لگ رہا تھا اور کچھ شرمندہ بھی۔

”کچھ نہیں، بس یونہی۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے اور مسکرائے۔

”خیال سے جانا۔“ انہوں نے حسب معمول تاکید کی۔

”گھر چلیں انکل! آپ کو چائے پلائیں گے ہم۔“ زویا نے کچھ سوچ کر انہیں پیش کش کی۔

”چائے؟“ اگلی بار سہی۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ زویا آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

لاؤنج میں ٹی وی تو چل رہا تھا دیکھ کوئی نہیں رہا تھا آواز ریموٹ سے بند کی ہوئی تھی۔

رودین نے گرم اور زرا تلخ کافی کا گھونٹ بھرا اور مگ میز پر رکھا۔ سامنے صوفے پر شاہ زیب نے سگریٹ سلگا رکھی تھی۔

”ڈاکٹر نے منع کیا ہے ڈیڈ نو اسموکنگ؟“

”ایک آدھ سے کیا فرق پڑتا ہے یار!“ رودین باپ کی عادت سے خوب واقف تھا۔

”چھوڑو یار یہ بے کار کی باتیں۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے؟“

”مجھے بھی ایک ضروری بات کرنی تھی آپ سے؟“

”میں باپ ہوں تمہارا اس لیے پہلے میں کہوں گا؟“ شاہ زیب نے سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں بجھایا اور بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”میں نے ایک لڑکی پسند کی ہے۔“

”ڈیڈ، کیا ہو گیا آپ کو؟ اس عمر میں یہ حرکت؟“ رودین کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”اپنے لیے نہیں گدھے تمہارے لیے۔“

”مگر میں آل ریڈی ایک لڑکی چوز کر چکا ہوں۔“

”کون ہے؟“

”میری کلاس فیلو ہے، اچھی ہے آپ ملیں گے تو آپ کو پسند آئے گی ضرور۔“

”آر یو سیریس؟“ شاہ زیب نے بیٹے کو جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

”آف کورس ہنڈریڈ پرسنٹ۔“

”ٹھیک ہے پھر اس کو میں اپنی بڑی بہو بنا لوں گا۔“ شاہ زیب نے فیصلہ کیا۔

”پہلے بھیا اور ممی سے تو پوچھ لیں۔“

"ہاں بھئی سب سے پوچھیں گے۔ اس لڑکی سے بھی پوچھیں گے اس کی مرضی کیا ہے؟"

"ویسے ہے کون؟" آفس میں تو ایسی کوئی نہیں ہے جو۔" روودین نے تجسس سے باپ سے سوال کیا۔

"ہے کوئی ملواؤں گا تمہیں بھی، پہلے میں خود اس کی فیملی سے مل لوں۔"

"ریئلی ڈیڈ؟"

"آف کورس ہنڈرڈ پرسنٹ۔"

☆☆☆

موسم بڑا خوب صورت ہو رہا تھا۔ بارش سے پہلے ہی ٹھنڈی معطر ہوا۔ بھیگی بھیگی سی ہر لمحے یوں لگتا کہ بس اب دھیمی دھیمی پھوار برسنے لگی گی۔

"اللہ کرے بارش ہو جائے تو مزا ہی آ جائے۔" سوندھی خوشبو لیے ٹھنڈی ہوا چہرے سمیت تمام وجود کو سرشار کرتی گزر رہی تھی۔ زویا آج بڑی ترنگ میں تھی۔

گاڑی اس کے قریب رکی تو وہ ٹھہر گئی۔ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ بہت خوش لگ رہی ہو آج؟"

"کیونکہ آج موسم بہت حسین ہے، بادل، ہوا، آسمان زمین، پھول، درخت، گھاس سب مسکرا رہے ہیں۔ اس لیے ہم بھی مسکرا رہے ہیں اور ویسے آج ہم نے موسم کی عنایت سے سموسے بھی کھائے اور آج محسوس ہوا کہ سموسہ کھا کر چائے پینا بھی کتنی بڑی خوشی ہے۔"

"اچھا تو سموسے اور چائے خوش ہونے والی انوکھی لڑکی آج ہم تمہارے گھر چائے پئیں گے اور برسات کے پکوڑے بھی کھائیں گے۔" ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو گئی ہے۔ شاہ زیب نے ونڈ اسکرین کے وائپر چلائے۔

"چائے تو مل جائے گی اور پکوڑے بھی مل سکتے تھے اگر یہ پھوار یہ بھیگا بھیگا موسم نہ ہوتا تو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ...... کہ ......" زویا روک کر سوچنے لگی کتنا عجیب لگے کسی اجنبی کے سامنے یہ کہنا کہ ماں پورے سال کسی بھی دن پکوڑے بنا سکتی ہے سوائے برسات کے دن۔

"برسات میں ہمارے گھر بابا پکوڑے بناتے ہیں۔ اگر وہ گھر پر ہوں تو ورنہ بازار سے آتے ہیں۔" زویا نے آدھی حقیقت بیان کی۔

"تو آج بابا کہاں ہیں؟"

"مسقط میں، دو سال کے لیے گئے تھے۔ ڈیڑھ سال ہونے والا ہے۔"

"کیا کرتے ہیں تمہارے والد؟"

"آرکیٹیکٹ ہیں؟"

شاہ زیب نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی، لاک کیا اور زویا کے ساتھ پیدل مارچ کرنے لگے سڑک کے گڑھے کچھ بھر چکے تھے۔ کچھ باقی تھے۔ شاید الیکشن قریب آنے کے منتظر تھے۔

"ابھی ایک گورنمنٹ اسکول آئے گا۔ پھر ایک مسجد، اس کے برابر گلی میں، میرے ماموں رہتے تھے۔ ان کے گھر کے سامنے بہت گھنا نیم کا درخت تھا۔" شاہ زیب اس کے ساتھ چلتے چلتے کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ زویا کس بری طرح چونکی تھی کچھ وقت کے لیے اس کے قدم سست ہوئے۔

"جب میں چھوٹی تھی تو بہت اچھلتی تھی بابا نے میرا نام اسپرنگ رکھا ہوا تھا۔ ویسے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میں اپنے گھر میں انگلش والی سپرنگ (بہار) بھی ہوں۔"

"اور میں جب چھوٹا تھا تو بہت بولتا تھا، میری نانی نے میرا نام مشور رکھا ہوا تھا۔"

زویا کے بے یقین قدم وہیں تھم گئے۔

☆☆☆

شام کی دھیمی دھیمی پھوار، رات ہوتے ہوتے تیز بارش میں بدل گئی تھی۔ ٹھنڈک بڑھ گئی

تھی اور تاریکی بھی باہر آسمان سیاہ تھا۔ کمرے میں مگر نیلگوں روشنی تھی۔ زویا بہت دیر سے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔

"ماں! آپ اپنی کہانی کب مکمل کریں گی؟ کئی ماہ سے ادھوری ہے۔"

"کرلوں گی جب بھی کوئی مناسب اختتام ذہن میں آئے گا۔"

"آپ کیسا اختتام چاہتی ہیں؟"

"ایسا، جسے پڑھ کر میرا قاری زیادہ دکھی نہ ہو، زندگی میں پہلے ہی بہت غم ہیں، کہانیوں میں بھی یہی دکھ اور پریشانیاں ہوں تو بے چارے قارئین کہاں جائیں؟"

"تو آپ حقیقت کے بجائے اپنی مرضی کا وی اینڈ کریں گی؟"

"درست سمجھی ہو۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"جب تم کچھ کہنے سے پہلے اجازت لیتی ہونا تو میں ڈر جاتی ہوں زویا!"

"میں سیریس ہوں ماں! مجھے یہ پوچھنا تھا کہ اگر اس کہانی کا "وہ کردار" اب بھی آپ کے سامنے آجائے تو؟"

"تو کچھ نہیں ہوگا۔ گزرا وقت انسان کے سامنے آجائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زندگی بدلتی ہے ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک مخصوص وقت کے جذبات احساس، خوشی، غم سب کچھ وہ نہیں رہے۔ پھر بھی تھے۔ آج کا شاہ زیب، آج کی طیبہ کے لیے اتنا اہم، اتنا خاص نہیں ہوگا۔ جیسا بھی تھا۔"

"مگر کوئی کسک، چبھن، درد، کچھ تو ہوگا؟" زویا نے پھر سوال کیا۔

"ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے ملال بھی افسوس بھی کہ ہم نے اپنے قیمتی جذبات اور آنسو، کہاں ضائع کیے، جہاں خود پر ملال ہو، وہاں نہ درد رہتا ہے۔ نہ کسک، نہ ہی چبھن، ماضی کی الفت ایک ایسی پرچھائیں ہے جو انسان کے پیچھے پیچھے ہوتی ہے جب بھی مڑ کر دیکھو تو یاد آجاتی ہے۔ نہ دیکھو تو دکھائی نہیں دیتی۔"

"تو پھر یہ محبت تو نہیں ہے۔" زویا بے یقین ہوئی۔

"تمہارے ذہن میں محبت کا روپ کیا ہے؟" ہجر، جوگ، فراق، آنسو۔ درد اور تنہائی؟ اگر الفت میں ناکامی ہو تو جوگ لے لیا جائے؟ تنہائی اور درد کی سزا خود کو دی جائے؟ کوئی محبت ایسی بھی ہوتی ہے جو وقت کے پانیوں میں بہہ جاتی ہے تو اسے بہہ جانے دو اپنی آنکھوں کا پانی بنا کر کیوں رکھیں؟"

"آپ حقیقت پسند ہیں؟"

"میں قدر دان ہوں، اس خلوص کی، اس چاہت کی، اس مان اور بھروسے کی جو تمہارے بابا نے مجھے دیا۔ ایک عورت کو، جتنی اہمیت، عزت اور محبت چاہیے ہوتی ہے وہ مجھے ملی ہے پھر میں ماضی کی پرچھائیں کیوں دیکھتی رہوں؟"

"اور اگر......دوسری طرف کوئی کسی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہو تو؟" زویا نے رک رک کر سوال کیا۔

"تو یہ اپنی شرمندگی اور ندامت کو چھپانے کا کیموفلاج ہوسکتا ہے اور ناسٹلجیا (ماضی پرست) بھی کہ بعض دفعہ انسان اپنے ماضی میں رہنے کا شوقین اور تمنائی بن جاتا ہے۔"

زویا چپ چاپ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ جانے کب نیند آئی صبح اس نے آفس سے چھٹی کرلی۔ آج کے دن سمیت آنے والے بہت سارے دن اس کے لیے ڈھیروں بے چینیاں، اداسیاں اور پریشانیاں لانے والے تھے۔

☆☆☆

بالوں میں برش پھیرتے ہوئے صوفیہ نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ گوری چمکتی ہوئی رنگت وقت کے ساتھ ذرا ماند پڑ گئی تھی۔ عمر کی بے رحم لکیروں نے پیشانی آنکھوں کے گرد، ہونٹوں کے

آس پاس اور گردن پر اپنی جگہیں بنائی ہوئی تھیں۔
"تو زندگی کا ایک اور بے رنگ روپ اور ڈھنگ یہ بھی ہے۔ جوانی کو خدا حافظ کہنا اور ڈھلتی عمر کو خوش آمدید۔"
صوفیہ نے برش، سنگھار میز پر رکھ دیا اور بیڈ پر موجود اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔
"پھر کیا سوچا تم نے؟ عمر بلا رہا ہے ہم دونوں کو بلکہ وہ تو رودین کو بھی سیٹل کرا دیتا مگر وہ بزنس کے معاملات میں پڑ گیا۔ چلو خیر تم سے تو بہتر ہی جو کر رہا ہے؟"
"یہ تڑکا لگانا ضروری تھا؟" شاہ زیب نے موبائل آف کر کے ایک طرف رکھا۔
"میں عمر کی بات کر رہی تھی؟" صوفیہ نے مزید محاذ آرائی سے پہلو تہی کی۔
"ہم دونوں عمر کے پاس چلے گئے تو رودین بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ ہم آتے جاتے رہیں گے اور ویسے بھی رودین کی شادی ہو جائے گی تو وہ سیٹل ہو جائے گا۔" صوفیہ نے سب کچھ طے کر رکھا تھا۔
"تمہاری این جی او کا سوشل ورک کا کیا ہوگا؟"
"وہ، میرا مسئلہ ہے، میں ہینڈل کر لوں گی، تم اپنی کہو؟ کیا رائے ہے تمہاری؟" صوفیہ ہینڈ لوشن سے مساج کر رہی تھی۔
"ایک طویل عرصے بعد میری رائے مانگی ہے تم نے" شاہ زیب کے لہجے میں شگفتگی بھی تھی اور شکایت بھی کہ صوفیہ کو حاکمیت کی اور اپنے فیصلے مسلط کرنے کی عادت تھی۔
"تم فیصلہ کرنے میں بہت وقت لگاتے ہو، کنفیوز رہتے ہو کہ کیا کروں کیا نہ کروں اسی لیے بزنس بھی ٹھیک نہیں چلا سکے اور نہ ہی لائف۔"
صوفیہ نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔
"مگر اب یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ جو تھوڑی بہت زندگی ہے ہمارے پاس، اسے ڈھنگ سے اور ٹھیک سے جینا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ، یا پھر یونہی تلخیوں کے ساتھ وقت بتانا ہے۔"
"تلخیاں، میں نے تو پیدا نہیں کی تھیں۔" شاہ زیب کی آواز مدھم ہوئی۔
"اور میں نے بھی نہیں چاہی تھی ہم نے پسند کی، محبت کی شادی کی تھی شاہ زیب! نہ جانے کس گھنے جنگل میں سب کچھ کھو گیا؟"
صوفیہ نے آئینے میں خود کو بھی دیکھا اور شاہ زیب کو بھی۔ جس کے چہرے پر افسردگی کے ساتھ پشیمانی بھی تھی اور دماغ میں خیالات کے چکراتے بھنور، ایک خیال شدت سے گردش کر رہا تھا کہ دل دکھانا اور دھوکا دینا، بے سکونی لاتا ہے۔ ضمیر کی خلش اور ندامت، ہر خوشی کا تھوڑا سا حصہ نگل لیتے ہیں۔

☆☆☆

موسم کے رنگ ڈھنگ بدل رہے تھے۔ خنکی ختم، ٹھنڈک غائب، گرمی نے اپنے پنجے جمانے شروع کر دیے تھے۔
زوہا نے بیڈ شیٹ تبدیل کر کے تکیوں کے غلاف چڑھائے اور وارڈ روب ٹھیک کرنے لگی۔ موسم سرما کے گرم کپڑے تہ کر کے شاپرز بنائے انہیں رکھ کر لان کے کپڑے نکالے۔
ایک کے بعد ایک کام میں مصروف ہونے کے باوجود بھی اندر ایک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور اس خاموشی میں بار بار ایک ہی تصویر ابھر رہی تھی۔
پچھلے ہفتے رودین آیا تھا بہت خوش۔
"زوہا، ایک بات بتاؤں تمہیں؟" وہ بالکل کسی بچے کی طرح پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔
"بتاؤ" زوہا کو اس سے رودین بہت اچھا لگا، اس نے دلچسپی سے سنا۔
وہ اپنے بزنس کی اور کامیابی کی خبر سنا رہا تھا۔
ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کو اس نے بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد پھر سے سفر کے لیے تیار کر دیا تھا۔

''ڈیڈ بہت خوش ہیں اور ممی بھی۔''

''یہ دیکھو، دونوں کی خوشی اس سیلفی سے بھی باہر آرہی ہے۔''

رودین نے مسرت سے بولتے ہوئے اپنا موبائل آن کیا اور اسکرین زویا کے سامنے کی۔

وہ خود اس کی ممی اور ڈیڈی شاہ زیب۔

''یہ تمہارے ڈیڈ ہیں؟'' زویا کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''تم کیوں ڈر رہی ہو؟ بہت فرینڈلی ہیں ڈیڈ اور تمہیں تو بغیر دیکھے ہی دونوں نے ہاں کردی ہے۔ ان کے خیال میں، میں اتنا میچور ہو گیا ہوں کہ درست فیصلہ کرسکوں۔''

رودین اس کے تاثرات سے بے خبر اپنی دھن میں بولتا ہی جارہا تھا۔ وہ آخری دن تھا جب زویا نے اسے دیکھا اور اس کی آواز سنی تھی۔ وہ روزانہ کئی کئی بار فون کر رہا تھا۔ زویا کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ اس کی کیفیت عجیب تھی۔ اس کی حالت عجیب تھی۔ جاب وہ پہلے ہی چھوڑ چکی تھی۔ سارا سارا دن خود کو بے مقصد کاموں میں مصروف رکھتی یا ادھر سے ادھر چکراتی پھرتی۔

طیبہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھیں۔

پوچھ پوچھ کر تھک گئیں۔ مگر زویا کی چپ نہ ٹوٹی وہ اندر ہی اندر خود سے سوال جواب کرتی رہتی۔

دنیا میں کتنے اتفاقات ہوتے ہیں؟

کتنی ان ہونیاں ہوتی ہیں؟

یہ زندگی ہے، کوئی کہانی تو نہیں، پھر کیا ضروری تھا کہ رودین کے والد شاہ زیب ہوتے؟

کیا ضروری تھا کہ مجھے رودین سے محبت ہوجاتی؟

اور کیا ضروری تھا کہ مجھے اس شخص سے جو رودین کا باپ ہے۔ نفرت محسوس ہوتی؟

ماں کہتی ہیں کہ میں بہت جذباتی ہوں۔

کاش کہ میں حقیقت پسند ہوتی،

کاش کہ مجھے ماضی کی کہانیوں کا علم نہیں ہوتا۔

ہم کتنے شوق سے کہانیاں سنتے ہیں اور پھر خود بھی کسی داستان کا حصہ بن جاتے ہیں کسی غم کی داستان کا۔

''زویا..... زویا.....!'' طیبہ اسے آواز دے رہی تھیں۔

''کچھ تو بتاؤ، کیا بات ہے؟ کیوں اتنی پریشان ہو، چہرہ دیکھا ہے اپنا؟ کیسی ہو رہی ہو؟'' طیبہ کہہ نہ سکیں کہ اس بہار سے چہرے پر کیسی خزاں چھائی ہوئی ہے۔

''ماں.....!'' زویا نے نظریں اٹھا کر طیبہ کو دیکھا۔

''زندگی میں اتفاقات زیادہ ہوتے ہیں یا کہانیوں میں؟ زندگی، اصل زندگی، ہماری لکھی ہوئی کہانیوں سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ زیادہ غیر متوقع ہوتی ہے۔''

''کہانیوں سے زیادہ اتفاقات زندگی میں ہوتے ہیں۔'' طیبہ نے بولتے بولتے اس کی الجھی سلجھی لٹیں کان کے پیچھے کیں۔

''مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا پریشانی ہے؟'' وہ اتنے پیار سے پوچھ رہی تھیں۔ زویا کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

''رودین سے جھگڑا ہوا ہے؟''

زویا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

براؤن لائننگ کی شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ میں ملبوس، بالوں کو جیل سے پیچھے الٹ کر سیٹ کیے ہوئے تھے۔ وہ جتنا ہینڈسم لگ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور مصروف۔

''رودین! لنچ ٹائم ہو گیا ہے۔''

شاہ زیب نے اسے یاد دلایا۔

''بھوک نہیں ہے۔'' لیپ ٹاپ پہ منہمک اس نے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''تمہاری بھوک کو کیا ہوا ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

"کچھ نہیں ڈیڈ، کام زیادہ ہے بس۔" رودین نے نظریں اب بھی نہیں اٹھائی تھیں۔

"رودین، کوئی پرابلم ہے تمہارے ساتھ جو تم مجھ سے شیئر نہیں کررہے؟" شاہ زیب نے غور سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"میں نے زندگی میں کبھی اتنا ٹینس نہیں دیکھا تمہیں۔ تم کسی سے ملانے والے تھے ہمیں؟"

"پتا نہیں ڈیڈ، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا ہوگیا ہے؟ کیا ہورہا ہے میرے ساتھ۔" رودین نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

"چلو آج اچھا سا لنچ کرتے ہیں اور بات کرتے ہیں۔"

شاہ زیب اسے اپنے ساتھ لیے ایک قریبی ریسٹورنٹ میں لے آئے جہاں بھنے کھانے رودین کو بہت پسند تھے۔

ویٹر نے کھانا سرو کردیا تھا۔ رودین نے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور چبانے لگا۔

"وہ مجھ سے بات نہیں کررہی۔" بالآخر اس نے باپ کو بتایا۔

"کیوں؟"

"وہ بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اسے لگ رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے میچ نہیں کرتے ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔"

"اچانک ایسا کیوں لگا؟" شاہ زیب کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"میں نہیں جانتا، وہ میرا فون اٹینڈ نہیں کرتی، گھر گیا تو نہیں ملی، اب میں کیا کروں؟" رودین نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔

"چلو ابھی اس کے گھر چل کر بات کرتے ہیں۔" شاہ زیب کو بیٹے کا چہرہ دیکھ کر تکلیف ہورہی تھی۔

"ہوسکتا ہے کہیں اور انٹرسٹڈ ہوگئی ہو۔"

رودین کے چہرے پر وہ مسکراہٹ ابھری جو رنج کے رنگوں میں گھلی تھی۔

"جب آگے تک ساتھ نہیں دینا تھا تو یہاں تک کیوں لائی تمہیں، کھیل سمجھا ہوا ہے محبت کو۔"

جذبات میں بولتے ہوئے اچانک ہی شاہ زیب کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اپنی ہی آواز اور الفاظ اجنبی بن کر جیسے منہ چڑا رہے تھے۔

☆☆☆

دھوپ دھیرے دھیرے پھیل چکی تھی۔ وہ گھر بھی سورج کی کرنوں میں نہا گیا تھا جہاں زویا اپنی ماں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی اذیت تھوڑی کم ہوچکی تھی۔ دل کا بوجھ کم ہوا تو اپنا آپ بھی ہلکا پھلکا محسوس ہورہا تھا۔

اگر یہ زندگی نہ ہوتی تو کوئی کہانی ہی محسوس ہوتی، کرداروں کا ایسا تال میل اور اتفاقات، جدائی کا وقت، ملاپ کا وقت، ملاقات کا وقت، سب کچھ مقرر اور طے شدہ۔

زندگی کی کہانیاں تصنیف کرنے والے خالق سے بڑھ کر مصنف کوئی نہیں۔ طیبہ نے خیالات کے ریشم کو سلجھاتے ہوئے شروع کی۔

"ایک ماں نے اپنی عمر کا ایک باب اپنی بیٹی کے سامنے عیاں کیا۔ صرف اس لیے کہ کبھی بیٹی ان ہی راستوں سے گزرے تو سنبھل کر چلے۔ مگر تم تو کسی اور ہی امتحان میں پڑ گئیں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کہانیاں لکھنے والے ہی نہیں انہیں پڑھنے اور سننے والے بھی آزمائش میں پڑ جاتے ہیں۔

تمہیں شاہ زیب سے کدورت یا نفرت محسوس ہوئی اس لیے کہ اس نے تمہاری ماں کا دل دکھایا اور اس شخص کا بیٹا تمہارے لیے بے حد خاص اور اہم ہے تو میری پیاری بیٹی، محبت اور نفرت ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہوگا اور محبت چھوڑنا تو بڑی حماقت ہے۔

میں اپنے ماضی میں نہیں۔ حال میں زندہ

ہوں، خوش ہوں مطمئن ہوں۔ تمہیں کسی سے بدلہ لینے کی یا نفرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں اتنی کمزور ہوں کہ اپنے ماضی کا سامنا نہ کرسکوں۔ عزت اور وقار کے ساتھ انسانوں اور معاملات کو ہینڈل کیا جاسکتا ہے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، کیا کروں؟"

زویا کے چہرے پر اب بھی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"کچھ مت کرو، لوگوں اور حالات کا سامنا کرو اور مسکراؤ، جیسے مسکرایا کرتی ہو اور ہاں۔ اب بھی کوئی سوال ہے تو ابھی پوچھ لوں۔"

"ہاں، اگر ماضی کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر وہ چند چیزیں ابھی تک کیوں سنبھال رکھی ہیں؟" زویا نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"دو خلوط ایک پرفیوم ایک چوڑیوں کا سیٹ اور ایک چھڑی میں نے اپنی الماری میں سنبھال کر رکھے تھے۔ اس وقت جب ان سے جذباتی وابستگی تھی۔ شادی کے بعد سب یہیں رہ گیا تھا میکے میں بھیا اور بھابھی کینیڈا اسیٹل ہونے لگے تو یہ گھر میں نے خرید لیا۔ شادی سے پہلے کا کچھ سامان اسٹور میں اب تک حفاظت سے رکھا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ ان چیزوں کو تلف کردوں۔ اب کی صفائی میں انہیں نکال دیں گے۔" طیبہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ہاں، بس یہ ہے کہ برسات میں پکوڑے نہیں بناتی تو اتنی رعایت تو مجھے دے دو۔"

"رودین خفا ہوگا۔ میں نے بہت مس بی ہو کیا ہے اس کے ساتھ۔" زویا کو فکر ہوئی۔

"منالو، وہ مان جائے گا۔ کہانی کا اختتام اچھا ہونا چاہیے۔ ہپی اینڈنگ بلکھاری اور قاری دونوں کے دلوں میں امید کی جوت روشن رکھتی ہے۔"

☆☆☆

شاہ زیب اس کے مانوس گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا حیران بھی تھا۔ پریشان بھی اور شرمندہ بھی۔ مگر طیبہ نے بہت وقار کے ساتھ اس کا سامنا کیا تھا۔

"شاہ زیب صاحب! آپ اپنی مسز کے ساتھ آئیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ رودین بہت پیارا لڑکا ہے۔ مجھے پسند ہے میرے شوہر دو ماہ بعد واپس آرہے ہیں۔ ہم سب بیٹھ کر بات کریں گے۔"

باہر صحن میں گل مہر کی گھنی بیل کے سائے میں رودین زویا سے بات کررہا تھا۔

"تمہیں ہوا کیا تھا؟"

"پتا نہیں، شاید میں ڈر گئی تھی۔ ہمایوں کی لو میرج ہے اور اب دونوں میاں بیوی روزانہ جھگڑتے رہتے ہیں۔"

"وہ ڈرامے باز ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کیا؟ اور دوسروں کے معاملات خود پر کیوں اپلائی کررہی ہو؟"

"تم ناراض تو نہیں ہو؟"

"نہیں، بہت خوش رہا اتنے دن، خوب ٹینشن دی تم نے مجھے اچھا ہے۔ شادی سے پہلے ہی پریکٹس ہوگئی۔" رودین نے جل کر جواب دیا۔

"ارے واہ، تم نے تو پہلے ہی سے بڑی اچھی توقعات وابستہ کی ہوئی ہیں مجھ سے شادی کے بعد ٹینشن؟" زویا کا منہ پھول گیا۔

"بہت تیز مزاج کی ہو تم۔"

"میں تو ایسی ہی ہوں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ محبت وغیرہ کرلیتی رومانس رومانس بھی جھاڑ سکتی ہو۔" رودین شرارتی ہوا۔

"کس نے کہا؟" وہ اچھل ہی پڑی۔

"تمہاری آنکھوں نے اور اس چہرے نے۔"

"وہ تو جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔" زویا نے مسکراہٹ دبائی۔

"تو چلو، کچھ جھوٹ ہی سنا دو۔" رودین مچل گیا۔

"اندر جاؤ، تمہارے والد صاحب، انتظار کررہے ہیں۔"

"زویا، ذرا کچن میں تو آؤ؟" طیبہ کی آواز آئی۔

"نہ جانے لوگ مہمانوں کی خاطر کیوں کرتے ہیں۔" رودین سخت بدمزہ ہوکر زویا کو کچن کی سمت جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆

صبغہ احمد

عیدی

گھر کے مختصر سے صحن کی کیاریوں میں جا بجا لگے موتیا اور گلابوں نے اپنی خوشبو رچا رکھی تھی۔ صحن کے دائیں جانب ایک عدد جھولا لٹکا ہوا تھا جبکہ بائیں جانب اطراف میں بانس کے ڈنڈوں پر چڑھی انگور کی پھیلی ہوئی لیسی بیل اپنے قدرے پرانے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ موٹے موٹے سرخ انگوروں کے چند گچھوں پر پرندوں کی چونچوں کے نشان ثبت تھے۔ باقی ماندہ گچھوں پر کپڑا لپیٹ کر انہیں پرندوں سے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا یہ گھر کے افراد کا اپنے کھانے کی حفاظتی تدبیر ہے۔

وسیع بیل کی چھاؤں تلے وہ ایک ہاتھ سے فون تھامے، دوسرا ہاتھ ڈنڈے پر جمائے گھوم گھوم جاتی۔ کبھی جوش سے اس کی چھاؤں میں بیٹھ جاتی، وہ اپنی عزیز از جان سہیلی طیبہ سے بات کر رہی تھی۔

طیبہ عرف طبو کا گھر، اس کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تاہم رمضان کی وجہ سے آنا جانا کم ہی ہوتا تھا اس لیے دونوں اپنے احساسات کے اظہار کا شوق فون پر ہی پورا فرما رہی تھیں۔

طیبہ بڑے پرجوش انداز میں اپنی سسرال سے آنے والی عیدی کے متعلق اسے بتا رہی تھی۔ اس کی آواز میں چڑیا کی سی چہچہاہٹ تھی۔ اسے دیکھے بغیر ہی اس کی آواز سے شہلا پہچان گئی تھی کہ وہ کتنی خوش ہے۔

"شہلا، کیا بتاؤں یار! اس بار تو رنگ بھی میری پسند کے ہیں۔"

"تمہاری پسند کے رنگ کیسے؟" شہلا نے جھٹ سوال کیا۔

"وہ میں نے ارسل کو بتایا تھا، فون پر ایک دن اپنے پسندیدہ رنگوں کے بارے میں۔" طیبہ مدھم آواز میں تھوڑی شرمندگی لیے بولی۔

"ہیں ں ں! کیا واقعی؟" شہلا خفیف سے انداز میں بولی۔

"میں نے اپنی مرضی سے تھوڑا بتایا تھا۔ اس نے خود ہی پوچھا تھا۔"

طیبہ فون کان سے لگائے اس کے ہیں ں ں کہنے کے انداز کو پہچان گئی تھی۔ اس لیے فوراً سے پہلے وضاحت دینے لگی۔

"اچھا"...... شہلا نے صرف اچھا کہنے پر اکتفا کیا۔ "کیا اچھا؟" طیبہ پھر سے شروع ہو گئی تھی۔

"تم سناؤ۔ تمہاری عیدی آ گئی کیا؟ سچ میں، میں تو بہت پرجوش ہوں۔ دونوں سہیلیاں عید کے پہلے دن عیدی میں آیا جوڑا ہی پہنیں گے۔"

طیبہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

"میری تو عیدی آئی ہی نہیں طبو! اور دور دور تک عیدی کا کوئی امکان ہی نہیں۔" شہلا رونی صورت بنا کر بولی۔ "کیوں بھئی! ابھی تک عیدی آئی کیوں نہیں؟" "اچھا کوئی بات نہیں میری جان، آ جائے گی اور اگر نہ آئی تو میں بھی گھر والا جوڑا ہی پہنوں گی۔" طیبہ بہن جیسا پیار جتا کر بولی۔ شہلا کو اور رونا آیا۔

"کیا مطلب نہیں آئی تو؟" شہلا غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں منمنائی۔

"اری او شہلا!" کچن سے اماں کی آواز برآمد ہوئی۔ "طیبہ! میں فون رکھتی ہوں، اماں بلا رہی ہیں۔"

"جی ماں۔" شہلا کچن میں آتے ہی بولی۔

"دیکھ سورج سوا نیزے پہ آ گیا ہے، اور سحری کے برتن تو نے ابھی تک نہیں دھوئے۔"

"وہ اماں۔" "آج دو سیپارے ختم کیے میں نے فجر کے بعد پھر ایسی نیند آئی کہ جلدی آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

"شہلا، کتنی بار کہا ہے تجھ سے کہ فجر کے بعد نہ سویا کر، نحوست ہوتی ہے۔" اماں نے لہجے کو بدقت نرم کیا۔ رمضان کا لحاظ بھی تو تھا۔

"لیکن اماں، میں فجر کے فوراً بعد نہیں سوئی۔ میں تو فجر سے پورے دو گھنٹے بعد سوئی تھی سورج نکلنے کے۔" شہلا معصومانہ انداز میں گویا ہوئی۔

اماں نے ایک گھوری شہلا کے سرخ و سپید

چہرے پہ ڈالی اور اس کی عقل پر ماتم کا سلسلہ ملتوی کرتے ہوئے باورچی خانے سے نکلیں۔

اماں عصر کی نماز سے فارغ ہوئیں تو شہلا کو خیالوں میں گم پایا۔ "شہلا تو نے نماز پڑھ لی؟" اماں نے جیسے جانتے ہوئے بھی سوال کیا۔

"ہاں اماں!" شہلا اداس سی بولی۔

"چل پھر کچن میں چل کے افطاری کی تیاری کریں۔"

"اماں، دل نہیں کر رہا۔"

"ہیں!! کیوں نہیں کر رہا دل۔ تیرے دل کو نہیں دماغ کو کچھ ہو گیا ہے۔ صبح سے الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔"

"پتا نہیں اماں، بس دل نہیں لگ رہا۔"

"میڈم شہلا دل کو کیا ہوا ہے؟ تا یہ مرزا کی چپل کیوں پہنی ہوں میں، ایک تو چلنے میں آسانی اور دوسرا....." اماں کا ہاتھ چپل کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ "اماں چھوڑ دنا۔ میں جا ہی رہی تھی۔" شہلا اماں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ شہلا کچن میں جانے کے لیے چپل اڑسنے لگی۔ اماں اسے پیچھے سے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

وہ ماں تھیں بیٹی کے دل و دماغ سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ طیبہ کی عیدی کے متعلق جانتی تھیں۔ طیبہ کی منگنی اپنے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ اس کی منگنی کو سال ہونے والا تھا۔ جبکہ شہلا کی منگنی چھ ماہ قبل غیروں میں ہوئی تھی۔ دونوں اپنی عیدی کی منتظر تھیں۔

یہ احساس ہی بہت سہانا تھا ان دونوں کے لیے اور بلا شبہ ہر لڑکی کے لیے ہی دل آویز ہوتا ہے، پیا گھر سے آیا جوڑا، سبز کھنکتی چوڑیاں اور مہندی کے گہرے رنگ، ہر احساس ہی دل میں جل تھل کر دینے والا تھا۔ ہر لڑکی کو ہی ارمان ہوتا ہے اور غالباً شہلا بھی انہیں میں سے ایک تھی۔

رمضان کا تیسرا عشرہ اختتام پذیر ہوا چاہتا تھا۔

آج آخری روزہ تھا۔

گرمی حد سے سوا تھی۔ شہلا عصر کی نماز خشوع وخضوع سے ادا کر رہی تھی۔ یہ اس کی طبیعت کا خاصا تھا کہ نماز بڑے ہی خشوع سے ادا کرتی تھی۔ یہ اماں کی تربیت بھی تھی کہ شہلا اللہ کی بندگی کے بعد، ماں باپ کی فرماں برداری کو اہم جانتی تھی۔ باقی چیزوں کی باری بعد میں آتی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو شہلا جائے نماز سمیٹتے ہوئے دروازہ کھولنے چل دی اور پھر...... پھر دروازہ وا ہوتے ہی دنیا کی ساری تتلیوں کے رنگ جیسے اس کے چہرے پہ سج گئے تھے۔ "کون ہے شہلا؟" اماں کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"ارے صالحہ آپا آپ!" شہلا کی ساس اور نند شہلا کی عیدی لے کر آئی تھیں۔

"شہلا جا! اپنے ابا کو فون کر مسجد سے آتے ہوئے افطاری کے لوازمات لیتے آئیں۔" اماں انہیں لے کر کمرے میں چل دیں۔

"دراصل ہم پہلے ہی آنا چاہ رہے تھے لیکن احسن نہیں مان رہا تھا۔ کہہ رہا تھا امی، عیدی میری تنخواہ سے ہی لے کر جائیں۔ مانے نہیں مان رہا تھا۔ کل اس کی تنخواہ آئی تو آج ہم شہلا بیٹی کی عیدی لے کر آ گئے۔"

شہلا صحن میں لگے ٹیلی فون سے ابا کو فون کرنے کے بعد کمرے کی طرف جا رہی تھی جب احسن (منگیتر) کے اپنے لیے احساسات جان کر خوشی سے سرشار ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے صحن میں لگے لال گلابوں کا رنگ اس کے چہرے نے چرا لیا ہو۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر طیبہ کو اپنی عیدی کا بتاتے ہوئے اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

☆☆

فرح بخاری

میانم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے نار۔ بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن اس کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میانم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بدماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں۔ اتفاقاً وسیلہ ایک پتا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر اسی پتے کی غرض سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

چوتھی قسط

"وسیلہ صحیح کہہ رہی ہے امی! آپ عجلت میں کوئی فیصلہ مت کریں۔" تحریم نے ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا

"دادی وغیرہ کا ہم سے ملنا، دونوں خاندانوں کا پھر سے ایک ہونا بہت خوش آئند ہے لیکن یہاں بات وسیلہ کے دل کی بھی ہے نا۔ خاندان انسانوں سے مل کر بنتے ہیں اور انسان، کوئی لکڑی گتے کے بلاک نہیں کہ کہیں بھی اٹھا کر فٹ کر دیے۔ انہیں ہم سے صلح کرنی ہے، رابطے بحال کرنے ہیں تو شادی وغیرہ سے اسے مشروط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ منصب اور ارحم کے رشتوں پر بنا ذہن پر کوئی دباؤ محسوس کیے سوچ بچار کریں۔ ہمیں وسیلہ کے لیے جوڑ کا مناسب لگا ہم اسے ترجیح دیں گے اور وسیلہ کی مرضی کو بھی اہمیت دیں گے۔

موحن کہتے ہیں وسیلہ کی اب تک کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ ہماری بچیاں پڑھنے کے لیے باہر بھی نکلتی رہی ہیں، ہزار طرح کے لوگوں سے ملنا جلنا بھی رہا ہے۔ لیکن کبھی ان کے کردار میں کسی قسم کا جھول، کوئی اونچ نیچ نہ دیکھی نہ سنی۔ ایسے میں وسیلہ کا منصب کے لیے پسندیدگی ظاہر کرنا غلط نظر سے نہ دیکھا جائے، ضرور منصب میں ایسی کوالٹی ہو گی جس کی بنا پر وسیلہ ہمیں سوچنے کا کہہ رہی ہے۔"

"اچھا بابا، ٹھیک ہے۔" رضوانہ نے تحریم کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں ایک گہرا سانس لیا" منصب سے کہہ دو کہ اپنے گھر والوں کو لے آئے۔ میں شہناز بھابی سے بھی سوچنے کا وقت مانگ لیتی ہوں، ابھی رات ہی ان کی دوبارہ کال آئی تھی، کہتی ہیں اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اس لیے جلد از جلد ارحم کی منگنی اور شادی کر دینا چاہتے ہیں۔"

"ایک تو ان کا جلدی ڈالنا بھی مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا۔ بندہ اگلے کو سنبھلنے کا موقع تو دیتا ہے۔ اتنا تو کسی سے ہوا نہیں کہ ہمیں ایک بار تھانہ آنے کی دعوت دے دیتے۔" تحریم برا سا منہ بناتے وہاں سے اٹھ گئی۔

اور رضوانہ پر سوچ انداز میں بیٹی کی بات پر غور کیے گئیں۔

دل نے کہا کہ ہاں، ایسا تو انہیں کہنا ہی چاہیے تھا۔

☆☆☆

"انکار..... مطلب واقعی صاف انکار؟" ارحم بولا تو لہجے میں مکمل بے یقینی تھی۔ موبائل سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی، اسے پلنگ پر پھینک کر وہ ماں کے قریب آیا۔ شہناز کا الگ چہرا اترا ہوا تھا۔ ہونٹوں کو بے چینی سے کاٹتے وہ ایک نقطے پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔

"وجہ کیا بتائی..... اور آپ نے جواباً کچھ نہیں کہا؟" ارحم کا اضطراب عروج پر تھا۔

"پہلے تو کچھ نہیں بتا رہی تھیں۔ بس یہی کہتی رہیں کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے اور ابھی سوچا نہیں وغیرہ۔ تو میں نے کہا، رشتہ کر دیتے ہیں۔ جب آپ کہیں گے تب شادی بھی کر دیں گے تو بہت سوچ بچار کے بعد پھوٹ ہی پڑیں کہ ایک دو رشتے اور بھی تھے تو ہم نے پہلے ہی ایک فیصلہ لے لیا تھا۔"

"کیسا فیصلہ؟" وہ بغور ماں کو سن رہا تھا۔

"منصب....." شہناز نے گہری نظر سے بیٹے کو دیکھا تو لہجے میں بہت کچھ تھا۔

"منصب....." ارحم کے نتھنے پھول گئے۔ تو اس روز وردی پہنے وہ اپنی بہن کو لیتے ان کے دروازے پر یونہی نہیں آیا تھا۔ ارحم کی نظروں میں کچھ دن پہلے کا نقشہ پھر گیا۔

"اس منصب سے تو میں آپ نمٹ لیتا ہوں۔ آپ بس دو دن انتظار کریں۔" وہ موبائل اٹھا کر بنا رکے باہر نکل گیا۔ دماغ میں اس وقت کیا چل رہا تھا اس نے ماں سے ڈسکس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

☆☆☆

"امی نے ہاں کہہ دی ہے۔" آنکھیں میچے شرماتے ہوئے ایموجی کے ساتھ جب یہ لکھا آیا تو منصب اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا صاحب؟" امین نے گھبرا کر سر کا چہرا

دیکھا جس پر پریشانی تو نہیں، کچھ پڑھ کر عجیب گلابی
پن سا در آیا تھا۔

"آں...... کچھ نہیں......" منصب جھینپ کر
دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "امین یار...... چائے کا تو کہہ
دو۔ بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔" اس نے جلدی سے
امین کو باہر بھیجا۔

واٹس ایپ کھول کر بار بار اس ایک لائن کو
پڑھا۔ ابھی تو اس نے میمونہ کو تھانہ سے بلوایا بھی نہیں
تھا اور دسیلہ نے اپنی امی کو قائل بھی کر لیا تھا۔

"تھینکس دسیلہ...... تھینک یو سو مچ، میں آج
ہی میمونہ کو یہاں بلا لیتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر
ٹائپ کیا اور بہن کو کال ملا دی۔

☆☆☆

"نمک حرامی تمہاری گھٹی میں شامل تھی یا اس
وردی اور سیٹ کے طنطنے سے آئی ہے؟" ارحم نے
ایک پاؤں کرسی پر رکھتے جھک کر، منصب کی آنکھوں
میں دیکھا تو نہ کہیں خوف کا شائبہ تھا نہ ماحول کے
رعب کی کوئی جھلک۔

منصب اپنے آفس میں اکیلا بیٹھا ایک فائل
دیکھ رہا تھا، جب ارحم نے آتے ہی بنا آفس وغیرہ
کے ماحول کو خاطر میں لائے خالص مالکانہ انداز میں
منصب کو مخاطب کیا۔ منصب نے فائل پر سے سر اٹھا
کر بغور ارحم کو دیکھتے اس کے جملے پر ٹھنڈے دل
و دماغ سے رک کر سوچا۔

"تشریف رکھیں ارحم خان! ہم آرام سے بات
کرتے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے کرسی کی طرف
اشارہ کیا لیکن منصب نے ٹھوکر سے کرسی کو پرے
دھکیلتے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے۔ منصب کو گھورتا رہا۔

"دسیلہ جمال خان حویلی کی فرد وہاں کا ایک
انگ ہے اور تم...... حویلی کے معمولی نوکر...... تم نے
اسے اپنانے کی بات سوچی بھی کیسے۔"

"میں آپ کی حویلی کا نوکر کبھی نہیں رہا ارحم
خان۔" منصب نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

"تمہارا باپ ہمارا نوکر تھا، یہ بات میں تمہیں
بھی بھولنے نہیں دوں گا۔ مجھے لفظوں کے ہیر پھیر
میں مت الجھانا منصب!" ارحم نے دھاڑ کر کہتے انگلی
منصب کی جانب اٹھائی۔

"اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ میرے باپ
نے برسوں حویلی کی خدمت کی ہے۔ لیکن اس کا یہ
مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ وہ غلام تھے۔ جب تک بابا
زندہ رہے آپ کے ہاں کام کرتے رہے اور اپنے
کام کی تنخواہ پاتے رہے۔ ان کے بعد ان کی اولاد
اپنے ہر قول و فعل میں آزاد ہے۔" منصب بھی اپنی
سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا

"ہماری حویلی کو چھوڑ کر تم جہاں جو چاہو رشتہ
کر سکتے ہو، میں کبھی آڑے نہیں آؤں گا۔"

"یہ تو پابند کرنا ہوا نا۔" اس نے ہاتھ سینے پر
باندھے۔

"تم یہاں ایک بات بھول رہے ہو انسپکٹر
منصب رضا۔" ارحم گھوم کر اس کے عین سامنے آ کھڑا
ہوا تو آنکھوں میں ٹھنڈے شعلے بھرے تھے۔

"یہ جو وردی تم نے پہن رکھی ہے اور جس
عہدے کے بل پر تم نے دسیلہ کا ہاتھ مانگنے کی جرات
کی ہے، اس عہدے، اس سیٹ تک پہنچنے کے ایک
ایک قدم پر لگی ایک ایک پائی ہم حویلی والوں کی
مرہون منت ہے۔ ایمان داری سے دل پہ ہاتھ رکھ
کر کہو آج تم منشی نوریز کے بیٹے تو ہوتے پر انسپکٹر
منصب نہ ہوتے تو رضوانہ چچی کیا تمہیں دسیلہ کے
لیے ہاں کہتیں۔

میری دادی نے تمہاری تعلیم کا الف سے یے
تک کا خرچا خود نہ اٹھایا ہوتا تو آج تم کہاں کھڑے
ہوتے؟ تو مسٹر منصب رضا آج نمک حرامی کر کے
اگر تم اپنے باپ کی روح کو شرمندہ کرنا چاہتے ہو تو
بے شک کرو، ہم آئندہ کسی پر احسان کرنے سے پہلے
کم از کم سو بار سوچیں گے تو ضرور۔ جاؤ اور دکھا دو
اپنی اوقات کہ تم جیسوں سے اور توقع ہی کیا کی جا
سکتی ہے۔" ارحم نے زہر میں بجھے نشتر منصب کے
سینے میں اتارتے ہاتھ سے دھکا دیا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اور پھر اس سے پہلے کہ تانیہ صہیب سے مل پاتی۔ ایک دن عیسیٰ کی والدہ تحائف سے لدی پھندی اُن کے ہاں رشتہ لے کر آ گئیں۔ تانیہ عیسیٰ کی جلد بازی پر حیران تھی۔ تانیہ نے کمرے میں آ کر فوراً ہی عیسیٰ کا نمبر ملایا، جبکہ باہر ڈرائنگ روم میں اس کی اور عیسیٰ کی امی ابھی موجود تھیں۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"حیران ہیں یا غصہ؟" عیسیٰ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کچھ جلدی نہیں کر رہے؟"

"لیکن آپ نے ہی کہا کہ اگر کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تو مجھے ہی بیاہ کر لینا چاہیے۔" اس کا لہجہ بہت لائٹ سا تھا۔

"ہاں لیکن میرے معاملے میں عجلت نہ کریں، آپ میرے متعلق جانتے ہی کیا ہیں؟" وہ ایک دم صاف گو ہوئی۔

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، میرا خیال ہے آپ ویسی ہی نظر بھی آتی ہیں جیسی ہیں۔ باقی کوئی بہت ذاتی معاملہ ہے تو اٹس اوکے، رشتے آتے ہیں، انکار بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کو بھی حق ہے۔"

"ارے ایسی بات نہیں۔" وہ کمزور پڑی۔ وہ واقعی کہیں اور کمٹڈ نہ تھی اوپر سے عیسیٰ کا استقلال بہت مضبوط تھا۔ اسے اپنا کال کرنا بچگانہ محسوس ہوا۔

"تو پھر بڑوں کو نمٹانے دیں آپس میں، کیا خیال ہے؟" بڑے سادہ انداز میں پوچھا گیا۔ تانیہ نے ہوں کہہ کر مسکراتے ہوئے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

"آ گئے تم...... کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ مارکیٹ چلنا ہے، کچھ بہت ضروری سامان باقی ہے۔ میمونہ بھی بس تھوڑی دیر میں تھانہ سے نکل رہی ہے۔ اس کے پہنچنے سے پہلے نمٹا لیتے۔" رمشہ چادر اوڑھ کر اب پرس میں رقم ڈال رہی تھی۔ منصب نے بیلٹ اتار کر میز پر پھینکی۔ رسٹ واچ اتارتے رمشہ کا آخری جملہ رک کر سنا۔ ذرا دیر سوچا پھر ایک گہرا سانس باہر نکالا۔

"میمونہ کو آنے سے منع کر دو۔"

"ہیں...... کیا مطلب...... کیوں؟" وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"ہم اب نہیں جا رہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو، کہاں نہیں جا رہے؟" رمشہ چل کر نزدیک آئی۔

"میمونہ کیوں آ رہی تھی؟" منصب نے بگڑے لہجے میں الٹا اسی سے سوال کیا۔

"ہم رشتہ لے کر جانے والے ہیں وسیلہ کا۔ اور اس کی امی تو پہلے ہی مان چکیں۔" رمشہ کو منصب کا لہجہ ڈرا رہا تھا۔

"ہاں جانتا ہوں، سب مان چکے تھے، پر ہم پھر بھی نہیں جا رہے۔ مجھے وسیلہ سے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں منصب! کیا ہوا ہے؟" وہ ہکا بکا تھی لیکن منصب نے بھی سیدھے سیدھے ارحم کی آمد کی تفصیل بتا دی۔

"ہوں!" رمشہ نے ایک گہرا یاسیت سے پُر سانس کھینچا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ "تو ارحم خان نے اپنی اصلیت دکھائی اور تم نے اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔"

"میرے پاس اسٹینڈ لینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ حق کی بات کر رہا ہے۔ وسیلہ سے اس کا خون کا رشتہ ہے جس کی بنا پر۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو منصب۔" وہ چڑ کر پلٹی "وسیلہ انسان ہے کوئی مکان نہیں کہ ساتھ والوں نے شفعہ کر دیا ہے۔ اور تمہیں صرف اس بات پر دھیان دینا چاہیے کہ رضوانہ آنٹی نے ارحم کے رشتے پر تمہیں پرفیر کیا ہے۔ اب ارحم کچھ بھی کہتا رہے، تمہیں پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔"

"وہ کہتا ہے وسیلہ کا ہاتھ مانگنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خاندان نہ دولت۔ اور جو ہے وہ حویلی کی دین ہے، اب تو یہی ہو سکتا ہے

رمشہ، کہ وسیلہ کی خاطر میں یہ جاب ہی چھوڑ دوں۔ کم از کم میرے ضمیر پر بوجھ۔"

"یہ تم کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو۔ جاب چھوڑ دو گے۔" وہ چیخ ہی اٹھی "ابھی چند ماہ پہلے تمہیں اتنی بڑی خوشی ملی ہے۔ تم اس سے دست بردار کیسے ہو سکتے ہو۔ اور پھر۔ کرو گے کیا۔"

"میں کچھ کروں یا نہ کروں اُسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ ارحم خان کے احسان سے پیچھا چھڑا کر جب میں وسیلہ کا ہاتھ مانگوں گا، کیا رضوانہ آنٹی اسے قبول کریں گی؟ بولو رمشہ؟" منصب کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور رمشہ کے ہونٹوں پر چپ۔

"تو بس۔ یہی ہے ارحم خان کا وہ موقف جو میری سمجھ میں تو آ گیا لیکن تم سمجھنے کو تیار نہیں۔" وہ میز کو دھکا دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ اونچ نیچ، حسب نسب کا طبقاتی فرق مٹانا سب کتابی باتیں ہیں، اصل زندگی میں یہی ہماری اوقات ہے، یہی میری زندگی کی حقیقت۔ میں حویلی والوں کا مقروض ہوں اور مجھے اس احسان کی قیمت اگر وسیلہ سے دست بردار ہو کر چکانی ہے تو سمجھو، وہ میرے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ ورنہ خود سوچو۔ چھبیس برسوں سے یہ لوگ ایک دوسرے سے دور تھے تو عین اچانک ایسے موقع پر کیوں آن ملے۔ سب میرے نصیب کی سیاہ بختی ہے۔"

وہ اس بار حتمی نتیجہ نکالتے باہر ہی نکل گیا۔ رمشہ نے اس کے قطعی انداز کو دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔ اور حسرت سے بس اتنا سوچا کہ شاید وہ صحیح کہتا ہے، یہ خوشی شاید ہمارے نصیب میں نہیں تھی۔!

☆☆☆

"آپ کا فیورٹ کلر کون سا ہے؟" وسیلہ کا میسج منصب کے دل کو چیرتا ہوا نکل گیا۔

آنکھیں میچے وہ بڑی دیر تک اپنی جگہ پہ جم گیا۔ آخر یہ رمشہ ان کو بتا کیوں نہیں دیتی۔ وسیلہ ان کی آمد کی منتظر تھی۔ اس کے تو سان و گمان میں بھی وہ تلخ حقیقت کہیں نہیں تھی جس نے منصب کی پوری ہستی بے آباد کر دی تھی۔ اس نے موبائل دور کیا لیکن پھر بیپ بجی۔

"آپ ساتھ آئیں گے کیا؟" اس نے دیکھ لیا تھا منصب نے اس کا میسج پڑھ لیا ہے، تب ہی دوسرا میسج بھی لکھ دیا۔ اس بار بھی منصب لفظوں پہ نظریں جمائے بیٹھا رہ گیا۔

"میمونہ باجی کس وقت پہنچیں گی؟ میرا مطلب ہے آج ہی آنا ہے ہماری طرف بھی؟" وہ تو بس اپنی دھن میں لکھے ہی جا رہی تھی۔ ہر بات سے بے خبر انجان۔

"میں تو کہتی ہوں۔ آپ نہ آئیں اور اگر آپ آئے تو میں سامنے نہیں آؤں گی۔" وہ ہنستے ہوئے لکھ تو بیٹھی لیکن نیلے ہوتے ٹک اور جواب کا نہ آنا اس مرتبہ اسے کچھ پریشان کر گیا۔

"آپ ناراض ہیں کیا؟ لیکن کیوں۔ میں نے کچھ کیا ہے؟ بتایئے نا پلیز۔" اور منصب نے خود کو آف لائن کر لیا۔

"ایسا کیا ہوا۔" اس نے نچلا لب بے چینی سے دبایا۔ "منصب تو ایسا کبھی نہیں کرتا۔"

"یہ لوگ کس وقت آئیں گے آپی۔ امی نے کہا تم سے پتا کروں۔" ایلیا کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے بولتی ہوئی اندر آئی۔"

"وہ تو مجھے نہیں پتا۔ یہ۔ سنو ایلیا۔ تم ذرا رمشہ کو کال کرو۔"

"اچھا کیوں......" ایلیا ٹھٹکی "اپنے منصب بھیا سے پوچھو نا۔"

"یار! وہ تو اس وقت ڈیوٹی پر ہیں۔ تم رمشہ سے بات کرو۔ لو۔" وسیلہ نے اپنا موبائل اس کے آگے کیا۔ اور ایلیا نے بھی چپ کر کے کال ملا لی، معمول کی سلام دعا کے بعد ایلیا نے میمونہ کی آمد کا پوچھ لیا۔

"وہ۔ ایکچوئلی میمونہ اب نہیں آ رہی۔" رمشہ کا ماتھا عرق عرق ہو گیا۔ بہت کٹھن گھڑی تھی۔ نجانے اسی کے سر پر ہی کیوں آن پڑی تھی اور معلوم نہیں اسے کیا وجہ بتانا تھی، اس نے تو منصب سے

پوچھا ہی نہیں تھا۔

"اچھا۔" ایلیا کے دل میں ایک ساتھ بہت سے سوال اُٹھے لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ کس انداز میں بات آگے بڑھائے۔

"تو...... آپ لوگ...... کب آنا ہے پھر؟"

"ایلیا...... وہ...... بات یہ ہے...... اصل میں یہاں گھر میں کچھ مسئلہ ہوگیا ہے۔" رمشہ نے پلکیں میچ کر کہنا شروع کیا۔ ایلیا خاموشی سے اس کے لب و لہجے پر غور کیے گئی۔

"منصب پر کچھ دباؤ ہیں ایلیا، وہ رشتہ لانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہمارے آپ کے اسٹیٹس کا فرق کچھ لوگوں سے ہضم نہیں ہو رہا، ہمیں رشتہ نہ لانے کے لیے پریشرائز کیا جا رہا ہے۔"

"کون...... ایسا کون کر رہا ہے؟"

"ارحم خان نہیں چاہتا کہ منصب یہاں رشتے کی بات چلائے۔"

"ہاں خیر، وہ تو خود رشتہ لا چکے ہیں، لیکن منصب بھائی کو ایسے کسی دباؤ کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ ہم سب منصب بھائی کے حق میں ہیں۔"

"لیکن وہ خود بہت دباؤ میں ہے۔ اسے یہ سب آسان نہیں لگ رہا، میں نے بہت کنونس کرنے کی کوشش کی ہے، پر وہ۔" رمشہ سے صاف انکار نہیں کیا گیا۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔ انہیں کہنا پریشان نہ ہوں ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔" ایلیا نے ایک بار پھر دبے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن رمشہ کو ایسے الفاظ مزید تکلیف دے رہے تھے۔ منصب کے قطعی انداز میں کسی لچک کا امکان دکھائی نہیں دیا تھا، وہ بھلا کس بنیاد پر ایلیا کو کوئی امید دلاتی۔ خاموشی سے کال ہی کاٹ دی، اور ایلیا کے لیے مزید مشکل صورت حال کا آغاز ہوگیا۔ وسیلہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"وہ...... شاید ارحم خان نے منصب بھائی کو منع کیا ہے۔" ایلیا نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"اچھا...... پھر......؟" وسیلہ کے ماتھے پر بل آیا۔

"تو...... فی الحال یہ لوگ ہمارے ہاں نہیں آرہے۔ منصب بھائی شاید کسی دباؤ میں ہیں، ایسا رمشہ کہہ رہی تھی۔"

"میں منصب سے بات کروں؟" وسیلہ کی خالی آنکھوں میں امید کی جوت تھی۔

"ہاں۔ ضرور کرو، تم ہی انہیں سمجھا سکتی ہو۔"

"اور...... امی سے کیا کہوں گی...... وہ تو ویٹ کر رہی ہیں ان کا۔"

"کچھ بھی کہہ دوں گی۔ تم بس منصب بھائی سے رابطہ کرو۔ میں کہہ دوں گی، میمونہ باجی کسی وجہ سے یہاں پہنچ نہیں پائیں۔"

وہ بہن کا کندھا تھپک کر باہر نکل گئی۔ وسیلہ نے موبائل ہاتھ میں لے لیا۔ ابھی تو اس کے پچھلے میسج بھی جوں کے توں رکھے تھے۔ منصب نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پر اب وسیلہ کو اس گریز کی وجہ معلوم ہوگئی تھی۔ منصب شاید اُن کی طرف سے سپورٹ کا منتظر ہو اسے یہ تسلی دلانا بہت ضروری ہے کہ ارحم کی دھمکیوں کو وہ خاطر میں نہ لائے۔ وسیلہ نے کچھ سوچ کر لکھنا شروع کیا۔

"منصب! آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں، ارحم کی باتوں پر زیادہ نہ سوچیں، رشتے وغیرہ کے معاملات تو ایسے ہی نازک ہوتے ہیں، کئی رکاوٹیں آتی ہیں، کئی لوگ مخالف بن جاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ خود پر کوئی بوجھ محسوس نہ کریں، فیصلہ تو ہم نے ہی کرنا ہے، ارحم ہمیں مجبور نہیں کر سکتا۔ آپ میمونہ باجی کو آنے دیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔"

اس نے اپنے لکھے کو ایک بار پڑھ کر منصب کو بھیج دیا۔ اسے یقین تھا منصب کے لیے قدم آگے بڑھانا اب آسان ہو جائے گا۔

☆☆☆

کسی انسان کی زندگی صاف سیدھی شاہراہ جیسی نہیں ہوتی۔ اونچ نیچ دھکے، ٹھوکر لگتے ہی ہیں۔ کامیابی کی امید جتا بجھتا دیا ہے۔ مقدر ہمیں کامیابی

اور ناکامی دونوں سے دو چار کر سکتا ہے نا۔

آپ کو ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوئی جو پہلے ہی کہیں اور انگیج تھی، نہ صرف سماجی لحاظ سے بلکہ دلی طور پر بھی اس رشتے سے جڑی تھی۔ اب یہ آپ کا نصیب تھا صہیب تو بتایئے کیا پریشے کو حاصل کر لینا خود پریشے کے ساتھ جبر اور زیادتی نہیں۔ وہ آپ کی ہو کر بھی ہو نہ پائی تو تب آپ کے ہاتھ کیا آئے گا۔ آپ خوش رہ سکیں گے؟ آپ دوسروں کے لیے نہ سہی کم از کم اپنے لیے تو اپنا ذہن وسیع کرنے کی کوشش کریں۔ خود کو چند سال آگے کی دنیا میں تصور کریں جب فرض کریں پریشے آپ کی وائف ہے جسے آپ نے کسی اور سے چھین کر حاصل کر لیا۔ تب کیا پریشے اس بنیاد پر خوش ہو گی کہ صہیب نے اس کے دل کی دنیا برباد کر کے اسے فتح کیا تھا۔ اور اسے صہیب سے محبت کرنی چاہیے۔ محبت اختیاری چیز نہیں ہوتی۔

معافی چاہتی ہوں صہیب لیکن ضد اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اذیت میں ڈالنے کا دوسرا نام ہے۔ کیا آپ رُک کر، ٹھہر کر کچھ وقت اپنے آپ کو سوچنے کے لیے دیں گے؟"

عیسیٰ نے بھائی کو اس کے گھر بھیجا تھا۔ ان دونوں کا رشتہ بڑوں کی رضامندی سے طے پا گیا تھا۔ چند دن بعد منگنی کی رسم پر غور کیا جا رہا تھا۔ صہیب سے عیسیٰ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے مسئلے کے سلسلے میں تانیہ سے ملا اور وہ اسے اچھی لگ گئی تھی۔

صہیب جب تانیہ سے ملنے آیا تو اسے معلوم تھا کہ دونوں کے بیچ اس کا معاملہ بھی زیر بحث آئے گا۔ تانیہ نے چائے کے دوران خود ہی ذکر چھیڑا، پہلے صہیب کو سنا لیکن اس کی کہانی وہی تھی جو عیسیٰ پہلے ہی سنا چکا تھا۔ صہیب کے خیالات میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ بس ایک ضد تھی جو جنون بن کر سر میں سما چکی تھی۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں، میں خود کو سوچنے کا وقت نہیں دیتا، لیکن اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ مجھے پتا ہے، حقیقت پسندی سے سوچنا۔ مجھے درد دے گا، اور خود کو درد کون دینا چاہتا ہے؟" وہ اپنی انگلیاں مسل رہا تھا۔

"خود کو دھوکا دینا [illegible]

دھوکا سوائے فریب کے اور کچھ نہیں، بجائے اس کے کرنا یہ چاہیے کہ جب ہماری ایک خواہش پوری نہ ہو تو ہمیں خود کو اس خواہش کے دائرے سے نکال لینا چاہیے۔ تھوڑا مشکل ضرور ہے ڈیئر برادر، ناممکن بالکل نہیں۔"

"میں۔ کوشش۔ کروں گا۔" صہیب نے الفاظ کا چناؤ بڑی مشکل سے کیا۔ تانیہ کو اسی سے اندازہ ہو گیا کہ اس کے لیے کسی اثر سے نکلنا کتنا کٹھن ہے۔

☆☆☆

دادی اور تائی شہناز آئی ہیں۔ ایلیا نے عجیب گھبرائے لہجے میں جب اطلاع دی تو وسیلہ کی بے ساختہ نظر اپنے موبائل کی طرف گئی۔ آج تین دن ہو گئے تھے اسے منصب کو میسج بھیجے لیکن اس نے دیکھ کر بھی جواب نہیں لکھا تھا۔ وہ اگر منصب کے رویے پر حیران اور غصہ تھی تو ایسے کسی لمحے کی آمد سے خوف زدہ بھی بہت تھی۔ ادھر رمشہ وغیرہ کی اتنے دن کی خاموشی سے امی نے بھی کچھ کچھ اخذ کر لیا تھا کہ بات کوئی عام اور معمولی نہیں۔ اوپر سے آج اتنی جلدی تائی اور دادی کی آمد۔

"تو..... اب؟" وسیلہ نے گھبرا کر ایلیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"حوصلے سے سنو گی آپی۔؟" ایلیا نے اس کا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

"کک..... کیا؟" وہ واقعی کچھ بھی اور سننے کی حالت میں نہیں تھی۔

"صبح جب تائی نے اپنے آنے کے متعلق بتایا تو تحریم نے مومن بھیا کو منصب کے پاس بھیجا تھا۔" وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔ وسیلہ کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔

"مومن بھیا کو۔ منصب کے پاس۔ کیوں؟"

"ان کا جواب جاننے کے لیے۔"

"تو.....؟"

"منصب نے کہا کہ فی الحال وہ اپنی بہن

رمشہ کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اپنا گھر بسانے کا ابھی ان کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تو...... پھر......؟" وسیلہ کی آنکھیں ایسا صاف کورا جواب سن کر بے یقینی سے کھل گئی تھیں۔

"مومن بھیا نے کہا کہ منصب سے امید لگانا اب فضول ہے، شاید وسیلہ کو ہی کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ وہ رشتہ لانے میں واقعی انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ اور ابھی......" ایلیا کچھ کہتے کہتے رُک سی گئی۔ وسیلہ نے حیرت سے ایک سوالیہ نظر ڈالی۔

"دادی اور تائی ایک بار پھر امید لے کر آئے ہیں، انہوں نے دوبارہ رشتے کی بات کی ہے۔"

"اوہ......" اس نے بے ساختہ چہرا ہاتھوں پہ گرا لیا۔ بلکہ شروع ہونے سے پہلے ہی سب ایسے ختم ہوا تھا کہ وہ کچھ نہیں پائی یہ کیا ہوا۔ ابھی اس روز منصب نے کہا تھا، ہمارے بیچ انڈر اسٹینڈنگ کا کوئی مسئلہ نہیں اور آج اس ساری صورت حال کو انڈر اسٹینڈ کرنا کتنا مشکل بلکہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیسے دھوکے کا شکار ہوئی تھی۔ اپنے آپ سے نری شرمندگی محسوس ہوئی۔ گھر والوں کا سامنا کرنا، مومن بھیا کا سامنا کرنا کتنا تکلیف دہ تھا۔ بھیا اس کے متعلق کتنا اچھا سوچتے تھے، یہ اس نے اپنی نادانی میں کیا کر دیا۔

"میں نے امی سے کہا کہ انہیں تائی سے صاف الفاظ میں پوچھنا چاہیے کہ آخر ارحم کو کیا حق ہے کسی پر پریشر ڈالنے کا۔"

"امی سے کچھ مت کہو، میں ارحم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" وہ آنکھوں کی نمی صاف کرتے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"پلیز آپی، جلدی مت کرو...... تم نے ہی تو کہا رشتوں میں ایسا سب کچھ ہوتا ہے۔ تھوڑا وقت اور لینے دو، مجھے یقین ہے۔"

"پلیز ایلیا مجھے اپنوں کی نظروں میں اور رسوا نہ ہونے دو، میرے لیے مر جانے کا مقام ہے کہ مومن بھائی یا ندرت ممانی وغیرہ کے خیالات میرے متعلق کتنے تبدیل ہو چکے ہوں گے۔ منصب میرے لیے قطعی اجنبی تھا، میں نے شاید بھروسا کرنے میں عجلت سے کام لے لیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کو یہیں سدھارنا ہے، غلطی پر غلطی کرتے جانا سوائے پچھتاووں کے اور کچھ نہیں دے گا۔ اس چیپٹر کو میں آج ہمیشہ کے لیے کلوز کر رہی ہوں، امی اور ماموں وغیرہ کو میری زندگی کا فیصلہ کر لینے دو، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ رونا تو بند کریں۔" ایلیا نے محبت سے بہن کو اپنے ساتھ لگایا۔ اسے امی کو وسیلہ آپی کا پیغام دینا تھا لیکن نجانے دل مطمئن کیوں نہیں تھا۔ نہ اس کا دل منصب کو غلط ماننے کو تیار ہو رہا تھا نہ ہی ارحم کو بہنوئی کا درجہ دینے کو رضامند ہو رہا تھا۔ لیکن یہ آج کا دن بھی جیسے کچھ ان چاہے فیصلوں کے لیے بنا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ شام کو منگنی ہے۔ چہرا کیوں اترا ہوا ہے۔" مومن بازو پہ کوٹ لیے باہر نکل رہا تھا۔ نظر تحریم پہ پڑی تو اس کی طرف آیا۔ وہ ہاتھوں پہ سر گرائے صوفے کے ہتھے پر بیٹھی تھی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے تھوڑا سا سر اونچا کر کے نفی میں ہلایا۔

"کچھ کیسے نہیں...... ایسا پیلا ہلدی چہرا لیے بیٹھی ہو۔ بتاؤ نا کیا ہوا ہے؟" اس نے کوٹ وہیں سائیڈ پہ رکھ دیا۔

"ویسے ہی دل ڈوب سا رہا ہے اور ایسا تو اکثر محسوس ہوتا ہے۔ آپ کسی کو پریشان نہ کریں، باہر سب مہمان آنے والے ہیں۔"

"تم کچھ جوس وغیرہ پی لو۔ اچھا لگے گا۔ آؤ وہاں بیڈ پر بیٹھو۔" مومن اسے سہارا دیے پھوپھو کے بیڈ کی طرف لے آیا۔ وہ سب کچھ دیر پہلے یہاں پھوپھو کے گھر آ گئے تھے۔ فنکشن گھر میں ہی تھا۔ مہمان بھی کم تھے۔

"آرام سے یہیں بیٹھی رہو، زیادہ ایکسائیٹڈ

ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" مومن نے اس کے کان میں کہہ کر ہاتھ تھپکا اور مہمانوں کی طرف چل دیا۔ تحریم نے ہلکا سا مسکرا کر اس کی پشت دیکھنا چاہی لیکن آنکھوں کے سامنے جیسے سب دھندلا پڑ رہا تھا۔ معلوم نہیں سر ایک دم ٹھنڈا کیوں لگنے لگا تھا۔ دل ڈوبنے جیسا اور سینے کی جگہ ایک خلا محسوس ہونے لگا۔ اسی وقت ایلیا کمرے میں اسے لینے کے لیے آئی تو تحریم نے اس کی کلائی پکڑلی۔

"مجھے واش روم لے چلو۔"

ایلیا اسے سہارا دیے واش روم تک لے آئی۔ ارادہ تو اس کا باہر رک کر آپی کا انتظار کرنے کا تھا لیکن ندرت ممانی کی بار بار کال آرہی تھی تو وہ باہر چلی گئی۔ ادھر تحریم واش روم سے باہر نکلی تو طبیعت میں عجیب سی گراوٹ محسوس کرتے وہیں امی کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ کے وقفے میں تین مرتبہ واش روم ہو آئی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ بالکل نیا اور نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ اب تو اس سے باہر بھی نہیں جایا جا رہا تھا۔ وہ ایلیا کا انتظار کر رہی تھی، اسے اپنے لیے دوسرے لباس کی ضرورت تھی۔

پتا نہیں اس طرف کوئی آ کیوں نہیں رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھا، جیسے تیسے خود کو سنبھالتی ایک مرتبہ پھر واش روم گئی۔ ٹانگوں میں سکت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ نقاہت سے آواز تک نکلنا محال تھا۔ موبائل فون بھی پرس میں رکھا تھا اور پرس شاید وہ امی کے حوالے کر آئی تھی۔ وہ بمشکل اٹھ کر دروازے تک آئی۔ کسی کو بتانا اب بہت ضروری تھا۔ سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی، معلوم نہیں کون تھی۔

"ایلیا کو بلانا..... پلیز....." وہ کہہ کر وہیں قریب کرسی پر ڈھے گئی۔

"جی آپی..... ارے..... کیا ہوا؟" ایلیا عام انداز میں اندر داخل ہوئی لیکن تحریم کی حالت دیکھ کر حواس باختہ سی آگے بڑھی۔ آپی کا جسم معمول سے کچھ زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوا۔ وہ بنا رکے فوراً باہر بھاگی۔ مومن بھیا اور ندرت ممانی کو ساتھ ہی لے آئی تھی کھینچ کر انہیں اندر لے آئی حالانکہ باہر سب مہمان اب اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ ارحم نے انگوٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

ایلیا اس وقت خود بھی تحریم کو بلانے آرہی تھی۔ اسے آپی کی ایسی طبیعت کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ ندرت نے جب تحریم کی زبانی سب صورت حال سنی تو بری طرح پریشان ہو گئیں۔

"مومن!" جلدی سے گاڑی نکالو، دیر نہیں کر سکتے۔

"ایلیا، امی کو بلاؤ۔ ندرت کا چہرا فکرمندی سے فق ہو گیا تھا۔ ایلیا فوراً باہر بھاگی۔ امی دسیلہ کے پاس کھڑی تھیں، ارحم انگوٹھی پہنانے ہی والا تھا۔ اس نے امی کے کان میں پوری بات بتائی۔"

"اے ایک منٹ....." رضوانہ نے گھبرا کر بے ساختہ ارحم کو ٹوکا تو شہناز اور ارحم بری طرح چونکے۔

"خیریت..... کیا ہوا۔؟" شہناز کو کچھ اور ہی قسم کی سوچوں نے گھیرا۔ رضوانہ کا عین وقت پر روکنا۔ اسے تو ہول ہی اٹھنے لگے۔

"وہ..... تحریم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے ہاسپٹل لے جانا ہے۔ شاید ڈلیوری کا ٹائم۔"

"اوہ..... ارے۔" شہناز بری طرح کھسیا کر ہنس دی۔ ارحم نے بھی گہرا سانس لیا۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔ اس کو تو لے ہی چلتے ہیں، انگوٹھی پہنانے میں کتنا ٹائم لگتا ہے۔ ارحم، انگوٹھی پہناؤ، شاباش جلدی۔"

شہناز نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ رضوانہ کی صلاح انہیں قطعی پسند نہیں آئی۔ پتا نہیں کیوں عین وقت پہ رکاوٹ آن پڑی تھی۔ اور اسے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لانا تھا۔ پہلے بھی بڑی مشکل سے رضوانہ کو فوری منگنی کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ تب بھی یہی کہتی رہی تھیں کہ تحریم کی ڈلیوری سر پہ ہے، وہ ذرا فارغ ہو لے لیکن شہناز کو ان باتوں سے قطعی سروکار

نہ تھا۔ انہیں تو منگنی کے بجائے شادی ہی کرنی تھی لیکن رضوانہ اس کے لیے بالکل راضی نہیں تھیں۔ اور اب جبکہ انہوں نے منگنی پر اکتفا کر ہی لیا تھا تو اس سے پیچھے ہٹنا تو کسی طور منظور نہیں تھا۔

وسیلہ نے ماں کی بات سن کر ہاتھ پیچھے ہٹایا جبکہ ارحم نے اپنے ماں کی بات سن کر جھپٹ کر وسیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رضوانہ منتشر دماغ لیے بنا شہناز کی باتوں پر توجہ دیے وہاں سے ہٹ گئیں۔

تحریم کی طبیعت کا سن کر اور کوئی بات اہم ہی نہیں لگی۔ وسیلہ نے سر اٹھا کر جاتی ہوئی ماں کو دیکھا اور ارحم نے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنا دی۔ وسیلہ نے خالی خالی نظروں سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

نجانے تحریم کی طبیعت کا سن کر کیوں ایسا لگا جیسے اس ان چاہے بندھن سے جان چھوٹنے والی ہو۔ پر تائی اور ارحم نے ایسا کچھ نہیں ہونے دیا۔ اسے انگوٹھی پہنا دی گئی تھی۔ نہ وہاں ندرت ممانی تھیں، نہ مومن بھیا، نہ ایلیا، تحریم نہ امی۔ توفیق ماموں ویسے بھی اپنے گھر پر تھے۔

آس پاس موجود اس مجمعے میں کوئی بھی اپنا نہ تھا۔ وسیلہ نے خالی الذہنی سے ایک ایک کو دیکھتے عجیب سا اکیلا پن خود پر طاری ہوتے محسوس کیا۔

آج تو منگنی ہوئی تھی، کل کو بیاہ ہونے کے بعد اسے اسی طرح سب اپنوں سے بہت دور کسی نئی جگہ۔ اُف دل جیسے مٹھی میں آنے لگا۔ اگر یہ انگوٹھی منصب نے پہنائی ہوتی، کیا تب بھی دل ایسی ویرانی محسوس کرتا۔ وہ ایک بے ساختہ سے خیال کے آتے ہی چونک سی گئی۔

نجانے زندگی کے ایسے اہم موڑ پر وہ بے مہر کیوں یاد آیا تھا۔ اور اگر آج یاد آیا تھا تو آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے کرب سے لب چباتے خود کو ایک کٹھن فیصلے کا پابند کیا۔ مٹھیاں زور سے بھینچ گئی تھیں۔ ایک آنسو لڑھک کر انگوٹھی پہ گرا۔ اس نے جلدی سے انگلی اپنے پلو پہ رگڑی۔ ارحم کی نگاہیں اس کے ہاتھ پر تھیں۔ اسے یہ آنسو نظر نہیں آنا چاہیے۔ لڑکیاں اپنی منگنی پر تو نہیں رویا کرتیں۔ وہ بھلا ان آنسوؤں کا کیا جواب دے گی۔

''تائی جی؟'' اس نے سامنے کھڑی، اپنی ہونے والی ساس کا ہاتھ پکڑا۔

''ہاں، کہو......'' شہناز بری طرح چونکیں۔

''میں تحریم کو دیکھنے اندر چلی جاؤں۔''

''ارے ہاں، اب تو منگنی کی رسم ہوگئی۔ تم اندر جانا چاہو تو ...... ضرور...... ارے رواء، عالیہ، بچے، بھابی کو اندر لے جاؤ۔'' انہوں نے پاس کھڑی دو لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ وسیلہ اپنی جگہ سے فوراً ہی اُٹھ گئی۔ طبیعت عجیب مکدر سی ہو رہی تھی۔ اپنے ہی فیصلے انسان کو کبھی کبھار بڑی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اس اجنبی ماحول سے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہتی تھی جبکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ابھی چند لمحے پہلے ہی ایک بہت لمبی قید میں اپنی مرضی سے خود کو باندھ چکی ہے۔ کوئی بوجھ تھا جو پورے وجود پر پہاڑ جیسا آپڑا تھا۔

☆☆☆

تحریم آپریشن تھیٹر میں تھی۔ ڈاکٹرز کی بھاگ دوڑ رضوانہ کا دل ہولا رہی تھیں۔ بار بار وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوتیں۔ لپک کر باہر آتے والی ڈاکٹر سے کچھ پوچھنا چاہتیں لیکن ڈاکٹر ہو یا نرس۔ ان سنی کرتے پاس سے گزر جاتے۔ ندرت نے نند کا ہاتھ پکڑا تو وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔ پریشان کن نظروں سے مومن کی طرف دیکھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے گم صم کھڑا ان کا بیٹا الگ ہی بے بسی کی تصویر دکھائی دے رہا تھا۔ وسیلہ ایلیا کو لیے کچھ دیر بعد اپنی کار میں وہاں پہنچی تھی۔ رضوانہ اور ندرت دونوں کو ہی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ شہناز یا ارحم میں سے کوئی ان کے ساتھ نہ آیا تھا۔ وسیلہ نے بس عجلت میں اپنا لباس تبدیل کیا تھا۔

''سب خیریت؟'' اس نے امی کا ہاتھ تھاما تو وہ ضبط کھوتے رونے ہی لگیں۔

"دعا کرو۔ مجھے خود کچھ نہیں پتا۔"

"تحریم اندر ہے۔" ندرت نے آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"پیشنٹ کو خون کی ضرورت ہے۔" نرس باہر نکلی تو اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"میرا اور آپی کا بلڈ گروپ ایک ہے۔ چلیے۔" ایلیا فوراً اس کے ساتھ بھاگی۔ کسی کو کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ رضوانہ کو اپنی سانسیں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وسیلہ ماں کا چہرا دیکھتے الگ ہی فکر میں پڑ گئی۔ امی شوگر اور بلڈ پریشر کی پیشنٹ تھیں۔ نجانے یہ پریشانی کا وقت ان پر کیسے گزر رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پلیز اطمینان رکھیں۔" وہ برابر ان کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ دعا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا ہاتھ میں۔ دروازے کو لگاتار تکتے شاید بیس پچیس منٹ گزر گئے تھے جب اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وقت کچھ مزید آگے سرکا، شاید دس بارہ منٹ گزرے کہ نرس ایک بچے کو کمبل میں لپیٹے باہر لے آئی۔

"لڑکی ہے۔ اسے کچھ دیر آپ سنبھالیں۔ دوسرا بے بی بھی ہے۔" وہ فوراً اندر چلی گئی۔ ندرت بے بی کو اٹھائے خالی دماغ لیے کھڑی تھیں۔ خوشی کا موقع تھا۔ مبارک دینے کا وقت تھا۔ پر پتا نہیں نرس کا گھرا سنجیدہ چہرا کس خطرے کی گھنٹی بجا گیا تھا۔ وہ کھل کر خوش بھی نہیں ہو پائیں۔ وسیلہ اور مومن نے آگے بڑھ کر بچہ ان سے لیا۔

"ماشاء اللہ، کتنی پیاری ہے۔" وسیلہ کی آنکھیں اس ننھے گلابی وجود کو دیکھ کر نم ہو گئیں۔

"لاؤ......" مومن نے مسکرا کر بچی کو ہاتھ میں لیا جب نرس دروازہ کھول کر باہر نکلی تو ایک اور بچہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

"بیٹا ہے۔" اس نے بچے کو ایک بار پھر ندرت کے ہاتھوں میں دیا لیکن چہرے پر پہلے سے زیادہ کرب کے آثار تھے۔ ندرت کی آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹنا بھول گئیں۔ بچہ ہاتھوں میں تھا اور خالی خالی نظریں نرس کی آنکھوں میں۔

"میری بہو؟"

"جی...... وہ......" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پلٹ کر مومن کو دیکھا، پھر ندرت اور رضوانہ سے ہوتے اس کی نظریں وسیلہ پر رک گئیں

"وہ آپ کی پیشنٹ، کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ بی پی بہت لو تھا ان کا...... ویری سوری......" اس نے لب چبائے۔"

تب ہی ایک لیڈی ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلی۔ وسیلہ بھاگ کر اس کے نزدیک پہنچی لیکن اس نے سر کو نفی میں ہلایا۔

"آئی ایم ویری سوری۔ آپ کی پیشنٹ کا بلڈ بہت ضائع ہوا۔ اوپر سے کنڈیشن بہت کریٹیکل تھی۔ انہیں گھر سے جلدی لانا چاہیے تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ بچہ چاہے نہ رہے لیکن ماں بچ جائے لیکن۔"

"تت تحریم......" رضوانہ کا ہاتھ سینے پر پڑا۔ وسیلہ پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھے جا رہی تھی۔ تحریم نہیں مر سکتی۔ اس نے آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دیکھا۔ کیا واقعی اندر تحریم کا مردہ بدن۔

"نہیں......" وہ بے یقینی سے اندر دوڑی۔ ایک بیڈ پر تحریم آنکھیں بند کیے لیٹی تھی تو دوسرے بیڈ پر ایلیا، جس کی ڈرپ کو اتارا جا رہا تھا۔ وہ خود ہچکیوں سے رو رہی تھی، وسیلہ کو دیکھ کر ایک دھاڑ ماری۔ وسیلہ کا سر نفی میں ہل رہا تھا؛ اس نے تحریم کو دیکھا۔ نزدیک آئی اور اس کا کندھا ہلایا۔ پھر چہرا تھپکا۔

"اٹھو تحریم۔ تم ٹھیک ہو۔ بالکل ٹھیک۔" اس نے بہن کے دل پہ ہاتھ رکھا۔ سانسیں سست ضرور ہوئی ہوں گی، رک نہیں سکتیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔ اس کے بچے، اسے بھی دیکھنے چاہئیں۔ اس کے اپنے بچے۔ تحریم۔ تحریم ٹھیک ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ بس یہی سچ ہے۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی جب نرس نے اسے تحریم سے الگ کیا۔

''سنیے، باہر آپ کی والدہ کی طبیعت کچھ بگڑ گئی ہے۔ وسیلہ نے پھٹی آنکھوں سے نرس کو دیکھا۔ وہ بھاگ کر باہر آئی۔ امی ندرت ممانی کے کندھے پر لڑھک چکی تھیں۔ انہیں نرس ہی سنبھالا دینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ ندرت ممانی کے ہاتھوں میں بچہ تھا۔ مومن نے دوسرا بچہ جلدی سے نرس کو پکڑاتے خود بھی پھوپھو کو سنبھالا۔ نرس بچے کو لیے ایک سائیڈ پر ہو گئی۔ مومن اور وہ رضوانہ کو سہارا دے کر سامنے کے وارڈ میں رکھے بیڈ پر لے آئے۔ ایک دوسری نرس بھی فوراً وہاں آ پہنچی۔ ایلیا بھی آ گئی تو دونوں بچوں کو ان کے حوالے کر کے وہ امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ندرت ممانی اس دوران ایک ڈاکٹر کو بلا لائی تھیں، اب وہی رضوانہ کا چیک اپ کر رہی تھی۔ وسیلہ پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گئی۔

''وسیلہ...... وسیلہ......'' مومن بھیا نے اسے جھنجھوڑا تو وہ منہ کھولے انہیں دیکھے گئی۔

''پھوپھو اور بچوں کو گھر لے جاؤ۔ مجھے تحریم کو ایمبولینس میں پیچھے لاتا ہے۔''

''بھ...... بھیا!'' وہ پھٹی آنکھوں سے کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھی پر مومن نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروا دیا۔

''ابھی کچھ نہیں وسیلہ۔ رونے کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔ ابھی اٹھو اور ان سب کا حوصلہ بنو جو خود کو سنبھالنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ابھی کچھ نہیں۔'' مومن نے پلکوں کی نمی نچلا لب دبا کر وہیں بھینچ کر روک لی۔ فوراً ہی پلٹ کر باہر بھی نکل گئے۔ وسیلہ کی آنکھ سے پہلا آنسو مومن کی بے بسی پر بہہ نکلا۔ وہ اس وقت واقعی بالکل اکیلے تھے۔ بیمار باپ گھر پر تھا۔ تیسرا کوئی مرد کہیں نہیں تھا جسے وہ مدد کے لیے بلا لیتے۔ وسیلہ کو سوچ کر شدت کا افسوس ہوا کہ ابھی ابھی اسے ایک نئے رشتے میں باندھنے والا اس وقت یہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن نجانے وہ ان کے گھر پر بیٹھے کیا کر رہے تھے۔ وہ ہر بات جھٹک کر مومن بھیا کا حوصلہ بننے کے لیے اپنی جگہ سے ہٹی۔ کوریڈور میں ندرت ممانی بھیگی آنکھیں لیے ایک بچے کو سنبھالے بیٹھی تھیں۔ ایلیا نیچے فرش پر بیٹھی دھاڑیں مار کے رو رہی تھی۔

''ایلیا...... اٹھو...... ہوش کرو...... گھر چلنا ہے۔ رو لینا ساری زندگی۔'' اس نے تقریباً چیخ کر اسے جھنجھوڑا۔ ''اٹھو ممانی اور بچوں کو لے کر گھر جانا ہے۔ چلو۔'' اس نے ایک نظر کمرے میں دیکھا۔ اس کی امی کے پاس ڈاکٹر کھڑی تھی۔

''ان کی شوگر کی رپورٹ ٹھیک ہے۔ بلڈ پریشر ذرا زیادہ ہے۔ بے ہوشی صدمے کی وجہ سے تھی۔ انہیں گھر لے جائیے۔''

''اور بچے؟'' وسیلہ نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ کپکپاتی آواز پر قابو پایا۔ اب اسے ہوش میں رہ کر بھیا کی مدد کرنی تھی۔

''بچے دونوں بالکل نارمل اور تندرست ہیں۔ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔''

''اور آپی...... مطلب...... بچوں کی ماں۔ جن کی ڈیڈ باڈی۔'' وسیلہ کا گلا رندھ گیا۔ ڈاکٹر نے وسیلہ کے کندھے کو تھپکا۔

''حوصلہ کریں۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ میں ان کی رپورٹ بنوا دیتی ہوں۔ انہیں کچھ دیر میں لے جایا جا سکے گا۔''

''جی!'' اس نے ڈاکٹر کے جانے کے بعد ایک نرس کی مدد سے امی کو وہیل چیئر پر بٹھایا۔ امی اب ہوش میں تھیں، لیکن ایک دم چپ تھیں۔ وسیلہ نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ باہر لا کر انہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ ندرت ممانی اور ایلیا بچوں کو لیے باہر آئیں۔

''مامی، آپ پچھلی سیٹ پر دونوں بچوں کو سنبھال لیں گی؟'' وسیلہ نے ممانی کی طرف دیکھا۔ امی کو اس نے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔

''میں چاہتی ہوں۔ ایلیا یہاں مومن بھیا کے ساتھ رہے۔ یہ دونوں پیچھے ایمبولینس پر آئیں

گے۔“

”ہاں، میں سنبھال لوں گی۔ ایلیا تم مومن کے پاس رہو۔“ ندرت نے فوراً تائید کی۔

”آپ سب گھر جائیں۔ مومن بھائی کے ساتھ میں ہوں۔“ جانی پہچانی مردانہ آواز عین بہت قریب سے سنائی دی تو وسیلہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وردی میں ملبوس وہ منصب تھا جو نجانے کیسے۔ وہ حیرت سے ایک نظر ہی دیکھ پائی۔ نجانے کتنا کچھ دماغ سے لہروں جیسا ٹکرایا اور اس نے نظر ہٹالی۔

منصب نے ایلیا کو رکنے سے منع کر دیا۔ وسیلہ نے بھی مزید کچھ نہیں کہا۔ مومن بھیا کی مدد کے لیے ایک مرد میسر آ گیا تھا۔ فی الحال یہی کافی تھا۔ وسیلہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔

☆☆☆

”ربیا، عانی..... کیسے ہیں میرے بچے۔“ اس نے گردن کے نیچے سے ہاتھ گزار کر احتیاط سے بچی کو اٹھایا۔ عانس ندرت مامی کی گود میں تھا۔ وہ اسے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھیں۔

”رات کیسی گزری مامی؟“ ایلیا وہیں قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں بہتر رہی۔ بچے تو آرام سے سوئے رہے، تمہارے ماموں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تم سناؤ رضوانہ آپی کیسی ہیں اب؟“

”امی بھی بہت بے آرام تھیں۔ مجھے تو نیند آ گئی تھی۔ وسیلہ آپی بتا رہی تھیں، اذانوں کے ٹائم طبیعت بہت خراب ہوئی۔ ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ کہتی ہیں، گھٹن ہو رہی تھی۔ آپی نے شوگر لیول چیک کیا تو معمول سے بہت زیادہ تھا۔ آج ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔“ ایلیا ساتھ ساتھ ربیا کے کپڑے بھی بدل رہی تھی۔ جب اس نے بچی کو اٹھایا تو سینے والی جگہ سے شرٹ گیلی محسوس ہوئی۔ شاید اس نے کسی وقت دودھ الٹا تھا۔

”اور..... ماموں اب کیسے ہیں؟“

”ان کا بھی وہی بے خوابی کا مسئلہ ہے۔ بات بھی ٹھیک سے سمجھا نہیں پاتے نا۔ بس تحریم کے بعد بری طرح ڈسٹرب ہوئے ہیں۔ انہیں بھی اذانوں کے بعد کہیں نیند آئی ہے۔“

”پھر تو آپ کی رات بھی ڈسٹرب گزری ہوگی۔“ ایلیا کا ہاتھ رکا۔ مامی بے چاری اپنی کیفیت تو چھپا ہی جاتی تھیں۔

”رات تو مومن بھی نہیں سویا۔ مجھے تمہارے ماموں کے پاس جانا پڑتا۔ ادھر بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ مومن کو ان کے پاس چھوڑا تھا۔“

”اوہ..... تو نزہت خالہ اور عروبہ.....؟“ ایلیا کو اب تک کے وقت میں وہ نظر بھی نہیں آئی تھیں۔ حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ جب سے تحریم کی وفات ہوئی تھی ندرت کے پاس اُن کی بہن اور بھانجی عروبہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کی وجہ سے ندرت ممانی کافی سہولت محسوس کر رہی تھیں۔ ایلیا بھی اسی وجہ سے دن کے وقت بچوں کا خیال رکھنے یہاں آجاتی لیکن رات کو گھر چلی جاتی۔

”وہ دونوں تو پچھلی شام گھر چلی گئی تھیں۔ میرا بھانجا لینے آیا تھا۔ میرے بہنوئی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”اوہ۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں۔ یہاں میں آجاتی۔“ ایلیا نے سخت پشیمانی سے لب چبائے۔ ”ممانی آپ کچھ دیر آرام کر لیں، میں بچوں کے پاس ہوں۔“

”نہیں بیٹا۔ بس اب کیا سونا۔“

”نہیں مامی، پلیز ریسٹ بہت ضروری ہے۔ مومن بھیا بھی شاید اب کہیں جا کر سوئے ہیں۔“ ایلیا چونکہ ان ہی کے کمرے سے ہو کر اس چھوٹے روم میں آئی تھی تو اسے بے سدھ سوتا پایا تھا۔

”ہاں، آج تو سو رہا ہے۔ کل سے تو اس نے بھی آفس جانا ہے۔ پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی۔“ ندرت ممانی نے بھاری دل سے کہا۔ تحریم کو دنیا سے گئے آج پندرھواں دن تھا۔

”پھر تو میں ضرور آجاؤں گی، آج تا کہ بھیا

رات لو بے آرام نہ ہوں۔" اس نے فیصلہ کر کے سنا بھی دیا۔

ابھی دن کو گیارہ بجے اپائنٹمنٹ ہے۔ تمہارے ماموں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔"

"بھیا نے...... مینگورہ؟" ایلیا نے بے ساختہ گھڑی دیکھی۔

"ہاں۔"

"نو تو بج گئے مامی!" اس نے فکرمندی سے مامی کو دیکھا "سفر میں بھی ٹائم لگے گا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

"آپ بچوں کے پاس رہیں مامی! میں بھیا کو بھی جگاتی ہوں اور ناشتہ بھی بنا دیتی ہوں۔"

"ناشتا تو آج کل کرتا ہی نہیں ہے۔ چائے پی پی کر جان جلاتا رہتا ہے۔"

"انڈا بوائل کر دوں۔؟ اور۔ سلائس بھی سینک لیتی ہوں۔" وہ مستعدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ندرت نے سر ہلا دیا۔ ایلیا کے آجانے سے ہی دل مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ عابی کے پاس ہی کمر سیدھی کرنے لیٹ گئیں۔ جانے یہ کیسی خوشی ملی تھی، گھر ہی اُجڑ گیا تھا۔ پندرہ دن ہو گئے تھے، دن رات کا جیسے فرق ہی مٹ کر رہ گیا تھا۔ خالی خالی آنکھوں سے بچوں کو تکتے جانے کب آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ ان معصوموں کو دیکھتے سسک پڑتیں۔ اللہ کے رنگ وہی جانے۔ کچھ تو سوچ ہی رکھا ہو گا اس مالک نے۔ وہی بگڑی کو بنانے والا ہے۔ وہی قادر مطلق ہے۔

☆☆☆

ناشتا تو بن گیا تھا۔ ایلیا واپس آئی تو ندرت ممانی کو بے خبر سوتے پایا۔ وہ دبے پاؤں واپس مومن کے کمرے میں آئی۔ مومن بھیا نے چہرے پر کشن دے رکھا تھا۔

"بھیا!" اس نے حلق سے آواز نکالنے کی کوشش تو کی لیکن دبی دبی آواز میں کوئی زور نہیں تھا۔ وہ مامی اور بچوں کو بھی بے آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر مومن بھیا کے چہرے سے کشن ہٹایا۔

"ہوں......" مومن نے ذرا سی آنکھ کھول کر سے اوپر دیکھا۔

"وہ۔ آپ نے ماموں کو لے جانا ہے نا۔ اُٹھ جائیں۔" نیم روشنی میں پہچاننا تو مشکل تھا۔ لیکن شعور کچھ کچھ بیدار ہونے لگا، پہلا خیال وسیلہ یا ایلیا کا آیا تو وہ جھٹ سے اُٹھ بیٹھا۔

"ہاں، ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔" انداز ٹالنے والا تھا لیکن ایلیا گئی نہیں۔

"تم جاؤ، میں آجاؤں گا۔" اسے تنگ آکر کہنا ہی پڑا۔

"وہ...... میں نے ناشتہ بنا دیا ہے۔ آپ جلدی آئیے گا۔"

"صرف چائے چاہیے۔" وہ کمبل ہٹا کر بستر سے نکل آیا۔

"ایک انڈا بھی کھا لیں ابلا ہوا۔ اور سلائس بھی۔"

"امی کہاں ہیں؟" وہ اب ہاتھوں سے بال درست کرتے مکمل بیدار حالت میں دکھائی دے رہا تھا۔

"یہیں بچوں کے روم میں انہیں نیند آگئی ہے۔" ایلیا نے آواز پھر آہستگی۔

"او......" مومن کا لہجہ بھی خود بخود دھیما ہو گیا۔ "اوکے، میں وہیں کچن میں آجاتا ہوں۔" وہ آہستگی سے دروازہ بند کرتے باتھ روم میں چلا گیا۔ ایلیا نے ایک نظر چھوٹے کمرے میں ڈالی۔ بچے بھی دونوں سوئے ہوئے ملے، شکر ادا کرتے وہیں سے پلٹی۔

☆☆☆

"کیا ہوا، ایسے چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟" وہ وردی پہن کر کمرے سے نکلا تو رمشہ کو اداس مغموم سا بیٹھا دیکھا۔

"ایلیا وغیرہ سے بات کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں گی۔"

"ملنے چلی جاؤ۔" اس نے لہجہ مدہم رکھنے کی

کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ دل عجیب سی پشیمانی میں گھرنے لگتا تھا۔ ایک بوجھ سا دل پہ آپڑتا جو شاید اب زندگی بھر دل سے اترنے والا نہیں تھا

"پہلے اور بات تھی منصب! پر تمہارے انکار نے حالات ہی بدل دیے ہیں۔ وسیلہ کا سامنا نہیں کرسکتی۔" رمشہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ "جانے تحریم کے بعد زندگی کیسی کٹ رہی ہوگی۔ دو معصوم بچے۔ گھر کا اتنا سوگوار ماحول۔ رضوانہ آنٹی کی حالت سوچوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ اُف۔" اس نے جھرجھری لے کر آنکھیں میچیں "اللہ کسی کو جوان اولاد کا دکھ نہ دکھائے۔"

"آمین......" منصب نے ایک آہ بھری۔

"حالات ایسے نہ ہوجاتے تو کم از کم اس دکھ کی گھڑی میں ہم ان کے پاس تو ہوتے۔"

"اتنا مت سوچو۔ وقت ہر درد کا مرہم ہوتا ہے۔ جیسے تیسے حالات سے انسان سمجھوتا کرہی لیتا ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی کچھ دن میمونہ باجی کے پاس ہوآؤ۔ موسم بھی بدل رہا ہے۔ ذرا مائنڈ چینج ہوجائے گا۔" منصب نے پل میں فیصلہ کیا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔"

"ابھی نہیں چاہ رہا۔ جب چلی جاؤ گی تو موڈ بھی بہتر ہوجائے گا۔"

"تم چھوڑ آؤ گے؟" وہ نیم رضامند ہوئی۔

"ہاں، تم تیاری کرلو، آج، کل یا جب بھی تم کہو، میں ڈیوٹی ٹائم کے بعد چھوڑ آؤں گا۔ مجھے بتا دینا۔"

وہ کیپ اٹھا کر سر پر جماتے ہوئے باہر نکل گیا۔ رمشہ بس خالی الذہنی سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ تھانے جانا بھی جیسے روٹین کا ایک کام لگا، پھر بھی اس نے دل کو راضی کرلیا۔

میمونہ باجی تو خوش ہوجائیں گی۔ پھر یہاں کے حالات پر میمونہ سے بات کرکے شاید وہ دل کا بوجھ کچھ ہلکا کرپائے۔ بالآخر ایک فیصلے پر پہنچتے اس نے بھی جانے کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

"کسی ٹائم بچوں کو یہاں لے آؤ وسیلہ۔"

رضوانہ نے نیم دراز ہوتے نقاہت سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ خود وہ اپنی طبیعت کی وجہ سے زیادہ کہیں آ، جا نہیں سکتی تھیں۔ بچے تو جب سے تحریم فوت ہوئی تھی اپنے گھر میں ہی تھے۔ شروع کے دنوں میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا رش لگا رہا۔ ندرت نے بچوں کو اپنے ہاں ہی رکھا۔

"ایلیا بتا رہی تھی ربا کی شکل بالکل تحریم کی طرح ہے۔" وہ سوگوار مسکراہٹ لیے کھوئی کھوئی نظروں سے وسیلہ کو دیکھ رہی تھیں۔ وسیلہ نظر چرا کر باہر نکل آئی۔

پندرہ بیس دن ہوگئے تھے، ایلیا اب رات کو ممانی کے پاس ہی رہتی تھی۔ دن کے وقت بھی تھوڑی دیر کے لیے چکر لگاتی، زیادہ وقت اس کا بچوں کو سنبھالنے میں ہی لگ رہا تھا۔ وسیلہ کا چکر تو ضرور لگتا لیکن بچے سنبھالنا اسے نہیں آتا تھا۔ پھر امی کی طبیعت کی وجہ سے اسے مکمل ٹائم ان ہی کو دینا پڑ رہا تھا۔ ایلیا کی مدد سے وہ دونوں بچوں کو کچھ ہی دیر میں امی کے پاس لے آئی۔

"ماشاء اللہ۔" انہوں نے ہنس کر عابس کو گود میں لیا تو وسیلہ کو لگا امی جیسے دنوں بعد مسکرائی تھیں۔

"ایلیا، تم تو بالکل دادی اماں کی طرح بچوں کو پالنے میں لگی ہو، میں نے جب دو ہفتوں کے دیکھے تھے تو بلی کے بلونگڑے لگتے تھے۔ اب تو صحت ماشاء اللہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

"تیل کی مالشیں کرکر کے رگڑ رہی ہوں دونوں کو۔" اس نے ہاتھ مسلے تو وسیلہ بھی ہنس دی۔ ستمبر کے آخری ایام چل رہے تھے۔ بچے اب مہینے بھر سے اوپر کے ہوگئے تھے۔

"انہیں تو چھوڑو، مجھے بھی ایلیا کی مالشوں کی عادت پڑ گئی ہے۔" ندرت ممانی ان کی بات سنتے ہوئے صحن میں داخل ہوئیں۔

"آؤ۔ آؤ۔ تم بھی بڑے دنوں بعد نکلی ہو۔"

رضوانہ نے اپنے قریب ندرت کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ "توفیق کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"جی، اب تو بہت بہتر ہے۔"

"نیند کا مسئلہ حل ہوا؟"

"جی ہاں، کچھ تو دواؤں کی وجہ سے، کچھ اب خود بھی صدمے سے باہر نکلے ہیں۔ بچوں کو ان کے پاس لے جاتی ہوں تو خوش ہوتے ہیں۔"

"اور تمہیں کیوں مالش کی ضرورت پڑ گئی۔"

"کیا بتاؤں، خود بھی سمجھ نہیں پا رہی۔ سر جیسے بالکل خالی خالی لگتا ہے۔ مومن کہتا ہے اپنا بلڈ پریشر چیک کرواؤں۔"

"صحیح تو کہتا ہے۔ چیک کروا لینے سے کم از کم پتا تو چل جائے گا۔"

"بس ابھی تو ایلیا کی مالشیں بالکل صحیح کام کر رہی ہیں۔ وہ مسکرا دیں۔ "طبیعت ایک دم بحال ہو جاتی ہے۔"

"بچے زیادہ تنگ تو نہیں کرتے رات کو؟

"انہوں نے عابس کو سلا کر ریبا کو اپنی گود میں لیا۔

"ریبا تو بہت اچھی بچی ہے۔ ایک بار دودھ مانگتی ہے، کہیں دو ڈھائی بجے کے قریب۔ اور پھر سو جاتی ہے۔ لیکن یہ عابی بہت شرارتی ہے۔ اسے تو نیند ہی کہیں ایک بجے کے آس پاس آتی ہے۔ ایلیا کی مالشیں بھی کارگر نہیں اس پر۔"

"تحریم بھی ایسی تھی۔ دیر تک جاگنا، اچھل کود مچائے رکھتا۔" رضوانہ جیسے بالکل ہی بے ساختہ اس کا نام لے بیٹھی تھیں۔ خود پر قابو پاتے پھر بولے ہی گئیں۔ جانے یہ درد ان کے نصیب میں کیوں لکھا تھا۔ کاش اللہ انہیں اٹھا لیتا۔ کم از کم عمر تو تھی جانے کی ۔ وہ پھر ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔

"ایلیا بتا رہی تھی، شہناز کا فون آیا تھا، کسی خاص سلسلے میں؟" انہوں نے نند کا دماغ ہٹانا چاہا۔

"ہاں، کال تو میں نے کی تھی، تحریم کا چالیسواں ہے تین دن بعد سوچا بلا لوں انہیں، تو وہ کہنے لگیں کہ خود ہی آنا چاہ رہی تھیں۔ وہ چاہتی ہیں ، چالیسواں گزرتے ہی سادگی سے شادی کر دی جائے۔"

"اتنے جلدی۔" ندرت کو سن کر ہی حیرت ہوئی۔

"مامی! آپ سمجھائیں نا امی کو۔ فی الحال یہ شادی وادی کی بات بالکل بھول جائیں۔" وسیلہ نے ندرت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"تو کیا آپ ان کی بات ماننا چاہتی ہیں؟" ندرت نے تعجب سے رضوانہ کو دیکھا۔

"اور کیا کروں، اب رشتہ کیا ہے، اگلوں کی بات تو سننا پڑے گی۔"

"مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔ پھر آپ کی طبیعت کا معاملہ، گھر کے حالات۔"

"ہاں، کہا تو میں نے بھی ہے۔ پر وہ کہتی ہیں، ماحول بہت سوگوار ہے، تھوڑی خوشی کی فضا بن جائے گی۔"

"کہاں بنے گی، خوشی کو تو وہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پیچھے تو آپ اکیلی رہ جائیں گی۔"

"لیکن یہ فرض بھی ادا تو کرنا ہے۔ آج یا کل۔" رضوانہ تو جیسے سوچے ہی بیٹھی تھیں۔

"تو پھر کل پر ہی رکھیں۔" وسیلہ نے برا سا منہ بنایا "فی الحال کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ منگنی کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پتا نہیں آپ کو کیا جلدی پڑی تھی۔"

وسیلہ کو جب بھی اپنا منگنی والا دن یاد آتا، ایک بوجھ سا آ پڑتا، یوں لگتا جیسے اچانک پاؤں کسی جال پہ جا پڑا تھا۔ بچنے کی سب کوششیں بے سود گئی تھیں۔

☆☆☆

"اسلام علیکم۔"

"وعلیکم اسلام۔" وہ مسکراتے ہوئے سائیڈ پر آ گئی۔

"کیا حال ہیں ڈاکٹر صاحبہ، مصروف تو نہیں؟"

"جی زیادہ نہیں۔ کچھ خواتین امی سے ملنے آئی ہوئی تھیں، یونہی ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اب اندر آ گئی ہوں۔"

"تو۔ کیسی رہی صہیب سے ملاقات؟" عیسیٰ کو کچھ جاننے کی جلدی تھی۔

"جی۔ اب تو وہ بہت کھل کر ہر بات ڈسکس کر لیتا ہے۔ مشورے بھی مانگتا ہے۔ بھروسا کرتا ہے مجھ پر۔" تانیہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

"کہنا بھی مانتا ہے کچھ؟" عیسیٰ نے جاننا چاہا تو بات تانیہ کی بھی سمجھ میں آ گئی۔

"جی، کہہ سکتے ہیں کہ اب سننے لگا ہے۔ زیادہ بحث بھی نہیں کرتا اب۔"

"تھینک گاڈ!" عیسیٰ نے سکون سے پلکیں بند کیں "مجھے یقین ہے تانیہ، آپ کے توسط سے صہیب کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ، میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔"

"اور...... کیا لگتا ہے۔ کتنا ٹائم لگ سکتا ہے صہیب کو اس قید سے نکلنے میں؟"

"یہ کہنا تو مشکل ہے۔ پہلے صہیب نصیحت سننے لگ جائیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

"ہوں...... اور نصیحت کرنے والی دور بہت ہے۔ تو کیوں نہ اسے قریب لانے کی کوشش کی جائے۔"

"جی......؟" وہ جملے میں چھپی شرارت کو سمجھ تو گئی لیکن لہجہ بہت سنجیدہ رکھا۔

"تم یہاں آ جاؤ، اس گھر میں تو کیا لگتا ہے ایک ساتھ دو، دو مریضوں کا علاج نہیں ہو جائے گا؟"

"پتا نہیں۔ وہ بری طرح جھینپ گئی" "یہ دوسرا مریض تو خواہ مخواہ گلے پڑ رہا ہے۔"

"اچھا۔ پھر تو سوچ لیں۔ ابھی بھی وقت نہیں گیا۔" اس نے بظاہر عام انداز میں کہا لیکن دل نجانے کیوں کچھ پژمردہ سا ہوا تھا۔ تانیہ سے جواباً وہ کسی خوب صورت اظہار کا منتظر رہا تھا۔

"اب ایسا بھی کچھ نہیں۔" اس نے دھیمے انداز میں کہا تو عیسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لب دبائے وہ اس کے کچھ اور کہنے کا منتظر تھا۔

"کیسا۔ کچھ نہیں؟" کچھ دیر بعد استفسار کیا۔

"میرا خیال ہے۔ صہیب کو نزدیک رہ کر سمجھانا واقعی اچھا رہے گا۔" تانیہ نے بھی کچھ دیر ٹھہر کر جملے منتخب کر کے کہہ ہی دیا۔ اس بار عیسیٰ بے ساختہ کھل کر ہنس دیا تھا۔ تانیہ کو دوست نما پارٹنر سمجھنا اس کی بھول ہرگز نہیں تھی۔ وہ دل سے خوش ہوا۔

"میں آج ہی امی سے بات کرتا ہوں، اور وہ تو ویسے بھی تیار بیٹھی ہیں۔ تم بس اپنے پیرنٹس سے صلاح کر لو۔"

"مجھے کیا ضرورت۔ بڑے ہیں نا۔ آپس میں بات کرنے والے۔" اس نے عیسیٰ کی بات اسی کو لوٹائی تو وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

"مجھے ویسے شرارتی دوست بھی بہت پسند ہیں۔"

"اور مجھے صاف گو دوست۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ سردار عیسیٰ کا دل آئینے سا شفاف ہے۔ وہ جب ہلکا سا مایوس بھی ہوتا ہے کچھ خاص سننے کے لیے تو فوراً محسوس ہو جاتا ہے۔" تانیہ نے اس بار زیادہ کھل کر کہا اور عیسیٰ خوش گوار حیرت سے دوچار ہوا۔ تو تانیہ نے اسے جملے میں ہی پا لیا کہ وہ جواباً کچھ اچھا سننا چاہتا ہے۔

"میں خوش نصیب ہوں تانیہ! کہ مجھے تم مل رہی ہو۔"

"تھینک یو عیسیٰ۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ اور اپنی بچی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں۔"

"ان شاء اللہ وہ وقت بہت قریب ہے۔"

"ان شاء اللہ"

☆☆☆

"چلیں مامی...... میں تیار ہوں۔" وہ خود کو مستعد ظاہر کرتے دوڑ کر برآمدے میں پہنچی اور میز

کے کونے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ مومن نے کالے چشموں میں سے گھور کر اوپر دیکھا۔ اور وہ اسی عذاب سے تو ڈر رہی تھی۔ دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ مومن بھیا جانے کے لیے ایک دم ریڈی بیٹھے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھ رہے ہیں۔ یعنی کہ وہ لیٹ ہے۔ اسی سوچ نے سرپٹ بھاگنے پہ مجبور کیا اور وہ میز سے آ لگی۔

"آؤ۔ بچوں کو لے آتے ہیں۔" ندرت ممانی نے اندر کا رخ کیا۔

"خیال سے اٹھانا۔" پیچھے سے بارعب تنبیہ آئی اور وہ دانتوں میں زبان دبائے اندر بھاگی۔

دونوں بچوں کو حفاظتی انجکشن لگنے تھے۔ بھیا نے آفس سے دو گھنٹے آف لیا تھا۔ وہ اور ندرت ممانی بچوں کو لیے حفاظتی مرکز جانے والے تھے۔ رات کو وہ معمول کے مطابق یہیں رہی تھی۔ ناشتے کے بعد تیاری کے لیے گھر چلی گئی تھی۔ اب تو بڑے دن ہوئے عادت سی ہو چلی تھی۔ وسیلے نے اپنا گھر اور امی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھالی تھی تو وہ ندرت مامی کے ساتھ مل کر بچوں کا خیال رکھتی۔ سب کچھ جیسے اپنے آپ طے ہوتا گیا۔ دن کے وقت میں مامی کو توفیق ماموں کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا۔ تب ایلیا دونوں بچوں کو باری باری اٹھا کر اپنے گھر لے آتی۔ وسیلہ کا خیال یہ تھا کہ امی جب بچوں کے ساتھ ٹائم گزارتی ہیں تو تحریم کا صدمہ بہت دیر کے لیے جیسے کہیں دور چلا جاتا ہے۔ ادھر ممانی بھی دن کے اوقات میں کچھ آرام کا وقت گزار لیتیں۔ وہ، امی اور ایلیا بچوں کو زیادہ اچھی طرح سنبھال لیا کرتے۔

"فائلیں اٹھالی دونوں کی؟" مومن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے یاددہانی کرائی۔

"ہاں، میں نے رکھ لی ہیں۔" مامی نے عابی کو لیا ہوا تھا۔ ایلیا نے ریبا کا کیریئر لیا اور احتیاط سے پچھلی سیٹ سنبھالی۔ حفاظتی مرکز وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں مومن کی گاڑی وہاں تک پہنچ گئی۔ ندرت اور ایلیا اس کے کار پارک کرنے تک اندر پہنچ گئے۔ اور جب مومن پہنچا تو ایلیا ریبا کو لیے آگے آئی ہوئی تھی۔ عابی کا انجکشن ہو گیا تھا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ ندرت اسے پچکارتے کمرے سے باہر نکل چکی تھیں۔ ایلیا ڈرتے ڈرتے بنچ پر بیٹھ تو گئی تھی لیکن یہ اس کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ اُسے زیادہ فکر یہ تھی کہ ریبا عین وقت پر ہلنے نہ لگے۔

"مجھ سے نہیں سنبھالی جائے گی۔" اس نے گھبرائی نظروں سے نرس کو دیکھا۔

"پہلے بھی تو آئے تھے نا تم لوگ؟" مومن کو حیرت ہوئی کہ یہ بچوں کا دوسرا انجکشن تھا۔ اور پچھلی مرتبہ بھی ایلیا اور اس کی امی آئے تھے لیکن تب انہیں وسیلہ لائی تھی۔

"انجکشن مامی نے ہی لگوائے تھے۔"

"آپ پکڑنے میں ان کی مدد کر دیں۔" نرس نے ایلیا کے قریب بنچ پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُن دونوں کو کپل سمجھ رہی تھی۔ مومن نے تنی بھنووں سے ایک نظر ایلیا کو دیکھا۔

"لاؤ، مجھے دو، میں لگواتا ہوں۔" اس نے بجائے بیٹھنے کے ریبا ہی اس سے لے لی۔ ایلیا جلدی سے اٹھ گئی۔ مومن نے ہی ریبا کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑا اور نرس نے انجکشن لگا دیا۔ ریبا ہلکا سا چیخ کر فوراً ہی چپ بھی ہو گئی تھی۔

"بوائے کی نسبت بچی کی کرو تھ کچھ سلو لگتی ہے۔" نرس نے اپنا تجربہ ظاہر کیا۔ مومن اور ایلیا نے بیک وقت گھبرا کر ریبا کو دیکھا۔

"ارے آپ دونوں کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" نرس مسکرا دی "ٹوئنز کے معاملے میں ایسا عام دیکھنے میں آتا ہے۔ ماں کی توجہ اکثر بچوں کی طبیعت یا کبھی کبھار اُن کے مزاج کی وجہ سے کسی ایک کی طرف ذرا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں شریف بچہ ہی اکثر بے توجہی کا شکار ہوتا ہے۔"

"تو......کیا کرنا چاہیے؟" مومن کی فکر میں کمی نہیں آئی تھی۔ پریشان کن نظروں سے وہ نرس کو دیکھے جا رہا تھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں۔ کچھ بچے شور مچا کر دودھ مانگتے ہیں، تو زیادہ مقدار حاصل کر لیتے ہیں، کچھ دیر تک چپ چاپ سوئے رہتے ہیں۔ یہ تو ماں زیادہ بہتر بتا سکتی ہیں۔" اس نے پھر ایلیا کی طرف اشارہ کیا۔ مومن نے تو اس کی غلط فہمی کو اگنور کیا۔ وضاحت دینا بھی ضروری نہیں سمجھا اور بچ سے اٹھتے ریبا ایلیا کو تھما دی۔ لیکن دروازے میں آئی ندرت نے جیسے پہلی مرتبہ بڑی پرسوچ نظروں سے مومن اور ایلیا کو دیکھا۔ کھینچ کر اونچی پونی ٹیل باندھے پیلی فر والی شال چہرے کے گرد لپیٹے بلیک چیسٹر میں وہ بچہ مومن سے لیتے اُس کیجورمرد کی وائف اور بچے کی ماما ہی تو لگ رہی تھی۔

"ہم..... میں۔ خالہ ہوں۔" ایلیا کی شرمندگی عروج پر تھی۔ اسے اب ایک بھی بار اور اپنے لیے "ماں" کا لفظ نہیں سننا تھا۔

"او..... سوری!" نرس نے بے ساختہ زبان دانتوں میں دبائی۔ مومن باہر نکل گیا اور وہ بھی ریبا کو لیے پیچھے پیچھے دوڑی۔

"دونوں کے کھانے پینے کا ایک جیسا خیال رکھنا چاہیے۔" مومن نے گاڑی آگے بڑھاتے سمجھانا شروع کیا۔

"نرس کا کہنا بھی غلط نہیں لیکن بڑے کہتے ہیں، بچے کی صحت اچھی ہونی چاہیے۔ وزن میں اونچ نیچ کی اتنی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اب کھانا پینا تو ہر بچہ اپنی ضرورت کے مطابق ہی کرتا ہے۔ پھر ریبا لڑکی ہے۔ بچیاں تو نازک ہی ہوتی ہیں۔" ندرت مامی اس کی تسلی کے لیے کہتی چلی گئیں۔

"ہاں لیکن بچی کو اٹھائے اٹھائے پھرنا ہی کافی تو نہیں ہے۔ وقت پر دودھ دینا بھی تو ضروری ہے۔" مومن نے بیک مرر میں ایلیا کو گھورا اور ایلیا تو گھورنے سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ اسی پر چوٹ ہو رہی ہے۔ عالی کی نسبت ریبا ہی اس کے پاس زیادہ رہتی تھی۔

"اب تم من وعن نرس کی بات پہ یقین نہ کرو نا۔ دونوں کے فیڈر ایک ساتھ ہی بجتے ہیں۔"

ندرت کو غصہ آنے لگا۔ مومن نے بھی اس بار بنا جواب دیے اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆

"میں کہہ رہا ہوں امی، مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ اور ہمارے بیچ اتنی لمبی مدت کی بات ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے ان الجھے بکھیڑوں سے میری کمٹ منٹ پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔ آخر میں کب تک بہانے بناؤں۔" ارحم بری طرح بھڑکا ہوا لگ رہا تھا۔

"ارے تو مجھے بھی کہاں اندازہ تھا۔ پھر موت فوت بتا کر آتے ہیں۔ ان کے گھر میں شادی بیاہ کا ماحول کہاں رہا تھا۔ تم نے چالیسویں کے فوراً بعد کا کہا تو انہوں نے بات نہیں مانی تھی۔ پر اب تو چھ ماہ ہو گئے، اب تو مان لینا چاہیے۔"

"تو کوئی ڈھنگ کی وجہ بتائیں۔ ایسے تو ایک سال بھی آپ کی بات کوئی نہیں سننے والا۔"

"کیا کہوں۔ کوئی وجہ بھی تو نہیں مل رہی۔" شہناز بری طرح بے چین دکھائی دیں۔

"دادی سے کہلوائیں۔"

"وہ بڑھیا خود اس تحریم کے غم میں ڈوبی ہے۔ کہتی ہے۔ ابھی ابھی پوتی کو دیکھنا نصیب ہوا تھا اور اللہ نے واپس بھی لے لی۔"

"تو سمجھائیں انہیں کہ جانے والی کے سوگ میں ڈوبنے کے بجائے دوسری پوتی کی خوشی وقت پر دیکھ لیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" شہناز کا لہجہ پہلی مرتبہ کچھ پرسوچ ہوا "تمہاری دادی سے کہلوانا ٹھیک رہے گا۔ لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ دن اور خدمتیں کرنی ہوں گی۔ سنو۔" وہ سرگوشی کے انداز میں کہتے اس کے قریب آئیں۔

"کل تمہاری دادی کا چیک اپ ہے۔ ہمیشہ تو ڈرائیور ہی لے جاتا ہے۔ اب جہاں اتنے سعادت مند بنے ہوئے ہو۔ ایک چکر ڈاکٹر کا خود لگوا

آؤ۔ دیکھنا پوری پگھل جائے گی۔ پہلے بھی حیران پریشان ہے ہمارے بدلے رویوں پر۔"

"ہوں!" ارحم نے لب بھینچ کر سوچا "لیکن سن لیں آپ۔ ان ہی پندرہ دنوں کے اندر شادی کی ڈیٹ نہ رکھی گئی۔ تو میں پھر نہیں رکنے والا۔"

"ہاں، میں کرلوں گی۔ اب تم سمجھو۔ کسی بھی قیمت پر۔" شہناز نے مصمم ارادہ باندھتے جیسے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ دراصل اس کا مشن تھا کیا۔

☆☆☆

ایلیا اس وقت چھوٹے کمرے میں اکیلی تھی۔ عصمت مامی کچھ دیر پہلے ماموں کو دیکھنے گئی تھیں۔ عالی تو دودھ پی کر سو گیا تھا۔ مامی اسے کاٹ میں سلا گئی تھیں۔ ریا آج شرارت کے موڈ میں تھی۔ شام کو دیر تک سوتی رہی تھی اس لیے ابھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ مامی کے جانے کے بعد ایلیا، اسے چھوٹے کمرے میں ہی دیر تک ٹہلاتی رہی تھی اور اب کہیں ساڑھے بارہ بجے اسے بھی نیند آگئی۔ ایلیا نے اسے اس کے کاٹ میں سلایا اور اب سونے سے پہلے اسے واش روم جانا تھا۔

اس نے چھوٹے کمرے کا دروازہ آدھا کھول کر مومن بھیا کے روم میں جھانکا۔ اس کا خیال تھا وہ بہت دیر پہلے سو چکے ہوں گے۔ لیکن وہ بجائے بستر کے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ چھوٹے کمرے کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ ایلیا جھجک کر وہیں رک گئی۔ جہاں بھیا بیٹھے تھے، وہیں سامنے ہی تو اٹیچ باتھ کا دروازہ تھا۔ اسے آگے بڑھنے کی بالکل ہمت نہیں ہوئی۔

آہستہ روی سے چلتے واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کمرے کے سنگل بیڈ پر مامی سوتی تھیں۔ تب ہی ایلیا نے اپنا بستر نیچے کارپٹ پر بنا لیا تھا۔ نیچے بچھے میٹرس پر بیٹھتے اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ پلکیں بند کیں تو مسکراتی ہوئی تحریم کا چہرہ نظروں میں پھر گیا۔ ایلیا نے گہری آہ بھر کر آنکھیں کھولتے دروازے کی طرف دیکھا۔ جانے بھیا کو نیند کیوں نہیں آرہی، جانے وہ آپی کو کتنا مس کرتے تھے۔

چھ ماہ گزر گئے تھے، یہاں گھر کا ہر فرد تحریم کے جانے کے بعد اپنے ہی غم سے نبرد آزما تھا۔ گزرے چھ ماہ میں شاید ہی کسی کو مومن بھیا کے ساتھ بیٹھ کر ان سے ہمدردی کرنے، ان کا دکھ بانٹنے کا خیال آیا ہو۔ اُن کے اور ماموں کے علاوہ یہاں سب عورتیں تھیں۔ سب ہی نے خوب رو پیٹ کر اپنا دل ہلکا کیا تھا لیکن مومن بھیا کا درد تو جیسے ان کے اندر کہیں پھیل کر جھیل بنا تھا۔

ایلیا کا دل چاہا ابھی جا کر ان کے پاس بیٹھ کر ان سے کہے۔ آج مجھ سے آپی کے موضوع پر اتنا بولیں، اتنا بولیں کہ صبح تک آپ کے دل کے سارے بوجھ ہلکے پڑ جائیں۔

"ابھی تک جاگ رہی ہو۔" ندرت مامی بے آواز کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ایلیا کو بیٹھا دیکھ کر آہستہ آواز میں پوچھا تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"جی، وہ مجھے واش روم جانا تھا۔"

"ہاں تو ہو آؤ۔ پہلے بھی دیکھو کتنا ٹائم ہو گیا ہے۔ تھوڑا ریسٹ کرلو، اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جاگ جائے۔" انہوں نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

"جی، وہ مومن بھیا جاگ رہے تھے تو۔" ایلیا جھجک گئی۔

"آں...... ہاں......" ندرت کو پہلی بار دھیان آیا۔ "یہ بھی پتا نہیں کیوں بے خوابی کا شکار رہتا ہے۔ کتنا سمجھایا ہے، خود کو سوچ سوچ کر مت ہلکان کیا کرو۔ پر سمجھتا کہاں ہے...... آؤ تم" وہ دبے دبے انداز میں کہتے اس کے آگے چل پڑیں۔

"سو جاؤ مومن! صبح آفس بھی تو جانا ہے۔" ندرت اس کمرے میں آکر بیٹے سے بات کرنے لگیں اور ایلیا۔

☆☆☆

"ایک تو میری یہ سمجھ میں آرہا آپ کو جلدی کس بات کی ہے۔ سچ پوچھیں نا پھوپھو۔ تو مجھے اس

منگنی کی بھی کوئی تک سمجھ میں نہیں آئی۔"

مومن سامنے بیٹھا سخت جھنجلایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ وسیلہ ذرا دور ڈائننگ ٹیبل کے پاس بیٹھی تھی۔ مومن آفس سے آکر کھانا وغیرہ کھانے اور ریسٹ کر لینے کے بعد روزانہ ہی پھوپھو کے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ آج جب وہ آیا تو رضوانہ نے اسے شہناز کے اصرار کے متعلق بتایا۔ مزید یہ کہ وہ خود بھی اب یہی چاہ رہی ہیں کہ وسیلہ کی جلد شادی کر دی جائے۔

"ٹھیک ہے وہ لوگ آپ کے بہت قریبی سسرالی ہیں۔ بچوں سے ان کا خونی رشتہ ہے لیکن اتنی مدت بعد ملنا جلنا ہو تو بندہ کچھ وقت تو لیتا ہی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مومن، ان لوگوں کے ساتھ ہمارے حالات تو واقعی ایسے رہے تھے کہ کم از کم سال بھر ہمیں سوچ بچار کے لیے لینا ہی چاہیے تھا لیکن میری تسلی کی وجہ، صرف اماں جی کی موجودگی ہے۔ ان کا آنا اور رشتے کے معاملے میں راضی خوشی شرکت کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان سب کے حوالے سے مطمئن ہیں۔ مجھے لگتا ہے ارحم کی سوچ نے یقیناً گھر بھر کے خیالات کو تبدیل کر دیا ہے۔ وہ آج کا بچہ ہے، اسے اُن بکھیڑوں سے بالکل کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ وسیلہ کو یونی ورسٹی کے وقت سے پسند کرتا ہے۔ پھر تو سوچو کہ وسیلہ کی یہ کیسی خوش نصیبی ہے۔ چاہنے والا جیون ساتھی مل جائے تو قدر کرنی چاہیے۔"

"چلیں مان لیا..... آپ کا دل ہر حوالے سے مطمئن ہے لیکن یہاں گھر کا ماحول تو دیکھیں، تحریم کو گئے ابھی چھ ماہ ہوئے ہیں۔ لوگ کیا سوچیں گے۔"

"لوگ ہزار باتیں بنالیں ایک ماں کی محبت پر کبھی شک نہیں کر سکتے۔ دل تو میرا اجڑا ہے۔ مجھ سے بہتر کون ہوگا جو اس درد کو محسوس کر سکے۔ پھر شہناز سے سادگی کے ساتھ نکاح اور رخصتی کی بات کر لی ہے۔ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جلدی شادی کرنا ہماری بھی مجبوری ہے۔ اماں پہلے ہی بیمار رہتی تھیں۔ تحریم کے بعد اچانک صدمے والی حالت میں ہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ جس گہرے صدمے میں ہیں تو ان کی اعصابی اور جسمانی کمزوری شاید ان کا زیادہ عرصے تک ساتھ نہ دے۔"

"اوہ....." مومن نے لب بھینچے۔ کہ یہ ایک نئی بات تھی۔

"تو پھر..... کب؟"

"تم سے یہی مشورہ کرنا تھا۔ معافی چاہتی ہوں کہ تمہارے دل اور جذبات کی پرواہ کیے بغیر مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن حالات کبھی کبھار بہت نازک مقام پر لے آتے ہیں۔ فیصلے جیسے اپنے آپ ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

رضوانہ نے سوچ کر لفظوں کا چناؤ کیا۔ وہ مومن سے اس معاملے کی صرف ایک ہی مجبوری کا ذکر کر سکتی تھیں۔ دوسری مجبوری کی بھنک بھی وہ مومن کو پڑنے نہیں دے سکتی تھیں۔

اماں جی کی طبیعت کے بارے میں تو چلو شہناز سے پتا چلا لیکن گھر میں موجود ایک مریض کی حالت پر تو وہ برسوں سے اندر ہی اندر گھل رہی تھیں اور اب تک کے وقت میں بے بس اور مجبور بھی بہت تھیں۔

بیوگی کے بعد انہیں صرف اور صرف توفیق بھائی کا سہارا رہا تھا۔ چاہے مالی تنگی ہو یا کسی بھی قسم کا تعاون، توفیق بھائی نے ہی ہر موقع پر ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب تین برسوں سے فالج کی تکلیف نے انہیں خود ہی لاچار و بے بس کر دیا تھا۔

مومن نے انہیں پاکستان کے ہر بڑے ہسپتال میں دکھا دیا تھا لیکن ان کا علاج تب ہی ممکن تھا، جب انہیں ایک لمبے عرصے کے لیے ہسپتال ایڈمٹ کر دیا جاتا لیکن اس کے اخراجات، اتنے زیادہ تھے کہ مومن چاہ کر بھی اب تک اپنے ارادوں پہ عمل نہیں کر سکا تھا۔ ارحم کی آمد اور سسرال سے دوبارہ جڑ جانے سے رضوانہ کو ایک آس سی پیدا ہو چلی تھی۔

جمال کی وفات کے بعد تو وہ ان کی جائیداد اور اپنے بچوں کے حق سے جیسے آپ ہی دست بردار ہو چکی تھیں۔

کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مرحوم شوہر کا حق وہ سسرال جا کر مانگ سکتی ہیں۔ لیکن اب جبکہ ہر کام خود بخود ہوتا چلا جا رہا تھا تو رضوانہ چاہتی تھی۔ جلد از جلد وسیلہ کا گھر بس جائے، دونوں گھر ایک دوسرے سے گھل مل جائیں تو وہ ارحم سے کہلوا کر، بچیوں کا حق مانگ سکتی ہیں اور تب سب سے پہلے انہیں بھائی کا علاج کروانا تھا تا کہ ندرت اور بھائی جان کی بے رنگ زندگی میں پھر سے بہار آجائے۔

''معذرت کی بات ہی نہیں ہے پھوپھو! اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ ایسے فیصلے انسان کو مجبوری میں ہی کرنے پڑتے ہیں۔ بہرحال آپ مجھ سے بہتر سمجھتی ہیں۔ اگر آپ نے فیصلہ کرلیا ہے تو پھر ان لوگوں سے مشورہ کر کے کوئی بھی تاریخ طے کرلیں۔''

''وہ لوگ دو ہفتے بعد کا کہہ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے آپ دیکھ لیں، میرے لیے جو بھی کام ہو بتا دیجیے۔ وسیلہ نے اگر جیکورہ کا چکر لگانا ہو تو میں لے جاؤں گا۔''

''ہاں، ابھی دو دن بعد اتوار ہے، میں اس سے کہتی ہوں سامان کی لسٹ بنالے، پھر تم دونوں ہی چلے جانا، بچوں کی وجہ سے اور تو کوئی ساتھ نہیں جا پائے گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' مومن اٹھ کھڑا ہوا ''تم تسلی سے ہر چیز لکھو، اگر ایک سے زیادہ چکر بھی لگانا پڑا تو کوئی بات نہیں۔'' مومن نے اس بار وسیلہ کو دیکھا۔

''جی۔'' اس نے اب تک کسی بات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مومن کے کہنے پر بھی آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''اچھا ہاں، فرنیچر نہ صرف پسند کرنا ہے بلکہ آرڈر بھی دے کر آنا ہے۔ اور جب تیار ہو جائے تو سیدھے تھانہ کے لیے لوڈ کروا دیں گے۔'' رضوانہ کو خیال آیا۔

''جی، یہی ٹھیک رہے گا۔'' وہ تائید کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں عیسیٰ!'' تانیہ اب اس کے کہنے پر اسے نام لے کر ہی بلا لیا کرتی۔

''ہوں!'' عیسیٰ نے ایک سرد آہ کھینچی ''صہیب کے دوستوں سے پتہ چلا ہے کہ پریشے کی شادی تیار ہے۔''

''اوہ!'' تانیہ کو سمجھنے میں بس سیکنڈز لگے، بات بہت واضح تھی، مزید کسی تفصیل کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

''صہیب سے کیسے پیش آنا چاہیے، سمجھ نہیں پا رہا۔''

''صہیب کو پتا ہے کہ......؟''

''نہیں...... اس کے دوست رضوان کا تو یہی کہنا ہے کہ اس کی بہن پریشے کی دوست ہے اس لیے یہ ایک اندر کی بات اسی کے سامنے آئی ہے اور اس نے صہیب سے اس کا ذکر نہیں کیا۔''

''تو...... پھر...... کیا خیال ہے آپ کا۔'' تانیہ نے اس کے خیالات جاننا چاہے۔

کنفیوز ہوں ڈاکٹر صاحبہ، آپ کی رائے چاہیے۔ وہ پہلی بار مسکرایا۔

''پہلے بتانے کی خاص ضرورت تو نہیں ہے۔ الٹا اسے ذہنی طور پر اپ سیٹ کرنے والی بات ہے۔''

''آر یو شیور؟'' عیسیٰ کا پوچھنا یوں تھا جیسے اس کی سوچ کچھ الگ تھی۔

''جی بالکل......'' وہ سیدھی ہو بیٹھی ''اور وہ اس لیے عیسیٰ، کہ اگر پہلے بتا دیا تو ظاہر ہے ڈیٹس بھی بتانا پڑیں گی۔ تب صہیب پر وہ تمام لمحے نہایت گراں گزریں گے جن میں مایوں، مہندی، رخصتی وغیرہ...... آپ...... سمجھ رہے ہیں۔''

''اوہ......'' عیسیٰ نے سر ہلایا ''مطلب تمہارا خیال ہے کہ وہ وقت بے خبری میں گزر جائے تو اچھا

ہوگا۔"

"جی بالکل...... بعد میں جب صہیب کو اس کی شادی کا پتا چلے گا تو یہ سب نازک مراحل گزر چکے ہوں گے۔"

"ہوں...... بات تو صحیح ہے۔"

"اور...... شادی ہے کب؟"

"یہی ہفتے بھر میں۔"

"تو اگر صہیب کو کہیں اور سے پتا چل گیا تب؟" تانیہ کو خیال آیا کہ اُن کے نہ چاہنے کے باوجود بھی صہیب کے علم میں یہ بات آسکتی ہے۔ تب کیا ہوگا۔

"میرا تو ویسے خود بھی یہی خیال تھا کہ اسے پہلے سے بتا دیا جائے لیکن خیر، میں تمہاری رائے کو مقدم جانتا ہوں، ہاں اگر اسے خود ہی کہیں سے پتا چل گیا تو اس کو اللہ کی طرف سے بہتری سمجھوں گا۔"

"جی، آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"پتا نہیں کیسے ٹھیک ہو گا۔ امی کہتی ہیں تمہارے کام تو سیدھے ہوتے جارہے ہیں، صہیب کا معاملہ جوں کا توں ہے۔" عیسیٰ کچھ خفا سا روانی میں ماں کا شکوہ بھی بتا گیا۔ تانیہ کو ہنسی تو آئی لیکن ضبط کرگئی۔ اب ہونے والی ساس کے بارے میں کہا بھی کیا جاسکتا ہے۔

"چلو خیر سے یہ معاملہ بخوبی نمٹ جائے، پھر امی کو بھیجتا ہوں۔ میری پشاور والی خالہ بھی اگلے ہفتے آرہی ہیں۔ امی ان ہی کا انتظار کررہی ہیں۔ کہہ رہی تھیں شادی کی ڈیٹ ہی فکس کروا آئیں گی۔"

"آپ ایسی خبریں بھی آف موڈ کے ساتھ دیتے ہیں۔" اس نے لطیف سا شکوہ کیا تو عیسیٰ بھی ہنس دیا۔

"بس یار...... مجھے تو لگتا ہے مستقل ڈپریشن کا مریض بننے والا ہوں۔ کوئی بات بھی خوش نہیں کرپاتی۔"

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ذہن کو ریلیکس رکھا کریں۔"

"ہوں۔ کوشش کی جاسکتی ہے۔" اس کا لہجہ تائید کرتے بھی سست سا تھا۔ تانیہ سے بھی مزید کچھ بولا نہیں گیا۔ کچھ دنوں سے اسے بھی ایسا لگنے لگا تھا جیسے اب کوئی بات خوش نہیں کرپاتی۔ اور معلوم نہیں ایسا کیوں تھا جبکہ زندگی سے بظاہر شکوہ بھی کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

"چلو شکر ہے۔ اب تو خوش ہونا؟" شہناز نے موبائل ایک سائیڈ پر رکھتے معنی خیزی سے ارحم کو دیکھا۔

"بس اب آگے کے معاملات آپ جانیں۔ مجھے تو اتنا بتادیں گی کہ کب جانا ہے سہرا باندھ کر اور آپ کی امانت کو آپ کے حوالے کرنا ہے۔"

"اتنا آسان بھی مت سمجھو بالکل۔ رضوانہ تمہاری ہونے والی ساس ہے، کئی ایک معاملات میں تمہارا مشورہ چاہنے کے لیے ڈائریکٹ تمہیں کال کرسکتی ہیں۔ شادی تک تو خود کو یہیں حاضر رکھو۔"

"ارے تو آپ کس لیے ہیں۔" وہ سخت اکتایا۔

"اس دن تمہیں پتا ہے کیا ہوا۔" شہناز نے ہاتھ لہرایا تو ارحم چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"وسیلہ سے میری کپڑوں کے معاملے پر بات ہورہی تھی تو اچانک مجھ سے پوچھنے لگی کہ ارحم جب اس کے ساتھ یونی میں پڑھتا تھا تو ان کے بیچ میں اور کون کون سے اسٹوڈنٹس تھے۔ کہتی ہے۔ میں ارحم کو یاد کرنے کی کوشش کررہی ہوں کہ وہ یونی میں کہاں ہوتا تھا۔"

"تو آپ نے کیا کہا؟" ارحم کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی

"بس یہی کہ ارحم سے پوچھوں گی۔"

"تو یہ کہیں شادی سے پہلے نہ پوچھنے بیٹھ جائے۔ کیا کہوں گا، وسیلہ تو چھوڑ میں نے آج تک یونی ورسٹی بھی دیکھی ہوئی نہیں۔"

"ٹال دینا تم بھی کسی بہانے۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔"

"ہوں، میں ذرا باہر تک جا رہا ہوں۔" اس نے کلائی پر گھڑی باندھی۔

"سنو۔" شہناز نے جاتے ارحم کو آواز دے کر روکا۔

"تمہاری دادی تم سے موبائل مانگے تو خبردار بالکل مت دینا۔"

"مطلب......؟" وہ بالکل نہیں سمجھا تب ہی پورا واپس پلٹا۔

"ارے۔ مجھ سے اس دن موبائل مانگ رہی تھیں کہ رضوانہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اور میں یہ رسک کسی قیمت پر نہیں لے سکتی۔ پتا نہیں رضوانہ ان سے کیا کچھ پوچھنے لگ جائے۔ میاں تو میں اس لیے انہیں ساتھ لے گئی کہ ان دونوں کی ملاقات میری موجودگی میں نمٹ گئی تھی۔ ان کو میں نے پل بھر کے لیے بھی اکیلا نہیں ہونے دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی رضوانہ اکیلے میں ان سے مشورہ کرنے لگ جائے۔"

"کرے بھی تو کیا۔ چھ ماہ سے جو اچھا بننے کا ماحول آپ نے بنا رکھا ہے۔ دادی تو پوری طرح اس جال میں پھنسی ہوئی لگتی ہیں۔"

ارحم استہزائیہ ہنسا اور کھڑکی سے آگے آتے ہاجرہ بی بی کے قدم وہیں رک گئے۔

وہ ارحم سے دوا میں سمجھنے آئی تھیں۔ اپنا ذکر سن کر قدم رکنا کچھ فطری سا عمل ہوتا ہے۔ لیکن اگلے ہی پل یہ احساس کہ وہ چوری چھپے کسی کی باتیں سن رہی ہیں انتہائی معیوب لگا تب ہی پلٹنے لگیں۔

"ہاں اور اگر ان دونوں کو اکیلے بات کرنے کا موقع مل گیا تو تمہاری دادی یہ بھانڈا بھی پھوڑ سکتی ہے کہ ان دونوں کی اچھائیاں تو بس چند ماہ پہلے ہی شروع ہوئی ہیں، تب کیا رضوانہ سوچ میں نہیں پڑ جائے گی۔ اس لیے میں پھر کہہ رہی ہوں ارحم! موبائل تو بھولے سے بھی اس بڑھیا کے قریب نہ پھٹکنے دینا۔"

"اوکے، سمجھ گیا۔ اب جانے بھی دیں۔" وہ اکتانے لگا اور ہاجرہ نے فوراً پیچھے ہٹتے واپسی کی راہ لی۔ ارحم کسی بھی لمحے باہر نکل کر انہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دواؤں کا کام کسی اور وقت پر چھوڑتے واپس اپنے کمرے میں آگئیں۔

بستر پر بیٹھتے دماغ ان دونوں کی باتوں کو سوچنے لگا۔ اب تک کے وقت میں انہوں نے تو ایک بار بھی کوئی برا گمان نہیں کیا تھا۔ رضوانہ سے بات کرنے کے لیے شہناز سے اس کا موبائل بہت بار مانگا تھا لیکن وہ صرف یہ سوچ کر کہ تحریم کے بعد رضوانہ دکھی رہتی ہوگی تو اس کو ذرا تسلی دے دیں۔ لیکن شہناز نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانا کر دیا تھا۔ ہاجرہ نے بھی اس کی بات کو سچ ہی سمجھا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آرہا تھا۔ کہ بات اتنی عام نہیں تھی۔ وہ انہیں رضوانہ سے اکیلے میں ملنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ انہیں یاد آیا کہ تحریم کی وفات کے وقت، جبکہ وہ سب دسیلہ اور ارحم کی منگنی کی وجہ سے وہیں پر ہی تھے تو چوتھے دن تھانہ واپس آنے کے موقع پر، جب ہاجرہ نے وہیں رضوانہ کے پاس رکنے کی خواہش ظاہر کی تو شہناز نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔

ہاجرہ کا ان حالات میں واپس آنے کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ اب کچھ وقت رضوانہ اور بچیوں کے ساتھ ہی گزارنا چاہیے لیکن شہناز، کئی طرح کے حیلے بہانے کر کے انہیں اپنے ساتھ ہی واپس لے آئی تھی۔ تو آخر کیا تھی اس کی وجہ۔ یہ ٹھیک تھا کہ انہوں نے خود کئی بار سوچا تھا کہ کچھ عرصے سے، آخر یہ ماں بیٹا کیوں اتنے اچھے ہو گئے ہیں جبکہ پہلے اس حویلی میں کوئی انہیں پوچھتا بھی نہ تھا۔

پہلے پہل جب ارحم کی وجہ سے رضوانہ اور شہناز کی آپس کی رنجش کا خاتمہ ہوا، انہوں نے حیران ہو کر یہ ضرور سوچا تھا کہ آخر رضوانہ سے دوستی بحال کر کے شہناز اتنی خوش کیوں ہے۔ ان کے نزدیک شہناز

اس برسوں کی دوری سے ،اس لیے بھی ضرور خوش ہوگی کہ شوہر کے ساتھ ساتھ مفت میں دیور کی جائیداد پر بھی قابض ہے۔لیکن جب انہوں نے ارحم کو خوشی خوشی دونوں گھروں کے تعلقات بحال کرتے دیکھا تو اپنی ہی سوچ پر شرمندہ ہوگئیں۔

پر اب...... ہاجرہ کا سر سوچ سوچ کر درد کرنے لگا کہ شہناز اور ارحم کی کچھ دیر پہلے کی باتوں نے صاف ظاہر کردیا تھا کہ ان دونوں کا اس سب کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ہاجرہ بی بی کو ان دونوں کے عزائم تو سمجھ میں نہیں آئے پر اتنا ضرور سمجھ میں آگیا کہ انہیں جلد از جلد، کسی طرح رضوانہ سے بات کرنی ہے اور اس رشتے کے متعلق ہوشیار کرنا ہے۔

☆☆☆

"کیا ہوا بے بی۔" ایلیا کی آنکھ عابس کی ریں ریں سے کھلی تو فوراً اٹھ بیٹھی۔کمرے میں مامی نہیں تھیں۔اس نے اٹھ کر کاٹ میں سے عابی کو نکالا ۔گھڑی دیکھی، ڈھائی بجے تھے۔وہ اسے چپ کرانے کے لیے یہاں سے وہاں ٹہلانے لگی لیکن وہ پھر بھی چپ نہیں ہوا تھا اپنے میٹرس پہ لٹا کر اس کا پمپر تبدیل کیا، عابی کی ریں ریں تب بھی بند نہیں ہوئی ۔ایلیا نے جلدی سے اس کا فیڈر تیار کیا۔اسے ریبا کے جاگ جانے کی ٹینشن تھی۔لیکن عابی تو دودھ کو منہ بھی لگانے کو تیار نہ تھا۔اس کا رونا بڑھنے لگا۔ایلیا کو اب ریبا سے زیادہ عابی کی فکر ہونے لگی۔نجانے معصوم بچے کو کیا تکلیف تھی۔اس نے مامی کو کال کرنے کا ارادہ کیا تب ہی مومن چھوٹے کمرے کے دروازے میں آیا۔

"کیا ہوا؟"

"یہ عابی پتا نہیں کیوں، روئے جارہا ہے۔"

"فیڈر بنا دو۔"

"جی، دیا ہے لیکن وہ پی نہیں رہا۔پمپر بھی چینج کردیا ہے۔اٹھا کر کھڑی ہوں لیکن چپ نہیں ہورہا، پہلے اٹھا کر ٹہلنے سے خوش ہوجاتا تھا۔" ایلیا نے خود ہی ساری تفصیل بتادی۔

"ہوں۔" مومن نے آگے بڑھ کر اس سے عابی لے لیا۔

"کیا ہوا بچے!" مومن نے اس کے گلے میں پڑی چوسنی منہ میں دینے کی کوشش کی لیکن اس نے غصے سے باہر نکال دی اور زیادہ زور سے رونے لگا۔

"مجھے...... لگتا ہے...... اس کے پیٹ میں درد ہے۔" ایلیا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد نتیجہ نکالا، اور تائیدی نظروں سے مومن کی طرف دیکھا تو وہ بھی وہیں رُکا۔

"ہاں۔یہی بات ہوگی۔پھر۔؟" مومن نے آخر میں سوال بھی اسی سے کردیا کہ اسے خود تو پتا ہی نہیں تھا کہ ایسی سچویشن سے کیسے نمٹنا ہے۔

"آں...... گرائپ واٹر۔"

"ہاں ہاں گڈ!" مومن ایکسائیٹڈ ہوا" تو۔ہے گھر میں؟؟"

"جی، رکھا تو تھا۔" ایلیا سائیڈ ٹیبل کی طرف بھاگی۔

"کئی طرح کی بوتلیں ، خشک دودھ کے ڈبے،گرم پانی ہوٹ واٹس اور پتا نہیں کیا الم غلم بکھرا پڑا تھا۔اس نے گرائپ واٹر اور ایک ڈراپس کی بوتل اٹھائی۔یہ دونوں پیٹ درد کے لیے ہیں۔

"ارے یار۔تم تو چپ کرو۔ہاں۔کیا کہہ رہی ہو۔" مومن سخت بوکھلا سا گیا تھا۔عابی کا رونا کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"بھیا،اس کو دوسرے کمرے میں لے چلتے ہیں۔یہاں ریبا جاگ جائے گی۔" ایلیا نے دھکا دینے کے انداز میں مومن کے بازو کو باہر کی طرف کیا تو مومن کو بھی جیسے اب خیال آیا۔

"ہاں ہاں...... وہیں چلتے ہیں۔" وہ فوراً باہر نکلا اور ایلیا نے عابی کے کاٹ میں سے اس کا کمبل وغیرہ سمیٹ کر ہاتھ میں لیے۔مومن اسے لیے اپنے بیڈ کے قریب کھڑا تھا،ایلیا نے جلدی سے عابی کا بستر بچھایا اور مومن سے لے کر بچے کو اس پر لٹادیا۔

"بھیا، یہ تو چپ نہیں کررہا، آپ چھوٹے

کمرے کا دروازہ بند کر دیں۔" ایلیا نے بیڈ پر بیٹھ کر عابی کو پھر گود میں لیا۔ مومن نے بھاگ کر دروازہ بند کیا اور واپس آیا تو ایلیا نے پھر دونوں بوتلیں ہاتھ میں لے رکھی تھیں۔ سوالیہ نظریں پھر مومن پر جمی تھیں۔

"یار میں کیسے بتاؤں۔" وہ بھی وہیں پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور دونوں بوتلیں ہاتھ میں لے لیں۔

"بس جلدی سے یہی گرائپ واٹر دو، اس کا تو مجھے پتا ہے لیکن ڈراپس کا مجھے کوئی آئیڈیا نہیں۔"

جی، ایلیا نے چمچ بھی اٹھا لیا تھا۔ بوتل سے گرائپ واٹر چمچ میں نکال کر عابی کو دیکھا جو اس کی گود میں بری طرح مچل رہا تھا۔

"یہ تو اچھل اچھل کر سب گرا دے گا۔ آپ اس کو پکڑ لیں۔"

"ہاں۔ ایک منٹ۔ رکو۔" مومن جو پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھا تھا۔ سیدھا ہوتے ایلیا کے عین سامنے گود بنا کر بیٹھ گیا اور تھوڑا اور آگے ہوتے عابی کی ٹانگوں اور کندھوں پر دباؤ دیتے اسے ہلنے سے باز رکھنے لگا۔ ایلیا نے دوسرا ہاتھ اس کے ماتھے پہ رکھ کر اس کے سر کو ہلنے سے روکا۔

"بس بس۔ اب ٹھیک ہے۔ ایلیا نے اس کے کھلے منہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے گرائپ واٹر انڈیلا جسے ذائقہ اچھا ہونے کی بنا پر عابی نے بخوشی قبول کر لیا۔

اِدھر توقیق کے سو جانے کے بعد ندرت ان کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے یہاں آئیں تو مومن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئیں۔ سامنے مومن کے بیڈ پر مومن اور ایلیا ایک دوسرے کے آمنے سامنے آلتی پالتی مار کر بہت قریب قریب بیٹھے تھے۔ مومن آگے کو جھکا ہوا تھا۔ نیم تاریکی میں عابی تو نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے یہ منظر کچھ عجیب بلکہ معیوب سا دکھائی دیا۔ اگر اسی وقت عابی رو نہ پڑتا تو انہیں یہی لگتا کہ وہاں صرف مومن اور ایلیا بیٹھے ہیں۔

"کیا ہوا۔" وہ آگے آئیں۔

"ہوں۔" مومن چونکا۔ "جی یہ عابی کے پیٹ میں درد لگتا ہے۔ روئے جا رہا تھا۔"

"اوہ..... اچھا اچھا۔ لاؤ مجھے دو۔" انہوں نے وہیں بیٹھ کر عابی کو گود میں لیا اور پیٹ سے شرٹ ہٹا کر ہلکے ہلکے تھپتھپایا۔

"ہاں..... یہی وجہ ہے۔"

"کیسے پتا چلا؟" مومن انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پیٹ پہ ہاتھ مارو تو آواز سے سمجھ آتی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تھپکنے لگیں۔ عابی کا رونا بھی پہلے کی نسبت کچھ کم ہو چکا تھا۔ مومن نے منہ سے پھونک نکالی۔

"اُف..... میں تو بہت ڈر گیا تھا۔"

"کوئی ایسی بات نہیں، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆☆☆

"کیا بات ہے، آپا پریشان لگتی ہیں۔" ندرت کے ان کے پورشن میں آئیں تو رضوانہ ہاتھوں پہ ماتھا گرائے شکل سے ہی نہایت اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھیں۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک گود سے نکال کر پرے رکھی۔

"قریبی رشتہ داروں کی لسٹ تیار کر رہی تھی۔ لیکن، کسے رکھوں کسے چھوڑوں۔ سبھی سب نزدیکی لگتے ہیں تو کبھی ایک دم سب پرائے۔"

"دکھائیں تو....." ندرت نے کاپی اٹھا کر خود ہی کھول لی۔

"آپ بھی نا آپا! ندرت نے لسٹ دیکھ کر ماتھے پہ ہاتھ مارا "سب کو کاٹ دیں۔"

"ہیں..... کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ جب شادی سادگی سے کی جاتی ہے تو صرف اپنے سگے بہن بھائیوں اور پڑوسیوں کو انوائیٹ کیا جاتا ہے۔ اس سے ہر ایک کا

گلہ خود ہی نکل جاتا ہے۔ کل کو یہ ماموں زاد، پھوپھا زاد جب شکوہ کریں گے نہ بلانے کا تو آپ کہیں گی کہ صرف اپنے بہن بھائی تھے۔"

"اچھا......" رضوانہ کے لیے یہ نئی بات تھی۔ بات فوراً ہی دل کو لگی۔

"جی۔ اور جتنے زیادہ "اپنے" اکٹھے کریں گی۔ اتنا ہی فنکشن کا ماحول بنتا جائے گا اور سادگی کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دے گی۔ جو کہ ہمارا اصل مقصد ہے۔"

"شکر ہے تم آگئیں۔ کتنی اچھی صلاح دی۔ مشورہ کر لینا بھی کتنا صحیح رہتا ہے نا۔" رضوانہ کے سر سے تو جیسے بوجھ اتر گیا۔

"مش۔ وہ۔ تو۔ مجھے بھی کرنا تھا آپ سے۔" ندرت بولیں تو لہجہ اٹکتا اور رکتا ہوا سا تھا۔ رضوانہ نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں ہاں کہو۔"

"وہ...... آپا۔ میں سوچ رہی تھی ہمیں مومن کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا نا۔"

"مومن کے بارے۔ مطلب۔ اس کی شادی؟" رضوانہ متعجب تھیں۔ ندرت سے ایسی بات کی کم از کم اتنے جلدی انہیں بالکل توقع نہیں تھی۔

"جی۔"

"ارے۔ تو سوچ لیں گے۔ ابھی تو تحریم کی برسی بھی نہیں ہوئی۔" انہوں نے نہایت عجلت میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

"نہیں...... اصل میں، میں بچوں کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" ندرت کچھ گھبرا سی گئیں۔ رضوانہ بڑی تند تھیں۔ ہمیشہ سے ندرت ان سے بات کرتے ہوئے بہت مؤدب رہی تھیں۔

"ہاں تو کیا نئی دلہن آ کر بچوں کو پالے گی۔ بچوں کو تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور تب بھی ہم نے ہی سنبھالنا ہے۔"

یہی تو میں بھی کہنا چاہ رہی ہوں۔ آپ ذرا میری بات کو آرام سے سمجھ لیں۔

میرا مطلب ہے، بچے ایلیا سے بہت گھل مل گئے ہیں۔ بہت خوش رہتے ہیں اس کے پاس۔ لیکن۔

"لیکن۔"

"لیکن وہ خود بے چاری بہت گھبرائی ہوئی سی رہتی ہے۔ بچوں کا کمرا جو مومن کے روم میں ہے، وہ اس کے آرام کی وجہ سے بھی اس کی موجودگی کے خیال سے بہت جھجک محسوس کرتی ہے۔"

"یہ تو ویسے میں بھی سوچ رہی تھی۔ بچوں کے کمرے کے لیے تم لوگوں کو اتنی عجیب جگہ ملی ہے۔ مومن بہت تنگ رہتا ہوگا۔ میں تو کہتی ہوں ندرت۔ بچوں کا سب سامان یہاں سیٹ کر دو۔ وسیلہ کی تو ویسے شادی ہو رہی ہے۔ وہ کمرا اب اکیلے ایلیا کا ہو جائے گا۔ یہیں لے آؤ بچوں کو۔" رضوانہ نے پھر اس کی بات کو سمجھے بغیر عجلت دکھائی۔ ندرت نے لب بھینچ کر ہمت مجتمع کی۔

"یہ بھی کر تو سکتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی مستقل حل تو نہیں ہے۔ پھر مومن کہاں بچوں سے دور ہونا چاہتا ہے۔ پہلے بیوی چلی گئی۔ اب ہم بچوں کو بھی پرے کر دیں۔ وہ تو اور اکیلا پڑ جائے گا۔"

"مطلب تم نے اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ جب میں تحریم کی ماں ہو کر اپنی دوسری بیٹی کی شادی اتنے جلدی کر سکتی ہوں تو تمہیں بھی حق ہے۔" رضوانہ پھر خفا خفا دکھائی دینے لگیں اور ندرت نے خیالوں میں خود کو کوسا۔ یا تھیں وہ سیدھی بات گھما گھما کر کیوں کیے جا رہی تھی۔ آپا کو بھی بلاوجہ خفا کر دیا تھا۔

"آپا! میں ایلیا کی بات کر رہی ہوں۔" ندرت نے آواز میں زور پیدا کیا۔

"یعنی......؟"

"مجھے مومن کی شادی کی بالکل کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہ ہی مومن کا ایسا کوئی ارادہ ہوگا لیکن میں بچوں اور کچھ حالات کی وجہ سے یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا ہم ایلیا اور مومن کی شش۔ ادی۔" یہاں آ کر ندرت بھی اٹک گئیں۔

"مومن اور ایلیا۔" رضوانہ کی حیرت سے آنکھیں پھیلیں، ایسا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"لیکن دونوں کی عمریں۔"

"جی آپا۔ وہ تو بات ہے۔ اب دیکھیں نا۔ اگر وسیلہ کی ایسے اچانک منگنی نہ ہوئی ہوتی تو تحریم کے بعد وسیلہ ہی تھی جس کی عمر بھی مومن سے میچ کرتی تھی، حتیٰ کہ سنجیدہ مزاجی میں بھی دونوں ایک جیسے ہیں۔ لیکن سب نصیب کی باتیں ہیں۔"

"ہاں لیکن ایلیا۔" رضوانہ ابھی تک اسی سوچ میں تھیں۔

"اصل میں، آپا، رات کو ویسے تو میں اور ایلیا دونوں ہی بچوں کے پاس ہوتی ہیں لیکن عالی کو سلا کر مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے لازمی توفیق کو دیکھنے جانا ہوتا ہے۔ بچوں سے پہلے تو میں پوری رات ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس رہتی تھی لیکن اب مجبوری ہے تو بس کچھ دیر کے لیے ہو آتی ہوں۔ توفیق بھی ڈسٹرب ہوتے ہیں۔

ادھر جب ایلیا کو اکیلا چھوڑ کر جاتی ہوں تو یہ بے چاری بھی گھبرائی رہتی ہے۔ مومن سب دیکھ سن رہا ہو تب بھی ادھر نہیں آتا تاکہ ایلیا جھجک محسوس نہ کرے۔ پھر وقت بھی رات کا ہو۔ بڑی عجیب سی صورت حال بن جاتی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ عالی کے پیٹ میں درد ہوا تو مجبوراً مومن کو اس کی مدد کرنے آنا پڑا۔ میں توفیق کے پاس تھی۔ یہ دونوں دیر تک اسے بہلاتے رہے۔ میں واپس آئی تو ان کو ساتھ دیکھ کر خود مجھے بھی عجیب لگا حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، ہمارے بچے کتنے نیک اور سیدھے ہیں لیکن آپ خود سوچیں، ایسا ماحول بھی تو پہلے کبھی نہیں بنا، اب پیش آ رہی ہے تو ظاہر ہے سوچیں بھی اسی حساب سے آنے لگی ہیں۔"

"اتنی تفصیل سے تم نے بھی پہلے کبھی نہیں بتایا۔" بات رضوانہ کی سمجھ میں آئی تو لہجہ بھی خود بخود دھیما بلکہ مصالحتی سا ہو گیا۔ اب وہ دونوں چپ بیٹھی غور کیے جا رہی تھیں۔

"توفیق سے بات کی تم نے؟" بڑی دیر بعد رضوانہ نے سر اٹھایا۔

"نہیں..... سب سے پہلے آپ سے مشورہ کیا ہے۔"

"اور مومن؟"

"نہیں مجھے پہلے آپ کی رائے چاہیے تھی آپ کیا کہتی ہیں۔"

"میں کیا کہوں۔" رضوانہ نے گہرا سانس لیا" تمہارے والی بات ہے کہ جب پیش آئی ہے تو سوچنا بھی پڑ جاتا ہے۔ باقی بہت سوچنے پر مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ مومن اور ایلیا کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"میں مومن سے بات کروں؟"

"ہاں پہلے اسی سے بات کرو۔ میں بھی ایلیا سے پوچھتی ہوں۔"

"آپ کی ہاں ہے نا؟" ندرت نے سوال کیا تو انداز میں منوا لینے کی خواہش چھپی تھی۔

"اب سوچنا شروع کروں گی ندرت! میں نہیں جانتی تم نے کتنی آسانی سے یا کتنی مشکل سے ذہن بنایا لیکن مجھے اب بہت وقت لگتا ہے۔ تحریم کے بعد میرا ذہن نارمل انداز میں سوچنا چھوڑ چکا ہے۔"

☆☆☆

"واہ..... کیسے کیسے نادر خیال آتے ہیں آپ عورتوں کے دماغ میں۔ اب یہی اچھوتا خیال باقی رہ گیا تھا۔"

"کوئی عجوبہ بات نہیں کردی، کرنے پڑ جاتے ہیں کبھی کبھار ایسے فیصلے۔" ندرت اس کے بپھر جانے سے ناخوش تھیں۔

"اللہ کا خوف کریں امی۔ چھوٹی سی بچی ہے ایلیا۔ ابھی ابھی اٹھارہ سال کی ہوئی ہے۔ میری اس کی عمر کا فرق دیکھیں ذرا۔"

"بس بھی کرو۔ تم کون سے بوڑھے ہو۔ بتیس تینتیس بھی کوئی عمر ہوتی ہے مرد کے لیے۔ خود کو دیکھو، ماشاء اللہ کس بات کی کمی ہے۔ دو بچوں کے

باپ ہی دکھائی نہیں دیتے۔"

"میری تعریفیں بند کریں۔ میں آپ کو ایلیا کی عمر بتا رہا ہوں۔"

"ہاں، اور مجھے تو نہیں پتا جیسے۔" ندرت کا مزاج بگڑا "تم عمر کے چکر میں پڑے بغیر ذرا سمجھ داری سے سوچو۔ آج نہیں تو کل، آخر تمہارا گھر تو بسانا ہی ہے نا تو بچوں کے بارے میں بھی ہمیں ہی سوچنا ہوگا۔ کیا کسی بھی ایری غیری کو معصوم بچوں پر سوتیلی ماں بنا کر بٹھا دیں گے۔؟ ایلیا، نہ صرف سگی خالہ ہے بلکہ ماں بن کر بچوں کو پال رہی ہے۔ نہ کوئی غیریت نہ پرایا پن۔"

"ہاں تو پالنے دیں نا۔ بنا کوئی رشتہ جوڑے کیا نہیں پال سکتی۔ ایک ہی گھر ہے، نہ وہ کہیں بھاگی جا رہی ہے۔ جیسا چل رہا ہے، چلنے دیں۔ تے تے آئیڈیاز کی مشین کیوں بن رہی ہیں۔" مومن کا دماغ گھوما ہی ہوا تھا۔

"ارے، وہ جھجک محسوس کرتی ہے۔ بچوں کا روم تمہارے روم میں ہے۔ ابھی میں ساتھ ہوتی ہوں، کل کو تمہارے پاپا کی طبیعت یا ان کے علاج کی وجہ سے میں زیادہ ساتھ نہیں دے پائی، تو وہ بے چاری اکیلی کیسے مینج کرے گی۔ ابھی کل ہی تمہاری ممانی فاطمہ کا فون آیا، کہتی ہیں۔ بچیوں کو ساتھ لیے کچھ روز کے لیے آ رہی ہوں۔ دوسرے ایسا ماحول دیکھیں گے تو پتا نہیں کیا کیا سوچیں۔"

"اُف...... آپ کتنا سوچ سکتی ہیں۔" وہ بری طرح چڑ گیا۔

"تم بھی سوچنا شروع کردو۔ اور نہیں تو ذرا اپنی پھوپھو کے بارے میں ہی سوچ لو۔ انہیں کیا محسوس نہیں ہوتا۔ جوان بچی کو روز رات کو ہمارے ہاں بھیج دیتی ہیں۔ انہیں کیا نہیں پتا، یہاں کے کیا حالات ہیں۔ باپ تمہارا مریض ہے، مجھے اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایلیا بچوں کے ساتھ تمہارے روم میں اکیلی ہوتی ہے۔ سب حالات کی مجبوری کی وجہ سے چپ ہیں ورنہ کتنے اعتراض کے نکتے اٹھ سکتے ہیں۔"

"آپ خود کیا کم ہیں۔ نقشے کھینچنے میں۔"

مومن کو خوب اندازہ ہو رہا تھا کہ امی کے خیالات اسی ایک رات کی وجہ سے یک لخت کتنے بدل گئے تھے۔ حتیٰ کہ اب وہ دوسروں کے خیالات کا دھارا بھی اُدھر موڑنے پہ تلی تھیں۔

"اچھا مجھے چھوڑو۔ میں تم سے پوچھتی ہوں، اپنے مستقبل کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟"

"کچھ نہیں سوچتا۔" وہ رخ موڑ کر خفا سا کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ہمیں سوچنے دو۔"

"نہایت ہی سیلفیش لوگ ہیں آپ۔" وہ مڑا تو خشمگیں نظریں ماں پر جمی تھیں اور دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے ہوئے تھے۔ "دو چھوٹے بچے جنہیں ابھی کچھ عقل سمجھ نہیں، ان کے بارے میں تو بہت سوچ سکتے ہیں، لیکن ان کی آڑ میں دو ذی شعور، سمجھ دار افراد آپ کے مفادات کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، ان کا کچھ نہیں، میں شرطیہ کہہ رہا ہوں، ایلیا اس کے لیے کبھی راضی نہیں ہو گی۔ لیکن ابھی تک کسی نے اس بے چاری سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی ہو گی۔"

"اس سے ہم پوچھ لیں گے، تم اپنی کہو۔"

"نا۔" اس نے فی الفور ہاتھ کھڑا کیا "نو، نیور۔ قطعی نہیں۔" اور جواباً کچھ بھی نہ سننے کا تہیہ کرتے کمرے سے ہی نکل گیا۔

"یا خدا۔ یہ آج کل کی اولادیں۔" ندرت ہلتے پردے کو ہی دیکھے گئیں۔

☆☆☆

"سکون کی گولیاں اب مزید لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ ٹانک ابھی جاری رکھیں۔ ملٹی وٹامن ہوتے ہیں، ان سے ہم ایکٹیو اور بیدار محسوس کرتے ہیں۔ اور ہاں یہ سوچنا بالکل چھوڑ دیں کہ سکون کی گولی نہیں لی تو سکون نہیں ملے گا۔ بجائے اس کے یہ سوچنا ہے کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ گولیاں اب سکون کے بجائے برڈن کا باعث تھیں۔"

"جی، میں نے کل نہیں لی تھیں، ٹائم بہت نارمل گزرا۔"

"آگے مزید اچھا گزرے گا۔ ان شاء اللہ ۔تانیہ نے مسکرا کر نیا نسخہ آگے بڑھایا اور خالد صاحب نسخہ ہاتھ میں لے کر رخصت ہو گئے۔

تانیہ نے گھڑی دیکھی۔ سوا چھ کا وقت تھا۔ ساڑھے چھ وہ کلینک بند کر دیتی تھی۔ نواز نے بتایا تھا دو مریض اور بھی بیٹھے ہیں۔ اس نے اگلے مریض کی آمد سے پہلے موبائل اٹھا لیا۔ بہت دیر سے بری طرح مصروف تھی۔ موبائل چیک کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

عیسیٰ سے اس کی صبح سویرے بات ہوئی تھی۔ وہ بہت بے چین اور پریشان تھا کیونکہ آج پریشے کی شادی تھی اور اب تک کے وقت میں صہیب کو یہ بات پتا نہیں چلی تھی۔ تانیہ کے مشورے کی وجہ سے اس کے دوستوں وغیرہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ صہیب کو پریشے کی شادی کی بھنک نہ پڑے اور یہ دن کسی طرح بے خبری میں گزر جائے۔ صبح جب عیسیٰ سے اس کی بات ہوئی تو وہ البتہ تب بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اس طرح، سولی پر ٹنگے رہنے سے کہیں بہتر تھا کہ صہیب کو پہلے سے بتا دیا جاتا۔

تانیہ جانتی تھی کہ عیسیٰ چھپانے کے حق میں نہیں ہے لیکن تانیہ کو یہی بہتر لگا اور وہ اس کے مشورے کا احترام کر رہا تھا۔

تانیہ نے واٹس ایپ اوپن کیا تو بہت سے دوسرے میسجز میں دو پیغام عیسیٰ کی جانب سے بھی تھے اور اس نے سب سے پہلے ان ہی کو پڑھنا تھا۔ دل میں تجسس ابھرا کہ اب تو شام ہونے والی ہے، جانے دن کیسا گزرا تھا۔ صبح تو بہت پریشان تھے۔ اس نے میسج کھولا۔

"صہیب کو پتا چل گیا۔ اس کے لیے دعا کرو۔"

"او نو...... تانیہ نے میسج کا ٹائم دیکھا۔ میسج قریب ایک گھنٹہ پہلے آیا تھا۔ اس نے کال ملانا چاہی لیکن پردہ ہٹا کر اگلا مریض اندر آیا تو تانیہ نے مجبوراً کال کاٹ کر جلدی جلدی دونوں مریض نمٹائے۔ کلینک بند کرنے کا وقت تھا۔ اس نے ضروری سامان اٹھا کر چابیاں نواز کے حوالے کیں کہ اب وہی کلینک کو بند کردے۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو ابو کی کال آنے لگی۔

"کہاں ہو تانیہ۔ جلدی سے گھر آؤ۔"

"خیریت ابو۔ کیا ہوا۔ امی کی طبیعت ٹھیک ہے۔"

"ہاں، سب ٹھیک ہے، سیدھے گھر آؤ۔ اور دیکھو عیسیٰ کی کال آئے تو اٹینڈ مت کرنا۔ اور جلدی پہنچو پلیز۔"

ابو کی گھبرائی آواز میں جانے کیا تھا۔ تانیہ کا دل دہل گیا۔ ابو نے عیسیٰ کے متعلق ایسا کیوں کہا، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس ذہن جھٹک کر ڈرائیونگ پر توجہ دی۔ گھر کا راستہ بیس منٹ کا تھا۔ وہاں پہنچی تو امی اور ابو کو سامان پیک کرتے دیکھا۔

"کیا ہوا ابو۔ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہمیں نکلنا ہے تانیہ۔ تت۔ تمہاری عیسیٰ سے کچھ بات ہوئی؟" ابو کام چھوڑ کر اس کے قریب آئے۔

"نہیں ابو! لیکن ہوا کیا ہے۔ اور یہ سب"

"بیٹا...... وہ صہیب نے سوسائیڈ کرلی ہے۔"

"او نو......" وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی "کیا کیا اس نے۔ کیسا ہے؟"

"ایکسیڈنٹ کرلیا تھا اپنا۔ ہی اِز نو مور......"

"اُو گاڈ...... نو" تانیہ صوفے کے ہتھے پر بیٹھ سی گئی۔ صہیب نے خود اپنی جان لے لی۔ صرف اس لیے کہ اسے اچانک پتا چلا کہ آج پریشے کی شادی۔ ہا!!! تانیہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ہاتھ بے اختیار منہ پہ رکھا۔ پھر ابو کو دیکھا کیونکہ بات ابھی بھی ادھوری تھی۔ ابو سامان کیوں پیک کر رہے تھے۔

"عیسیٰ کے ایک دوست کی کال آئی، وہ اپنا نام نہیں بتا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ عیسیٰ اپنے بھائی کی ڈیتھ پر بری طرح آگ بگولہ ہے۔ اُس نے سب دوستوں کے بیچ ٹھہر کر یہ کہا ہے کہ تانیہ کو وہ ہرگز معاف نہیں کرے گا اور اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے گا۔ کیونکہ اُسی کے غلط مشوروں نے صہیب کی جان لی۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

شازیہ الطاف ہاشمی

ناراض

"حلیمہ آپی! تم ناراض تو نہیں ہو جاؤ گی اگر میں تمہارے لیے پندرہ سو والا چکن کا سوٹ لے لوں؟ سستا مل رہا ہے ویسے تو پچیس سو کا ملتا ہے۔" یہ حلیمہ کی کزن عافیہ کی کال تھی۔

"میری ناراضی کا اتنا خیال کیوں ہے یار! تحفوں کے لین دین میں کوئی ناراض تھوڑی ہوتا ہے خوشی ہوتی ہے کہ کسی کو میرا خیال ہے مجھ سے محبت ہے تم بے فکر ہو کر سوٹ خرید لو۔"

اس نے ہنس کر بات ختم کر دی تھی مگر سوچ میں پڑ گئی تھی یہ اس طرح پوچھتی کیوں ہے؟ خیر چار چھ سال ہوئے ہیں شادی کو۔ اس لیے ایسی ہے آہستہ آہستہ سیکھ ہی جائے گی لین دین تحفے تحائف سب کچھ۔ ویسے بھی ڈرپوک ہے شروع سے۔

اس کے ساتھ ہی اسے یاد آئے تھے اپنے چھوٹے چھوٹے دلیر کارنامے، کچن سے اچار چرانا، پیپر چھپائی فنڈ وغیرہ۔

اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب عافیہ کو کیا گفٹ دے گی۔ زرقون کی رنگ جو ہیروں کی طرح دمکتی ہے اور ہاتھ تو ایسے کر دیتی ہے جیسے لیڈی ڈیانا کا ہاتھ ہو۔ "اف کتنی حسین انگوٹھی تھی۔"

عافیہ کی پسند اچھی تھی۔ بختیار، (اپنے بیٹے) کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ سوٹ پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔

"اتنا پیارا سوٹ ہے۔ ہے تو عافی پگلی سی پر پسند خوب ہے اس کی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اس کا ڈیزائن بھی سوچ لیا تھا۔ جب ہی عافیہ کی کال آ گئی۔

"سوٹ پسند آیا۔ آ گیا ناں۔" اسے یقین نہیں آتا تھا۔

"آ گیا ہے پسند بہت خوب صورت ہے۔"

حلیمہ اب عافیہ کے گھر عافیہ سے ملنے آئی تھی۔ میل ملاقات ناشتا پانی سے فارغ ہو کر حلیمہ لیٹ گئی تھی دونوں کزنز بچپن سے ساتھ کھیلی ہوئی تھیں۔ بچے بھی خوب گھل مل جاتے تھے اگر عافیہ اس کے آنے پر بریانی بازار سے آرڈر کرتی تو حلیمہ بھی آگے بڑھ کر

ہی اہتمام کیا کرتی۔اس پر عافیہ خوش ہو جاتی عافیہ نے حلیمہ کا ہینڈ بیگ سائیڈ پر رکھ دیا تھا وہ چائے پی کر فارغ ہوئی تو حلیمہ جاگ گئی۔

''تمہارے لیے ایک گفٹ ہے۔'' عافیہ نے نظر دوڑائی اس کے پاس تو کوئی شاپر نہیں تھا۔ لے دے کر ایک پرس اس میں گفٹ کہاں ہوگا۔

''مذاق نہ کرو حلیمہ! آج تم نے شاپنگ نہیں کی۔'' وہ اسے دیکھ کر بولی تھی۔

''ارے ایسا نہیں ہے مذاق کیوں کروں گی اپنی عافی سے تو آنکھیں بند کرو۔''

اس نے آنکھیں بند کیں تو حلیمہ نے رنگ اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ تحفہ سامنے تھا عافیہ کو جیولری وغیرہ کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ اتنی پیاری رنگ پہن کر وہ خوش ضرور تھی مگر ذرا سی الجھی ہوئی بھی لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا عافی پسند نہیں آئی؟''

''ہاں اچھی ہے حلیمہ! لیکن یہ کتنے کی لی ہے؟''

''عافیہ محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور تحفہ دینے والے سے تحفے کی قیمت کیا پوچھنی مگر تم نے پوچھا ہے تو دو ہزار کی لی ہے۔ مشہور برانڈ کی ہے ففٹی پرسنٹ یہ بھی آف سیزن میں دو ہزار کی آئی ہے ورنہ وہاں کوئی بھی چیز سستی نہیں ملتی۔''

اس پر عافیہ خوش ہو گئی تھی۔

''یہ دیکھو برانڈ نیم اس کی پیکنگ چیک کرو۔''

وہ جلدی جلدی کھول کر دیکھ رہی تھی۔

''ہمسائی کو بتاؤں گی اس لیے پوچھا ہے۔''

حلیمہ ہنس کر بولی۔

''ارے ہاں یہی بات ہے ذرا شو شا تو چلے گا ناں۔''

یہ سن کر حلیمہ ہنس پڑی تھی۔ ''میں سمجھی پتا نہیں کیا بات ہے۔''

''پچھلی دفعہ تم نے فش فرائی کھلائی تھی اب فش فرائی اور کشمیری چائے میری طرف سے۔''

''اوہ سو سویٹ۔''

جاتے جاتے عافیہ نے چھوٹے ارحم کو ہزار روپے کا نوٹ دے دیا تھا۔

''لو بچہ ہے۔ اس کا حق ہے اپنی آنٹی پر۔''

حلیمہ نے بہت ٹوکا مگر عافی نے ایک نہیں سنی نوٹ ارحم کو تھما کر ہی دم لیا۔

حلیمہ نے راستے میں ارحم کو چپس کا پیکٹ دلوا کر باقی پیسے بیگ میں رکھ لیے تھے۔ صبح ہی صبح عافیہ کی کال آ گئی تھی۔

''حلیمہ آپی! ارحم سے پیسے لے لیے ناں؟''

''ہاں لے لیے تھے۔''

''راستے میں کہیں گرا کر تو نہیں چلا گیا۔''

''نہیں بالکل نہیں۔''

اس نے کتنی بار تسلی کروائی تھی مگر عافیہ نے کتنے فون کر ڈالے تھے۔ بار بار پوچھا تھا۔ اتنا پوچھا کہ وہ ناراض تو نہیں کہ اسے شک ہو گیا تھا۔

کافی دنوں سے وہ عافیہ سے ملنے جانے لگی تھی۔

''عافیہ! وہ ارحم کے پاپا نے جو تمہاری بیٹی کو پچھلی بار ہزار روپے دیے تھے تمہیں یاد ہے ناں جب ہم واپس آ رہے تھے تو ارحم کے پاپا نے کہا تھا کہ بچوں کو پیزا کھلا دینا۔''

''ہاں ہاں آپی! یاد آ گیا مجھے دیے تھے، دیے تھے۔''

''ہاں بالکل وہی تم ان پیسوں کی وجہ سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟''

''نہیں آپی! میں ناراض نہیں ہوں۔''

''نہیں، میں بھی برا نہ لگ گیا ہو۔ اچھا تم ناراض نہیں ہوئیں تو عافی میری جان! میں کیوں ناراض ہونے لگی۔''

حلیمہ کا شک بالکل درست نکلا تھا۔ عافی ہزار کے بدلے دو ہزار کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے حساب کتاب کا تکلف بھی نہیں کیا تھا اس کے بعد عافی نے دوبارہ کال کر کے یہ نہیں پوچھا تھا۔ ''آپی ہزار روپے گرا کر تو نہیں گیا ارحم۔''

☆☆

کیا کرے میری مسیحائی بھی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا

زندگی سے کسی مجھوتے کے باوصف اب تک
یاد آتا ہے کوئی مارنے امرنے والا

عمر بھی تیرے کوچے میں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا

اس کا انداز سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ مکرنے والا

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا

اس امید پہ ہر شام بجھاتے ہیں چراغ
ایک تارا ہے سر بام ابھرنے والا

پروین شاکر

کوئی آرزو نہیں ہے، کوئی مدعا نہیں ہے
ترا غم رہے سلامت مرے دل میں کیا نہیں ہے

کہاں جام غم کی تلخی، کہاں زندگی کا درماں
مجھے وہ دوا ملی ہے جو مری دوا نہیں ہے

تو بچائے لاکھ دامن، مرا پھر بھی ہے یہ دعوا
ترے دل میں میں ہی میں ہوں کوئی دوسرا نہیں ہے

تمہیں کہہ دیا ستمگر، یہ قصور تھا زباں کا
مجھے تم معاف کر دو، مرا دل برا نہیں ہے

مجھے دوست کہنے والے ذرا دوستی نبھا دے
یہ مطالبہ ہے حق کا، کوئی التجا نہیں ہے

یہ اداس اداس چہرے، یہ حسیں حسین تبسم
تری انجمن میں شاید کوئی آئینہ نہیں ہے

مری آنکھ نے تجھے بھی بہ خدا شکیل پایا
میں سمجھ رہا تھا مجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

شکیل بدایونی

فائدہ کیا ہے زمانے میں خسارہ کیا ہے
خاک ہو جائیں گے ہم لوگ، ہمارا کیا ہے

جیتنے والوں کا ہم کو نہیں کچھ علم کہ ہم
ہار کر سوچتے رہتے ہیں کہ ہارا کیا ہے

دیکھ اے عمر رواں! خواہشیں رہ جائیں گی
تم گزر جاؤ گی چپکے سے تمہارا کیا ہے

وہ اگر دیکھ لے اک بار محبت سے تو پھر
ذرہ خاک چمک اٹھے ستارہ کیا ہے

وصل اور ہجر کی تفصیل میں جا کر دیکھو
عشق تشویش کا باعث نہیں یارا کیا ہے

خواب میں ہم کو فلک پار بلاتا ہے کوئی
جانے کیا نام ہے اس کا، وہ ہمارا کیا ہے

سوچنا یہ کہ آزر ہمیں جانا ہے کہاں
دیکھنا یہ ہے کہ مقدر کا اشارہ کیا ہے

دلاور علی آزر

میری پلکوں پہ
جب کوئی حسین سایہ لرزتا ہے
میری آنکھوں پہ
جب کوئی دھیرے سے ہاتھ رکھتا ہے
میرے ہونٹوں پہ
جب کوئی مدھر نغمہ مچلتا ہے
کسی جانب سے جب کوئی خوشبو کی لہر
آتی ہے
کبھی کیاری میں
جب خوش رنگ کوئی پھول کھلتا ہے
کسی رستے سے
صبح بن کے کوئی گزرتا ہے
کوئی دیوانگی کی حد تلک جب پیار
کرتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو

خالد شریف

شگفتہ جاوید

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ صحابی قبیلہ عبدالاشھل کی شاخ بنو عبداللہ بن کعب سے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے ہمارے قبیلے پر حملہ کیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھانا کھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا۔ ''آجاؤ کھانا کھالو۔''

''میں نے کہا میرا روزہ ہے۔''

فرمایا۔ ''بیٹھ جاؤ! میں تمہیں روزے کی بات بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کردی ہے اور مسافر، حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزہ یا روزے معاف کردیے ہیں۔''

''اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں لفظ فرمائے یا ان میں سے ایک لفظ فرمایا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں شریک نہ ہوا۔''

(ابوداؤد)

شفاعت

حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں۔ حضرت درہ بنت ابی لہب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہجرت کر کے مدینہ آئیں اور حضرت رافع بن معلی زرقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں ٹھہریں۔ بنو زریق کی جو عورتیں ان کے پاس آکر بیٹھیں انہوں نے ان سے کہا تم اسی ابولہب کی بیٹی ہو لہٰذا تمہاری ہجرت تمہارے کام نہ آئے گی۔ حضرت درہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان عورتوں کی شکایت کی اور جو انہوں نے کہا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا بیٹھ جاؤ پھر لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تھوڑی دیر بیٹھے اور فرمایا کیا بات ہے کہ مجھے میرے خاندان والوں کے بارے میں تکلیف پہنچائی جارہی ہے۔ اللہ کی قسم! میری شفاعت قیامت کے دن اور حکم اور صلدا اور سلہب قبیلوں کو بھی نصیب ہوگی۔''

اقوال حضرت علی

1۔ ہر شخص کی قیمت وہ ہنر ہے جو اس کے اندر ہے۔

2۔ معافی دینے کا حق اسی کو ہے، جو سب سے زیادہ سزا دینے پر قادر ہے۔

3۔ ضد اور ہٹ دھرمی صحیح رائے کو دور کرتی ہے۔

4۔ تمہاری وہ خاموشی جس کے بعد تم سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ تمہارے اس کلام سے بہتر ہے جس کے بعد تم کو خاموش کردیا جائے۔

5۔ اپنا حق لینے میں کبھی کوتاہی نہ کرو۔ البتہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے بچو۔

6۔ ضرورت کے لیے اللہ کو پکارنے والا

دونوں حالتوں میں اللہ کو چھوڑ دیتا ہے ضرورت پوری ہونے پر اور ضرورت پوری نہ ہونے پر۔

7۔ کسی کے منہ پر تعریف کرنا اسے قتل کرنے کے مترادف ہے۔

8۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس نے تمہارے گناہوں کو اس طرح چھپایا کہ گویا بخش دیا۔

9۔ خوب صورتی کپڑوں سے نہیں، علم وادب سے ہوتی ہے۔

10۔ یہ ایام تمہاری زندگی کے صفحات ہیں۔ ان کو اچھے اعمال سے زینت بخشو۔

11۔ جو تم کو بری بات سے ڈرائے وہ تم کو خوشی کی بشارت دیتا ہے۔

کافروں سے مشابہت

حضرت عبداللہ بن قرط رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حمص کے گورنر تھے۔ ایک رات وہ حمص میں پہرہ دے رہے تھے کہ ان کے پاس سے ایک بارات دلہن لیے ہوئے گزری اور ان لوگوں نے اس دلہن کے سامنے کئی جگہ آگ جلا رکھی تھی انہوں نے کوڑے سے باراتیوں کی ایسی پٹائی کی کہ وہ سب دلہن کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

صبح کو حضرت عبداللہ منبر پر بیٹھے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا۔ ”حضرت ابوجندلہ رضی اللہ تعالیٰ نے حضرت امامہ سے شادی کی تو ولیمہ میں حضرت امامہ کے لیے چند مٹھی کھانا تیار کیا، اللہ تعالیٰ ابو جندلہ پر رحم کرے اور امامہ پر رحمت نازل کرے اور اللہ تمہاری رات والی دلہن اور باراتیوں پر لعنت کرے ان لوگوں نے کئی جگہ آگ جلا رکھی تھی اور کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار کر رکھی تھی اور اللہ کافروں کے نور کو بجھانے والا ہے۔

کامیابی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیان میں فرمایا کرتے ہیں تم میں سے وہ آدمی کامیاب رہا جو خواہش پر چلنے سے، غصے میں آنے اور لالچ میں پڑنے سے محفوظ رہا اور جسے گفتگو میں سچ بولنے کی توفیق دی گئی کیونکہ سچ اسے خیر کی طرف لے جائے گا اور جو شخص جھوٹ بولے گا وہ گناہ کے کام کرے گا اور جو گناہ کے کام کرے گا وہ ہلاک ہوگا اور گناہ کے کاموں سے بچو اور اس شخص کا کیا گناہ کرنا جو مٹی سے پیدا ہوا اور مٹی کی طرف لوٹ جائے گا۔ آج وہ زندہ ہے کل مردہ ہوگا۔ روزانہ کا کام روزانہ کرو اور مظلوم کی بددعا سے بچو۔

اللہ کے ڈر سے پسندیدہ چیز چھوڑنا

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، فرماتے تھے ہیں کہ تم میں سے جو آدمی اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر چیز وہاں سے عطا فرمائیں گے۔ جہاں سے ملنے کا اسے گمان نہ ہوگا اور جو اس بارے میں سستی کرے گا اور چیز کو اس طرح لے گا کہ کسی کو پتا نہ چل سکے تو اللہ اس پر اس سے زیادہ سخت مصیبت وہاں سے لے آئیں گے جہاں سے مصیبت کے آنے کا گمان بھی نہیں ہوگا۔

تقویٰ

حضرت عبد خیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

”تقویٰ کے ساتھ کیا گیا عمل تھوڑا شمار نہیں ہوتا اور جو عمل قبول ہوجائے وہ تھوڑا کیسے ہوسکتا ہے۔“

☆☆

ادارہ

مشورہ

ایک آدمی نے اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے راستے میں دیکھا کہ ایک کم عمر لڑکا ایک ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا بڑی سی چڑھائی عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ از راہ ہمدردی آدمی نے لڑکے کے ساتھ مل کر دھکا لگانا شروع کر دیا۔

دونوں کو ڈھلان عبور کرنے میں دانتوں پسینہ آ گیا۔ دوسری طرف پہنچنے پر آدمی نے لڑکے سے پوچھا۔

"تمہیں اتنا وزن دے کر کس نے بھیجا تھا۔"

"میرے باپ نے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

آدمی نے کہا۔ "اس نے سوچا نہیں کہ وزن تمہاری بساط سے زیادہ ہے اور راستے میں بڑی سی چڑھائی بھی آتی ہے۔ تم اکیلے بھلا کیسے عبور کر سکتے تھے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "ابا نے کہا تھا کہ تم ٹھیلا لے کر جاؤ راستے میں ضرور کوئی احمق مل جائے گا جو تمہارے ساتھ لگ جائے گا۔"

اطمینان

بیمار بیوی شوہر سے کہتی ہے۔

"سنیے میرے مرنے کے بعد آپ دوسری شادی کر لیجیے گا۔"

"نہیں بیگم!" شوہر نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں کچھ دن آرام کروں گا۔"

نمک چھڑکنا

ایک لڑکی کا منگیتر کافی عرصے سے دبئی گیا ہوا تھا اور اب شادی کے لیے آنے والا تھا۔ ایک روز اس نے شرماتے ہوئے اپنی سہیلی کو بتایا "وہ دبئی میں اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ میں شہر کی سب سے حسین لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

"ہائے اللہ! یہ تو بہت بری بات ہے۔" سہیلی نے ہمدردانہ انداز میں نمک چھڑکا۔ "اتنا عرصہ منگنی تیرے ساتھ رکھی اور اب شادی کسی اور سے کرنے جا رہا ہے۔"

کوشش

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارنا۔"

شکوہ

ایک دیہاتی اپنی محبوبہ کے ساتھ پہلی بار چپس کھا رہا تھا۔ محبوبہ نے پوچھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

دیہاتی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم زیادہ تیزی سے کھا رہی ہو۔"

مقروض

ایک شخص نے اپنے ایک دوست سے کہا۔

"میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے انور صاحب یاد آ جاتے ہیں۔"

"لیکن مجھ میں اور انور صاحب میں تو کوئی مشابہت نہیں۔" دوست نے حیرت سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری طرح انور صاحب بھی میرے کئی ہزار کے مقروض ہیں۔" اس شخص نے افسردگی سے کہا۔

جھوٹا

کوچوان گھوڑا تانگہ گلی میں چھوڑ کر سواری کا ٹرنک رکھنے اندر گیا تو قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو دیکھ کر گھوڑے نے کہا۔

"السلام علیکم۔"

آدمی پہلے تو ٹھٹکا پھر گردن موڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گھوڑے نے گردن اٹھا کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے کہا۔ السلام علیکم۔"

آدمی اسی طرح ڈرا ڈرا سہما سہا واپس لوٹا اور گھوڑے کے پاس آکر بولا۔

"کیا تم نے السلام علیکم کہا تھا؟"

"کیوں نہیں۔" گھوڑے نے محبت بھرے، لہجے میں کہا۔ "یہ تو تم مجھے اب کھٹیچر تانگے میں جتا ہوا دیکھ رہے ہو، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں پچھلے سال سیزن کی ریس میں اول رہا تھا۔"

گھوڑے نے ابھی یہ جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اندر سے اس کا مالک برآمد ہوا۔ ایک غیر آدمی کو یوں اپنے تانگے کے پاس رکے دیکھ کر بولا۔

"اس گدھے نے آپ کو روکا ہوگا؟"

"بے شک۔" آدمی نے اقرار کیا۔

"اور اس لپاڑیے نے یہ بھی کہا ہوگا کہ میں پچھلے سال سیزن کی ریس میں اول رہا تھا۔"

"جی ہاں، کہہ تو رہا تھا۔"

"جھوٹا ہے سالا۔" کوچوان نے چابک جھٹک کر کہا۔

"دوم رہا تھا۔"

مشکل

ایک نو دولتیے صاحب کی بیگم ایک سرجن کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کر دیجیے۔"

"مگر کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی چیز کا" خاتون نے لاپروائی سے کہا۔

"دراصل میرا ابھی کسی مرض کے سلسلے میں آپریشن نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے مجھے بیگمات کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساس کمتری ہونے لگتا ہے۔"

خمار

نیا شادی شدہ جوڑا گھومنے پھرنے ساحل سمندر پر گیا۔ شوہر نے ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے افسانوی اور خواب ناک انداز میں کہا۔

لہرو! آتی رہو، آتی رہو، بس آتی ہو۔

نئی بیوی نے شوہر کے بازو سے لگتے ہوئے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

ہائے اللہ سرتاج! آپ کتنے کمال کے انسان ہیں۔ لہریں بھی آپ کا کہا مانتی ہیں، آئے جا رہی ہیں، آئے چلی جا رہی ہیں۔

بجلی

ایک رات بجلی چلی گئی، سردار نے کہا۔

"تم سے کم پنکھا تو چلا دو۔"

"کر دی نا سرداروں والی بات پنکھا چلاؤں گی تو موم بتی بجھ جائے گی نا۔" سردارنی نے ناک چڑھا کر کہا۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... سدرہ جبار

میک اپ ... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی

ارم کمال .... فیصل آباد
یہ تیرے خط، تیری خوشبو، یہ تیرے خواب وخیال
متاع جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

روبی .... پشاور
یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

افشاں ندیم .... کراچی
وفا ان دنوں کی بات ہے فراز
جب لوگ سچے اور مکان کچے ہوا کرتے تھے

نوشین .... پنڈی
چلے ہو ساتھ تو ہمت نہ ہارنا واصف
کہ منزلوں کا تصور میرے سفر میں نہیں

عالیہ .... پشاور
ہم سے وعدہ کیا تھا اک سویرے کا
ہائے کب، مکر گیا سورج
ڈوبتے وقت زرد تھا اتنا
لوگ سمجھے کہ مر گیا سورج

شاہد ....
تو ہے وہ نقطہ میرے قصے کا
جو فراموش ہو نہیں سکتا

عابدہ .... کراچی
نہیں چاہا کسی کو تیرے سوا
تم نے ہم کو بھی پارسا رکھا

روحیلہ خان .... کراچی
اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں

ثوبیہ قطب .... امریکہ
دل میں تھی ویرانی ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم موسم کتنا پیارا تھا

طیبہ .... ملیر کینٹ
باتوں باتوں میں آؤ اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر اب دنیا کا ہر دکھ ہمیں گوارا ہے

سحر احمد .... کراچی
محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے سے نہیں رکتا
کبھی پھولوں میں نکھرے گا، کبھی تاروں میں چمکے گا

کرن فدا .... کراچی
اس کو آتا ہے قید رکھنے کا فن
ساری پابندیاں اٹھا کے بھی

خنساخان .... بفرزون
وہ مجھے بھولتے نظر میں ہے
یہ میری فتح ہے شکست نہیں

رابعہ .... لاہور
وہ جو میرے نام کی قسمیں کھایا کرتے تھے
وہ جو چل کر میرے پاس آیا کرتے تھے
اب وہ کہتے ہیں کہ بھول جاؤ ہمیں
ہم بھی فقط تمہارا دل بہلایا کرتے تھے

سیماخان .... مانسہرہ
مرہم نہ رکھ سکو جو کسی گہرے گھاؤ پر
اس کے کریدنے میں بھی کچھ بہتری نہیں
دل جیتنے کے فن میں اگر دسترس نہ ہو
دکھتی رگوں کو چھیڑنا دانشوری نہیں

لبنیٰ بٹ .... اسٹیل ٹاؤن
اب بھی قبول نہ ہو تو قسمت کی بات ہے
آمین کہہ رہے ہیں میری ہر دعا کے ساتھ

خوف

پچھلے دنوں کراچی میں شوٹنگ میں مصروف ٹیم پر حملہ کیا گیا اور ان سے فون اور دیگر قیمتی سامان چھین لیا گیا۔ پی آئی بی کالونی کے علاقے جمشید کوارٹرز میں نبیل قریشی اپنی ٹیم کے ساتھ شوٹنگ میں مصروف تھے کہ ہجوم نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہجوم شوٹنگ کے وقت ایک گھر میں گھس آیا جہاں موجود خواتین اور اداکاراؤں کو ہراساں کیا گیا۔ (وجہ کیا تھی آخر؟) حملہ کرنے والا ہجوم جدید ہتھیاروں سے لیس تھا جنہوں نے خواتین اور بچوں کا بھی لحاظ نہ کیا۔ انہیں کراچی میں پہلی بار اس طرح کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا ہے (کراچی میں ایسا واقعہ بھی ہوا ابھی نہیں ہے)

نبیل قریشی کی ٹیم میں حرا کے ساتھ مانی اور گل رعنا کے علاوہ اور بھی کئی ٹی وی اداکارائیں موجود تھیں۔ حرا مانی نے بھی اس واقعہ کو اذیت ناک تجربہ قرار دیا ہے اور کہا کہ خواتین کے ساتھ ٹیم کے ارکان اور بچے تک خوف زدہ ہیں۔ حرا مانی نے خود پر حملے کو انتہائی خطرناک قرار دیا۔

خواب

لوئر دیر کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے فاسٹ بولر نسیم شاہ کی زندگی کا ایک اور خواب پورا ہو گیا ہے۔

نسیم شاہ کو بین الاقوامی برانڈ نے اپنا سفیر مقرر کر لیا۔

نسیم شاہ نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "انہیں بچپن سے کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا (سب کو ہوتا ہے) رمضان میں والد انہیں مسجد لے جاتے تھے لیکن مسجد پہنچنے کے بعد، جب والد کو یقین ہو جاتا تھا کہ ہم مسجد میں ہیں تو ہم بیگ اٹھا کر کرکٹ کھیلنے بھاگ جاتے تھے۔

نسیم شاہ نے کہا کہ

کرکٹ کھیلنے کے شوق میں جب وہ لاہور پہنچے تو انہیں ہاسٹل میں بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

نسیم شاہ کو بہت شوق تھا کہ وہ کسی برانڈ کے سفیر بنیں اور کرکٹ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ خواب بھی پورا کر دیا۔

شادی کے سوال پر نسیم شاہ نے کہا کہ شادی کا سوال ابو سے کریں، وہ جب بولیں گے دلہن تیار ہے تو شادی کر لوں گا (ہاہاہا ننھے کھلاڑی کی معصومیت)

المیہ

ٹی وی اداکارہ ماریہ واسطی کی کچھ بولڈ تصاویر انٹرنیٹ پر وائرل ہوئی تھیں۔ ماریہ واسطی نے اس پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دوستوں نے یہ تصاویر لیک کر دی تھیں۔ وہ نجی البم میں محفوظ تھیں۔ اس وقت

سیکورٹی اور پرائیویسی کے فیچرز نہیں تھے۔ مارچ کے مہینے کے حوالے سے ماریہ واسطی نے فیمنزم پر بھی بات کی اور کہا کہ فیمنزم جنس سے بالاتر ہو کر تمام متاثرین کی بات کرتا ہے۔ چاہے وہ عورت ہو یا مرد ہو۔

کام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ماریہ واسطی نے کہا کہ "ہندوستان میں کام کی عزت ہے وہاں شخصیات سے بڑھ کر محنت اور کام ہوتا ہے۔ وہاں کام کے مواقع بھی زیادہ ہیں جب کہ پاکستان اور بھارت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دونوں ایک سطح پر نہیں۔ پاکستانی اپنی غلطیوں سے نہیں سیکھتے اور خود کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمیں خود کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے (بالکل زندگی کے ہر معاملے میں) کوئی جگہ یا ادارہ خراب نہیں ہوتا اس کا انحصار لوگوں پر ہوتا ہے (جی ادارے کے لوگوں کا)

مبارک باد

ماضی میں انڈین سپر اسٹار شاہ رخ خان کے ساتھ کام کرنے والی ماہرہ خان "رئیس" کے زمانے سے شاہ رخ کی فین ہیں۔ ماہرہ نے فلم "پٹھان" کی بے انتہا کامیابی پر شاہ رخ خان کو مبارک باد دیتے ہوئے ان سے محبت کا اظہار کیا ہے اور انہیں اپنا پٹھان قرار دیا ہے۔ (مطلب پاکستان کا پٹھان؟ وہ تو شاہ رخ خان ہیں ہی)

بقیہ خط آپ کے

بات ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ اپنے شوق اور پڑھائی میں توازن رکھتی ہیں۔

ناول ناولٹ ضرور لکھیں لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر لیں۔ اس دوران آپ مطالعہ جاری رکھیں۔اس سے آپ کی تحریر میں نکھار آئے گا۔

حسنہ جی کو آپ کی محبتیں پہنچا رہے ہیں۔باقی آپ جو کچھ بھجوانا چاہتی ہیں۔وہ حسنہ تا ہمیں کیسے بھجوائیں۔

جڑانوالہ اور گوجرانوالہ دونوں الگ شہر ہیں۔

تسنیم کوثر......کراچی

اس بار شعاع ہمیں 3 تاریخ کو ملا اور اپنی خوب صورت تحریروں سے دل میں سما گیا۔اور عرض یہ ہے کہ شعاع خواہ کسی بھی قیمت کا ہو جائے ہمیشہ سب کا پسندیدہ اور حبیر ہی رہے گا۔اور اس قدر سنگین ترین مہنگائی میں چھوٹا سا اضافہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔یقیناً شعاع کے چاہنے والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔بس اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا کرم اور فضل رکھے۔آمین

سب سے پہلے نگہت سیما کے پیارے سے ناول جھلیں آئینے اور سائے کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتے۔مجموعی لحاظ سے اچھا ہی رہا۔دوسرا ناول شام شہر ہجر بھی شان دار چل رہا ہے اور پسند بھی آرہا ہے۔فرح بخاری خوب صورتی سے لے کر چل رہی ہیں۔اس کے علاوہ ودیعت مژگان بھی عمدہ لگا ثمرہ بخاری نے اچھی اسٹوری لکھی ہے پلیز اب ذرا یہ تو بتائیے کہ ثمرہ بخاری اور فرح بخاری آپس میں بہنیں ہیں کیا۔

اور میمونہ صدف کا ناول عاقبت اندیش بھی تھوڑا سا اچھا ہی لگا۔البتہ افسانوں میں حنا بشریٰ کا بھرم بہتر لگا۔تو فیصلہ قرۃ العین خرم ہاشمی کا بہترین لگا۔تو جناب شازیہ الطاف کا ناشتا نے خوب مزہ دیا۔فریحہ اشتیاق کا آشیانے کا دکھ بس مناسب لگا۔اور عندلیب زہرا کے باپ سراں دے تاج کو بھی ہم نے پاس کر دیا۔سچی بات بتاؤں سب ہی کو پاس کر دینے کو دل چاہتا ہے تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

اس بار پیارے نبی کی پیاری باتوں نے دل چھو لیا۔اتنی جامع معتبر تحریر جو دل کو منور کر دے جو بات کا علم نہ ہو اس کی آگاہی ہو جائے۔ماشاء اللہ اتنا شان دار سلسلہ رقم کرنے پر آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور ہمیں بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔خط آپ کے کی تمام پیاری پیاری قارئین کو سلام خاص کر رمشا روشن کو شادی مبارک ہو اللہ تعالیٰ نصیب اچھا کرے۔شعاع کے ساتھ ساتھ میں قاری بہن سونیا لطیف سے ملاقات بہت اچھی لگی ویسے بھی یہ سلسلہ ہمیں بہت پسند ہے۔پیاری بہن رضیہ جمیل صاحبہ ہماری جانب سے آپ سب کو ماہ رمضان مبارک ہو۔اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا کرم رحم اور فضل رکھے۔آمین۔اللہ حافظ

پیاری تسنیم......!آپ بڑی باقاعدگی سے پرچا پڑھتی ہیں اور پھر اتنا اچھا اور تفصیلی تبصرہ کرتی ہیں......اس کے لیے ہم تہ دل سے ممنون ہیں۔

ریحانہ وقاص نے لاہور سے لکھا ہے

پہلی چار، پانچ تاریخ تک تو کوئی آس اُمید نہیں ہوتی رسالہ آنے کی لیکن ہمارے پھر بھی صبح سات سے ساڑھے آٹھ تک مین گیٹ کے چکر لگتے رہتے ہیں کہ شاید اخبار والا رسالہ لے ہی آئے۔رسالے کی کچھ قیمت بڑھ گئی ہے لیکن پھر بھی اتنی نہیں بڑھی جس لحاظ سے مہنگائی نے حشر برپا کیا ہوا ہے۔آپ کو اپنے پڑھنے والوں کا احساس ہے۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت پیاری تھیں۔رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک پر "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ایک متوازن داستان تھی کیونکہ کمی بیشی تو چلتی رہتی ہے لیکن تھوڑی ہو زیادہ نہ ہو "عاصم محمود" کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا، کافی کوآپریٹو انسان ہیں اپنی بیوی کے ساتھ۔

"شادی مبارک" میں بہت دل چسپ اور خوب صورت طریقے سے سب انتظامات کو ارینج کیا گیا۔پڑھ کر مزا آیا وہاں موجود لوگوں کو تو اور زیادہ مزا آیا ہوگا گناہ ثواب کا بھی خیال رکھا گیا۔

خط آپ کے میں فرحانہ مہناز نے ہمارا ذکر کیا خوشی ہوئی۔خواتین میں ہمارا افسانہ چھپا دل خوشی سے باغ باغ

ہوگیا۔ قاری بہن سونیا لطیف کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ موسم کے پکوان موسم کے مطابق ہی تھے۔ مزے مزے کے اور ساتھ میں امجد اسلام امجد کی شاعری مزا دوبالا ہوگیا۔ "باپ سراں دے تاج" باپ کی اہمیت میں لپٹی ہوئی کہانی، میں اپنے والد کو بہت یاد کرتی ہوں بہت سارے مواقع پر اُن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آشیانے کا دکھ..... تنکا تنکا چکتی چڑیا اور پھر گھر بناتی چڑیا.....ایک ہوا کا جھونکا لے اڑے اس کا آشیانہ۔ ناشتہ" ماں نے اور تقدیم نے صحیح بدلہ لیا اکثر زیادہ سمجھ دار لوگ (جو خود کو سمجھتے ہو) ایسے ہی ڈوب جاتے ہیں......اور پھر کہتے ہیں میری کشتی تھی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا (ہاہاہا) "فیصلہ" میں تاجور کا فیصلہ صحیح لگا۔ "مجرم" تو آج کل کی کہانی ہے کیونکہ مہنگائی کے طوفان نے سب کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، عام بندہ تو آج کل دو وقت کی روٹی بہت مشکل سے پوری کر رہا ہے حسرت سے بس اب پھلوں کو دیکھا ہی جاسکتا ہے یا پھر "ثروت حق" (خواتین میں آپ کا باورچی خانہ کی قاری) کی طرح گھر کی کیاریوں میں خود ہی اُگائے اور خود ہی کھائے ہوسکتا ہے بس آج کل۔

"ودیعت مژگاں" ہلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔

"جھلملیں آئینہ اور سائے" اپنے اختتام کو پہنچی، ہیروئین ہیرو سے شادی کرنے کے بعد بھی مل گئی۔ عشق عاقبت اندیش تو یہ ایک فلمی اسٹوری لگی خاص طور پر جب عشوہ کو دیکھنے لڑکا (فیملی بھی) آتا ہے اور اسوہ آپی موحد کو بھی ساتھ بھیج دیتی ہیں۔ بات کرنے کے لیے۔ اور جب وہ جانے لگتا ہے تو عشوہ ہاتھ پکڑ کر روک لیتی ہے۔

پیاری ریحانہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ آپ نے تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کی۔ آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ بہت شکریہ

شکر ہے کہ شہر بانو کی کرم فرمائی ٹائٹل تک ہی محدود رہی۔ افسانے اور ناول محفوظ رہے۔ بچوں کو رسالوں اور کتابوں سے خصوصی دلچسپی ہوتی ہے سارے ہی بچے سب سے پہلے ان پر لپکتے ہیں۔

مسرت تنویر اٹک سٹی سے لکھتی ہیں

اس دفعہ مارچ کا شمارہ ملا 5 مارچ کو میں تین دفعہ گئی ہوں لینے کے لیے بک شاپ پر۔ بک شاپ والا بھی مجھے پہچان گیا ہے کہ باجی کو میگزین کا انتظار رہتا ہے۔ اس دفعہ میگزین 150 روپے کا ملا۔ مہنگائی بھی تو بہت ہوگئی ہے۔ اس میں ادارے کا کیا قصور ہے۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے۔

اب آتی ہوں مارچ کے شمارے کی طرف سرورق ماڈل بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ماڈل فرینہ اعجاز نے بہت اچھا میک اپ اور کپڑے بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ پہلی شعاع آپ سے ملاقات اچھی لگی۔ کراچی آئی تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ حمد و نعت شریف ہمیشہ کی طرح روح تسکین ملی۔ پیاری باتیں بھی۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا سے ت۔ ر۔ صبر کیا جائے۔ تو اُس کا پھل ضرور ملتا ہے، بندھن میں عاصم محمود ہمراہ ملیحہ محمود صاحب سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ بہن امت العزیز شہزاد کی علالت کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ خداوند کریم انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ میں ہر نماز کے بعد اُن کے لیے دعا ضرور کرتی ہوں۔

اس دفعہ ناولز بہت پسند آئے مجھے جس ناول کا انتظار تھا جھلملیں، آئینے اور سائے نگہت سیما کا دوسری قسط۔ دوسرا ناول ثمرہ بخاری صاحبہ نے مکمل ناول ودیعت مژگاں بے انتہا اچھا ٹاپک تھا یتیم بچوں کے ساتھ کتنی بڑی حق تلفی کرجاتے ہیں لوگ۔ جب عدی کی محرومیوں کے بارے پڑھ رہی تھی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ افسانے اس دفعہ بھی بہت ہی زبردست تھے حنا اشرفی صاحبہ کا افسانہ بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ دوسرا افسانہ آشیانے کا دکھ فریحہ اشتیاق صاحبہ بہت اچھی تحریر۔

عندیب زہرا باپ سراں دے تاج کیا بات ہے۔ عندلیب صاحبہ نے بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے، باپ کی محبت اور سختی کے بارے میں بہت سارے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہوں گی۔ شاباش عندیب صاحبہ۔ تاریخ کے جھروکے میں جانا۔ مجھے ویسے بھی تاریخ پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ موسم کے پکوان اس دفعہ بھی لاجواب۔ اس ملائی۔ میں ضرور بناؤں گی۔"

پیاری مسرت! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے دعاؤں کے لیے شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو دلی خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔

رعنا رخسانہ نے ملتان سے لکھا ہے

میں نے 13 صفحات پر مشتمل ایک ناول "جگر کے ٹکڑے" باپ کی محبت پر لکھا ہے اور خط کے ساتھ بھیج بھی دیا ہے۔ امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئے گا۔ میں اپنے بھائی اظہر حسین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے اس لکھنے کے شوق کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اور ہاں بھول گئی فروری میں یعنی پانچ فروری کو میری سالگرہ تھی خیر سے میں بائیس سال کی ہوگئی ہوں۔

پیاری رعنا! سالگرہ مبارک اور ڈھیر ساری دعائیں۔ پانچ فروری کافی ہے سال بتانے کی ضرورت نہیں۔

ناول کے لیے معذرت۔ آپ میں صلاحیت تو ہے لیکن ابھی آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔ فی الحال مطالعہ کریں۔

ضلع گوجرانوالہ سے نور العین اور کائنات شریک محفل ہیں لکھا ہے

ہم گزشتہ دس سالوں سے آپ کے شماروں کی خاموش قاری ہیں۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا آغاز ہم نے بہنوں کو پڑھتے دیکھ کر کیا۔ اب تک کئی ناولز کا مطالعہ کیا۔ پسندیدہ رائٹرز میں سمیرا حمید، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، نادیہ احمد، صدف آصف، سائرہ رضا، ایمل رضا، فرزانہ کھرل شمار ہوتی ہیں۔ عمیرا احمد کے ناول انسان کو جکڑ لیتے ہیں۔ اور نمرہ احمد کے ناولز میں ہیرو بہت ہی اوور اسمارٹ ہوتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی پتا ہوتا ہے کہ اب آگے کیا ہونا ہے۔ اس لیے جب کوئی ایسا سین ناول میں آتا ہے اور ایسی بات آتی ہے جس کے بارے میں ہیرو اور ہیروئن کا جاننا ضروری ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں بھئی پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ انہیں پہلے ہی پتا ہوگا (ہیرو، ہیروئن کو) سائرہ رضا کے ناولز سے بہت سے اخلاقی سبق ملتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو قاری بہنوں کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ہم قاری اُن کرداروں کی روشنی میں اپنی غلطیوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

اب ہم آپ کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ کچھ سالوں پہلے تک تو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ گیس بھی نہیں تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی سہولتیں آئی ہیں تو دوسری طرف ہریالی ختم کر کے ٹاؤن بن رہے ہیں۔ اب جہاں دیکھیں گھر ہی گھر ہیں۔ واہنڈو ضلع گوجرانوالہ کے بہت سے گاؤں سے بہتر ہے۔

کائنات کی قاری بہنوں کو نصیحت ہے کہ وہ نسیم حجازی کے ناول بھی ضرور پڑھیں۔ خاص طور پر شاہین، خاک و خون۔

ہم دونوں فورتھ ایئر کی طالبہ ہیں۔ ہماری وجہ سے بہت سی لڑکیاں ناولز پڑھنے لگ گئی ہیں۔ آخر میں ہماری آپ سے درخواست ہے کہ ڈائجسٹ پر تاریخی مقامات کی تصاویر یا قدرتی مناظر کی تصویریں لگا دیا کریں۔ گھر والوں کی طرف سے اجازت ملنا آسان ہو جائے گا۔

پیاری نور اور کائنات (تیسرا نام ہم پڑھ نہ سکے) آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ آپ فورتھ ایئر کی طالبہ ہیں اور دس سال سے شعاع کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ یعنی آپ نے بہت کم عمری میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

آپ کے گاؤں کی ہریالی ختم ہو رہی ہے اس پر کیا کہیں ابھی سال پہلے خبر پڑھی کہ نوے ہزار آم کے درخت کاٹ دیے گئے ہیں۔ یقین کریں دلی صدمہ ہوا۔ ملتان کا چونسہ دنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے۔ پڑوسی ملک کو دیکھیں زرعی زمینوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا وہ سوا ارب کی آبادی کو زرعی اجناس فراہم کر رہا ہے جبکہ ہم بائیس کروڑ عوام کی غذائی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ دالیں اور گندم بھی باہر سے منگواتے ہیں۔

☆☆

اعتذار

مارچ کے شعاع میں افسانہ "فیصلہ" کی مصنفہ قرۃ العین سکندر ہیں سہواً قرۃ العین خرم ہاشمی کا نام شائع ہوگیا۔ اس سہو پر معذرت خواہ ہیں۔

امت الصبور

موہنجوداڑو

ڈھائی ہزار قبل مسیح سے پندرہ سو قبل مسیح کے دوران دریائے سندھ کے کنارے سے ایک ایسی تہذیب نشوونما پاتی رہی جو قدیم دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ موہنجوداڑو اس تہذیب کا ایک اہم شہر تھا جس کا انکشاف 1922ء میں ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کے دوران کیا۔ یہ شہر کراچی کے شمال میں ڈھائی سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس شہر کے جو آثار کھدائی کے دوران برآمد ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کی شہری زندگی بہت ہی ترقی یافتہ تھی جیسے جیسے وسیع پیمانے پر کھدائی ہوتی رہی ویسے ویسے ایک حیرت انگیز حقیقت منظر عام پر آتی رہی...... ایک سچی کہانی جس کا تعلق اس دور کے رہنے والوں کے رسوم و رواج طریق بود و باش، ان کے فنون، ان کی دستکاریاں، ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی سے تھا جن کے تمام پہلو پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کھل کر سامنے آگئے۔ جو آج سے پانچ ہزار سال قبل اس شہر میں بسا کرتے تھے۔

موہنجوداڑو میں تصویری رسم الخط اور مختلف اقسام کی جو اشیاء کھدائی پر برآمد ہوئی ہیں۔ ان سے اس شہر کے باشندوں کی تخلیقی ذہانت و فطانت، عمل کرنے کی صلاحیت، مستقل مزاجی اور اپنے وطن اور کام سے پرجوش عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے ماضی کے اس دور میں سندھ طاس کی عظیم تہذیب کی نیو ڈالی جب آج کی مہذب دنیا کی بیشتر اقوام گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہی تھیں، کھدائی پر معمولی اقسام کے فنون جیسے مجسمہ سازی، ظروف سازی، پکائی ہوئی سرخی مائل یا بادامی رنگ کی مٹی سے اشکال سازی، زیور اور مہریں برآمد ہوئی ہیں۔ لیکن موہنجوداڑو کے فن شکل تراشی (پلاسٹک آرٹ) کی بہترین مثال جو اب تک سامنے آئی ہے بلاشبہ وہ شاندار قسم کی مہریں (سیل) ہیں جن پر جانوروں کی جیتی جاگتی تصویریں، بنی ہوئی ہیں، مہروں پر بنائی ہوئی ان جانوروں اور بدشکل ارواح بندروں اور گلہریوں کی ہوبہو ایسی ننھی ننھی شکلیں ہیں جو بڑی دیدہ ریزی اور نظر سوزی سے کندہ کی گئی ہیں۔

اس وقت بھی ہمارے پاس سندھ طاس کی دو ہزار تین سو پچیس مہریں ہیں یہ ان مہروں کے علاوہ ہیں جو بیرونی ملکوں میں پائی گئی ہیں اور بیرونی عجائب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں ان میں سے دو سو چھیالیس مہریں تو اصل مہروں کی نقلیں ہیں، دو سو دس مہروں پر کوئی نقش یا عبارت کندہ نہیں۔ 180 مہریں ٹوٹی پھوٹی ہیں، ان مہروں کو منہا کرنے کے بعد ہمارے پاس 1675 مہریں رہ جاتی ہیں، جنہیں پڑھا جاسکتا ہے اور جن کی وضاحت ممکن ہے اور جن مہروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے بارہ سو موہنجوداڑو میں ملی ہیں، ان سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی تراش اور کٹائی کے معیار میں خاصا تنوع اور فرق ہے تاہم یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ مہریں کثیر پیمانے پر تیار کی گئی تھیں، ان کا اوسط معیار اونچا ہے انہیں شہ پارے کہا جاسکتا ہے ان مہروں کا سائز 3/4 اور 11/4 انچ ہے۔

مہروں کا مقصد

ان مہروں کا مقصد پوری طرح واضح نہیں ہے کہ آیا انہیں مہروں کی فہرست میں شمار کیا جائے یا

انہیں تعویذ کہا جائے کیونکہ تا حال اب تک کوئی واحد حقیقی مہر نہیں ملی ہے۔یعنی مٹی کے کسی ٹکڑے پر کوئی نقش یا کسی اور شے پر ابھرایا کندہ عبارت یا تصویر یا نقش جو کسی مرتبان یا قابل فروخت اشیا سے بندھا ہوا ہو، جیسے دوسرے قدیم شہروں میں بعض مہریں ملی ہیں جو دھاگے یا ڈور کے ساتھ باندھی گئی ہیں یا جن کی پشت پر دھاگے کا کوئی ٹکڑا وغیرہ چپکا ہوا ہے۔موہنجوڈرو میں مہر کا نقش پکائی مٹی پر ابھرا آیا ہے۔ کچی ہوئی مٹی جب پرانی ہوجاتی ہے تو پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے اور یہ ٹکڑے ریزے ریزے ہوجاتے ہیں۔اس لیے موہنجوڈرو جیسے مقام پر ان کا پتہ چلانا بہت مشکل کام ہے ایک اور مسالہ جو اس کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے وال یا گندہ بیر ذرہ ہے جو مرطوب آب وہوا میں دانہ دار بن جاتا ہے مگر مٹی اور گندہ بیر ذرہ کے کوئی باقیات یا آثار تلاش پر بھی نہ ملے،البتہ ایک عمارت میں ایک تالاب کی دیوار سے پانی رسنے کی روک تھام کے سلسلے میں پکی ہوئی مٹی ملی ہے۔

جان مارشل کی رائے میں یہ مہریں بطور خاص مٹی کی اس سیٹنگ پر ٹھپہ لگانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں،جن کی مٹی کو کافی پکایا نہیں گیا ہو یا وہ خصوصی قسم کی ہوں۔موہنجوڈرو جیسے مرطوب علاقے میں ان کا محفوظ رہنا ناممکن ہے اس کا امکان ہے کہ مٹی کی مہریں موہنجوڈرو میں اس وجہ سے دستیاب نہیں ہوئیں،کیونکہ یہ محض ٹھپہ لگانے کے لیے مستعمل ہوتی تھیں۔بابل کے مقام یوکھا میں ٹھپے ملے ہیں۔جنھیں ڈاکٹر شیل نے شائع کردیا ہے۔مٹی کے اس مہر کے ٹھپے پر ایک سانڈ کی ابھری ہوئی تصویر ہے۔جس کے اوپر ایک سطر میں ابھرے حروف میں تصویری رسم الخط سے کچھ تحریر ہے۔سانڈ کی شکل اور تصویری رسم الخط کی ہئیت مہروں سے مماثلت رکھتی ہے اور مہروں کی پشت پر بعض ایسے نشانات ہیں جیسے کوئی سوئی دھاگہ یا کوئی اور شے سے یہ باندھی گئی ہوں یہ گانٹھ یا گٹھے قسم کی کسی ایسی چیز سے بندھا ہوا ہوگا جو غالباً ہندوستان سے آئی تھی۔

ان مہروں کے استعمال کے بارے میں ایک اور خیال یہ ہے کہ ان کا مقصد پکی ہوئی مٹی کی اشیاء پر ٹھپہ لگانا نہیں تھا۔ بلکہ دوسری اشیاء پر رنگین نقش یا چھاپ لگانا تھا مگر اس خیال کو جارج مارشل نے اس بنا پر مسترد کردیا کہ اگر ان کا مقصد یہ کچھ ہوتا تو پھر انہیں اتنا گہرا تراشا گیا نہ ہوتا اور جو چھاپ رنگ سے لگائی جاتی اس سے مہروں کی کھدائی کے زیریں حصے اتنی تفصیل سے نہ دکھائے گئے ہوتے۔ان کے بارے میں ایک تیسرا تصور یہ ہے کہ یہ تعویذ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔مگر یہ تصور یا خیال بھی یوں مسترد کردیا گیا کہ ان میں سے بیشتر مہروں کی پشت پر آگے بڑھا ہوا ایک ابھار ہے(جسے گرفت میں لے کر ٹھپہ لگایا جاسکتا ہے)

عام طور پر تعویز ڈوری باندھ کر گلے میں لٹکائے جاتے ہیں یا پھر انہیں کسی غلاف میں لپیٹا یا ڈبیہ وغیرہ میں بند کردیا جاتا ہے اس لئے مہروں کی پشت پر جو ابھار ہے اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ انہیں انگلیوں کی گرفت میں لے کر چھاپ لگائی جائے اگر یہ تعویذ ہوتے تو پھر ڈور میں باندھنے کے لیے اس میں سوراخ ہوتا۔مزید برآں مہروں کی پشت پر ابھار تعویذ کو جسم سے مس کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتا۔ البتہ ایک مہر کے سلسلے میں تعویذ کا نظریہ ٹھیک ثابت ہوسکتا ہے۔یہ مہر 77 انچ مربع اور 3 انچ موٹی ہے جس میں ابھار شامل نہیں ہے۔اس مہر کا اندرونی حصہ بڑی احتیاط سے خول کی طرح کھوکھلا کردیا گیا ہے۔اس چھوٹے سے اندرونی خانے کو رسمی طور پر ایک سرکنے والے ڈھکن سے ڈھانک دیا گیا تھا۔یہ ڈھکن دوندانوں میں فٹ ہوجاتا تھا جو مہر کے دونوں جانب بنائے گئے تھے۔اس مہر کا بالائی حصہ بالکل مٹ چکا ہے تاہم جو باقی رہ گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس جانور کی شبیہ بنائی گئی تھی۔ ''ارنا گھوڑا'' ہے۔اس کے علاوہ تحریر وہی ہے جو دوسری مہروں پر ثبت ہے اس ''تعویذ'' کے اندر جو بہت مختصر سی کھوکھلی

جگہ باقی رہ گئی ہے وہ غالباً کسی خفیہ چیز کے رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے ممکن ہے یہ خفیہ شے تانبے کی وہ تھی سی تکیہ ہو جیسی کہ بڑی تعداد میں موہنجوداڑو میں پائی گئی ہے یا پھر کسی چڑے یا درخت کی چھال پر تحریر شدہ کوئی نقش جو تہہ کر کے اس میں رکھا جا سکتا ہو۔ اس قسم کا نقش جیسے مصری رسم الخط تعویذ اور مہر دونوں ہی کے کام آیا کرتا تھا اگر ان پر کوئی تحریر نہ ہوتی تو پھر یہ مہریں بے سود ثابت ہوتیں کیونکہ ان میں سے اکثر پر جانور بنے ہوئے ہیں۔

باپ اور بیٹا

مغربی پاکستان کے سابق گورنر امیر محمد خاں (متوفی 1967) نے یورپ میں زرعی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صدر ایوب کی حکومت کے زمانہ میں پاکستان میں جو "سبز انقلاب" آیا تھا۔ اس کا سہرا دراصل ملک امیر محمد خاں ہی کے سر ہے جو اس وقت پاکستان کے غذائی و زرعی کمیشن کے صدر تھے اور بعد میں اپنی خدمات کے اعتراف میں گورنر بنا دیے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے۔ گورنر ہاؤس میں نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتے اور ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردے میں رہتیں۔

جب پاکستان کے تیسرے منصوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے تیس کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تو انہوں نے اس کی مخالفت کی، بات بڑھتی گئی۔

"یہاں تک کہ صدر ایوب نے جھنجلا کر کہہ دیا کہ اگر آبادی کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

ملک امیر محمد خان نے ستمبر 1966 میں گورنری سے استعفا دے دیا۔ اور اپنے آبائی وطن کالا باغ چلے گئے۔ جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے یہاں ان کے گھر پر جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد خان کے خلاف رائفل لے کر کھڑے ہو گئے انہوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی مگر وہ کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔ اس نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں اور وہ وہیں موقع پر ختم ہو گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو قتل قرار دے کر گورنری کے عہدے کو چھوڑ دیا تھا۔ آخر میں اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا اگرچہ اس مقابلے میں جوان بیٹا بوڑھے باپ پر غالب آیا اور نتیجہ برعکس شکل میں برآمد ہوا۔

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ کا آغاز ہوگیا ہے۔حسب روایت ہمارے گھروں میں عبادت کے ساتھ سحر وافطار کا اہتمام ہورہا ہوگا۔اس سلسلے میں ہم نے اپنی قارئین کے لیے کچھ تراکیب منتخب کی ہیں جو یقیناً آپ کو پسند آئیں گی۔

انڈا پراٹھا

اجزاء

آٹا	دو پراٹھوں کا
انڈے	دو عدد
پیاز	ایک عدد
ہری مرچ	تین عدد
ہرا دھنیا	دو چمچے
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:۔

پیاز باریک کاٹ لیں ایک پیالے میں انڈا، پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا، زیرہ، لال مرچ نمک ڈال کر پھینٹ لیں۔دو پراٹھوں کا آٹا گوندھ کر اس کے دو پیڑے بنالیں۔ایک پیڑا بیل لیں۔اور اسے توے پر ڈال دیں ایک طرف سے سک جائے تو پلٹ کر اس کے اوپر والے حصے پر انڈے والا آدھا آمیزہ ڈال دیں۔تھوڑا سا گھی ڈال کر اسے پلٹ دیں اور دوسری طرف بھی گھی لگا کر تل لیں۔دوسرا پراٹھا بھی اسی ترکیب سے تیار کرلیں۔توا نان اسٹک استعمال کریں تو بہتر ہے۔آپ حسب ضرورت انڈے اور آٹے کی مقدار بڑھا سکتی ہیں۔

چٹ پٹے پکوڑے

اجزاء

بیسن	ایک پاؤ
ثابت مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری پیاز	حسب پسند
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
میٹھا سوڈا	ایک چھٹانگی چائے کا چمچہ
نمک	حسب پسند
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ایک پیالے میں بیسن اور سارے مسالے ڈال کر گھول لیں ثابت دھنیا کوٹ کر ڈالیں۔کچھ دیر کے لیے رکھ دیں پھر آمیزے کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور آنچ ہلکی کر کے اس میں چمچے سے پکوڑے ڈال دیں۔جب دونوں طرف سے اچھی طرح سنہری ہوجائیں تو اتار کر ٹشو یا کاغذ پر رکھ دیں۔تاکہ چکنائی جذب ہوجائے۔

املی یا دہی کی چٹنی کے ساتھ نوش کریں آپ کے دسترخوان کی رونق بڑھ جائے گی۔

کریمی فروٹ چاٹ

اجزاء

کیلے	چھ عدد
سیب	ایک عدد
امرود	دو عدد
خربوزہ	ایک عدد

اسٹرابیری	آٹھ عدد
پپیتا	حسب پسند
چیکو	چار عدد
انار	ایک عدد
چینی	تین کھانے کے چمچے
نمک	ایک چٹکی
کالی مرچ	حسب پسند
کریم	ایک پیکٹ

تمام پھلوں کو حسب پسند کاٹ لیں، چینی، نمک، کالی مرچ اور کریم کو کٹے ہوئے پھلوں میں شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

چنا چاٹ

اجزاء

سفید چنے	آدھا پاؤ
آلو	تین عدد
دہی	ایک پاؤ
املی	دو کھانے کے چمچے
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
ہرا دھنیا	حسب پسند
ہری مرچ	تین عدد
نمک	حسب ضرورت
پاپڑی	حسب پسند
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

ابلے ہوئے آلو ابلے چنے ایک پیالے میں نکال لیں۔ ایک پیالے میں دہی، چینی، املی، باریک کٹی پیاز، ٹماٹر، کٹی مرچ اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھینٹے ہوئے دہی میں آلو چنے ڈال کر مکس کر لیں اوپر سے پاپڑی چاٹ مسالا، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

میکرونی چکن سموسہ

اجزاء

سموسہ پٹی	حسب ضرورت
چکن	آدھا پاؤ
ابلی میکرونی	ڈیڑھ کپ
تیل	دو کھانے کے چمچے
کٹا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا	چوتھائی چائے کا چمچہ
کٹی مرچ	دو کھانے کے چمچے
شملہ مرچ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	تین کھانے کے چمچے
بند گوبھی	ایک کپ

ترکیب:۔

تیل میں چکن، کٹا دھنیا، زیرہ، نمک، پسا گرم مسالا، کٹی مرچ، ٹماٹر، باریک کٹی ہری مرچیں ڈال کر چکن گل جانے تک پکائیں۔ بند گوبھی اور شملہ مرچ باریک کٹی ہوئی ڈال کر تھوڑی دیر پکائیں۔ تیار مسالے میں ابلی ہوئی میکرونی شامل کر لیں۔ سموسہ پٹی میں بھر کر گرم تیل میں فرائی کر لیں۔ گرما گرم میکرونی سموسے تیار ہیں۔

اسٹرابیری شیک

اجزاء

اسٹرابیری	بارہ عدد
دودھ	آدھا کلو
کھجور	دو عدد
چینی	چار کھانے کے چمچے
برف	حسب پسند
کریم	حسب پسند

ترکیب:۔

جگ میں دودھ، اسٹرابیری، کھجور، چینی، کریم اور برف ڈال کر گرائنڈ کر لیں مزے دار اسٹرابیری شیک تیار ہے۔

☆☆

ہاتھوں اور کہنیوں کی صفائی

ہاتھوں اور کہنیوں کی سیاہی کی بنیادی وجہ جلد کے مردہ خلیات، دھوپ میں زیادہ رہنا یا ہارمونز کی خرابی ہو سکتی ہے۔ جسم کے ان حصوں میں آئل گلینڈز موجود نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان حصوں کی رنگت اکثر خراب ہو جاتی ہے۔ گھر میں موجود چیزوں کی مدد سے آپ ان مسائل سے با آسانی چھٹکارا حاصل کر سکتی ہیں۔

کھیرے کے اندر بلیچنگ ایجنٹ موجود ہوتا ہے کھیرے کو کاٹ کر ہاتھوں اور کہنیوں پر دس منٹ کے لیے رگڑیں اگر جلد زیادہ حساس نہیں ہے تو لیموں کے رس میں کھیرے کے ٹکڑے بھگو کر رگڑ لیں۔

لیموں رنگ نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں اینٹی آکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ وٹامن سی بھی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ کھانے کا سوڈا بھی جلد کی صفائی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک لیموں کو درمیان سے کاٹ لیں۔ اس کے اوپر کھانے کا سوڈا چھڑک کر کہنیوں اور ہاتھوں پر لگائیں۔ دس منٹ تک رگڑنے کے بعد سادے پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل ہفتے میں دوبارہ دہرائیں۔

ایلو ویرا جلد کو نمی فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اینٹی بیکٹریل اور اینٹی فنگل خصوصیات کا بھی حامل ہے۔ ایلو ویرا جیل اور دودھ کا آمیزہ سیاہی مائل حصوں کو صاف کرتا ہے بلکہ نرم اور لچک دار بھی بناتا ہے۔ اس لیے رات کو سونے سے قبل ہاتھوں اور کہنیوں پر ایلو ویرا اور دودھ ہم وزن لے کر لگائیں اب کو رات بھر لگا رہنے دیں اور صبح اٹھ کر سادے پانی سے دھو لیں۔

آلو کے اندر قدرتی طور پر رنگ کو نکھارنے والے اجزاء موجود ہوتے ہیں۔ آلو کو کدوکش کر کے ہاتھوں کے سیاہی مائل حصوں پر لگائیں خوب اچھی طرح رگڑنے کے بعد پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں سادے پانی سے دھو کر کوئی بھی اچھا سا لوشن لگا لیں۔

ہلدی کو جلد پر رگڑنے سے اس کے مردہ خلیات صاف ہو جاتے ہیں۔ ہلدی کے اندر کرکومن نامی مادہ موجود ہوتا ہے۔ جو جلد میں میلانن کے بننے کے عمل کو سست کر دیتا ہے وہ جلد کی رنگت کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ ہلدی اور دودھ کے پیسٹ کو بھی سیاہی مائل حصوں پر رگڑ سکتے ہیں اس سے بھی جلد کی رنگت بہتر ہو جاتی ہے۔

بازو کے اندر کی سیاہی کو دور کرنے کے لیے آپ پھٹکری بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ اس سیاہی کی وجہ بال صاف کرنے والی کریمیں ہیں، ایک ٹکڑا گیلا کر کے مطلوبہ جگہ پر رگڑیں۔ چند دن کے استعمال کے بعد جلد کی رنگت بہتر ہو جائے گی۔ اگر ہاتھوں کی انگلیوں کے اوپر جلد سکڑ کر خراب ہو رہی ہے تو ایک انڈے کی سفیدی میں ایک کھانے کا چمچہ ویزلین کو اچھی طرح مکس کریں، ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ اب اس میں ہم وزن سرکہ، کوکس بام، نمک اور آدھا چائے کا چمچہ کھانے کا سوڈا مکس کر لیں۔ اس پیسٹ کو صرف ہاتھوں اور پیروں پر استعمال کر سکتے ہیں۔ انگلیوں کی مدد سے ہاتھوں پیروں کو رگڑیں پندرہ منٹ بعد دھو لیں۔ اس طرح ہاتھوں پیروں پر جما میل بھی نکل جائے گا اور جلد کی اندرونی رنگت بھی نکھر جائے گی۔

☆☆